مولانا مناظر احسن گیلانی کی کہانی انہی کی زبانی !

احاطہ دار العلوم میں بیتے ہوئے دن

Toobaa-elibrary.blogspot.com

دار العلوم دیوبند میں تعلیمی زمانے کے دلچسپ احوال
اکابر اساتذہ کے دلنشیں حالات و واقعات
تدریسی لطائف و ظرائف، اپنے موضوع پر
دلچسپ اور لاجواب کتاب!
جو کہ ہر باذوق قاری کے معیار پر
پوری اترے گی نیز اس سے علماء دیوبند
کے اخلاص و عزیمت اور جہد و عمل
سے منور زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی

ادارہ تالیفات اشرفیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان

احاطہ دار العلوم میں بیتے ہوئے

دن

آپ بیتی

مولانا سید مناظر احسن گیلانی

مرتبہ: مولانا اعجاز احمد اعظمی

پیشکش: طوبیٰ ریسرچ لائبریری

toobaa-elibrary.blogspot.com

مولانا مناظر احسن گیلانی کی کہانی ان کی زبانی

احاطۂ دار العلوم میں بیتے ہوئے دن

تصنیف

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ

ترتیب

حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب

ناشر:
ادارہ تالیفات اشرفیہ
بیرون بوہڑ گیٹ ملتان ☎ 540513

Toobaa-elibrary.blogspot.com

عرضِ ناشر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نحمده ونصلي على رسوله الكريم

کتاب ھذا اپنے عنوان ہی سے واضح ہے صاحب کتاب حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی ان خوش قسمت ہستیوں میں سے ہیں جنہوں نے دارالعلوم کا وہ سدا بہار زمانہ پایا جن کو دیکھنے کے لئے آج آنکھیں ترستی ہیں۔ اور ان اساتذہ سے شرف تلمذ حاصل کیا جو اپنے دور حیات میں مرجع خلائق تھے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر سلیم الفطرت انسان کے دل میں برگزیدہ اور نیک سیرت شخصیات کی محبت ودیعت فرمائی ہے اور آج کے اس مادی دور میں ایسی ہستیوں کی تصانیف ہی ان کا نعم البدل ہیں۔ صاحب کتاب اگرچہ اب دارفانی سے داربقاء کی طرف منتقل ہو چکے ہیں مگر انہیں اپنی تصانیف سے اب بھی ہر قاری کے دل میں دھڑکن کی طرح موجود ہیں۔

ادارہ ھذا کی شروع ہی سے یہ سعی رہی کہ اپنے اکابر و سلف صالحین کی کتب منظر عام پر لائی جائیں تاکہ اکابر کا فیض حلقہ خاص تک محدود نہ رہے۔ کتاب ھذا کی اشاعت بھی اسی سعی کی ایک کڑی ہے امید واثق ہے کہ عنداللہ یہ سعی مقبول ہو کر خاص و عام کے لئے استفادہ کا باعث بنے گی۔

اللہ پاک تازیست اپنے اکابر سے فیض یابی کی توفیق نصیب فرمائیں آمین۔

احقر محمد اسحٰق

جمادی الاولیٰ ۱۴۱۸ھ

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۱	پیامِ دیوبند	۹
۲	داستان اس کتاب کی	۱۰
۳	مقدمہ	۱۴
	باب ۱	
۵	ٹونک میں	۲۰
۶	پہلی تقریر	۲۵
۷	شکوۂ خواجہ	۲۸
۸	باب ۲ ذکرِ دیوبند	۳۱
۹	مختصر المعانی کا حاشیہ شیخ الہند	۳۶
۱۰	دارالعلوم کا ابتدائی تعارف	۳۷
۱۱	دیوبند جانے کا فیصلہ	۴۰
۱۲	باب ۳ دیوبند تک رسائی	۴۲
۱۳	انقلابی ہفتہ	۴۶
۱۴	دارالعلوم کا مطبخ	۴۸
۱۵	دارالعلوم کی مسجد اور نماز	۴۸
۱۶	نئے نئے اسماء	۴۹
۱۷	دارالعلوم کے انتظامات	۵۱
۱۸	درسی کتابوں کا مسئلہ	۵۲
۱۹	موسمِ سرما کا انتظام	۵۴
۲۰	لطیفہ (حاشیہ میں)	۵۴
۲۱	مفت علاج	۵۵
۲۲	کام میں برکت	۵۶

Toobaa-elibrary.blogspot.com

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۲۳	مدرسہ کی عمارت	۵۷
۲۴	احاطۂ مولسری کا ٹھنڈا پانی	۵۸
۲۵	چاول کا لطیفہ (حاشیہ)	//
۲۶	باب ۴ امتحان داخلہ	۶۱
۲۷	باب ۵ دورۂ حدیث میں باضابطہ شرکت	۶۸
۲۸	دارالعلوم میں تدریسِ حدیث کا انداز	۶۹
۲۹	دین کے بنیادی سرچشموں کی طرف رجوع	۷۰
۳۰	ایک نئی علمی ہلچل	۷۵
۳۱	دورۂ حدیث کا آغاز	۷۷
۳۲	باب ۶ علامہ انور شاہ کشمیری کے حلقۂ درس میں	۷۸
۳۳	شاہ صاحب کے درس کے انقلابی تاثرات	۷۹
۳۴	نئی تعبیرات نئے الفاظ	۸۱
۳۵	عربی میں ضبطِ تقریر	۸۳
۳۶	نوشتۂ درس کی گمشدگی	۸۴
۳۷	باب ۷ معارفِ انوریہ	۸۹
۳۸	اعتبار کی تشریح	۸۹
۳۹	منصبِ قضا اور اجتہاد	۹۱
۴۰	ائمہ اجتہاد کی تعظیم	۹۲
۴۱	معارفِ صوفیہ	۹۲
۴۲	وحدت الوجود	۹۳
۴۳	مسئلہ احسان	۹۴
۴۴	معقولات	۹۵
۴۵	عقلمند ترین گروہِ انسانی	۹۶
۴۶	باب ۸ شاہ صاحب کی چند اور خصوصیات	۹۸
۴۷	افراد و رجال کے باب میں شاہ صاحب رح کا رویہ	۹۹

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۴۸	شافعیہ کے ایک خاص طرزِ عمل پر ظریفانہ تبصرہ	۱۰۰
۴۹	صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کا تاثر	۱۰۱
۵۰	دفاع ہوگیا	۱۰۲
۵۱	اشعار کا خزانہ	۱۰۳
۵۲	کیفیتِ باطنی کی جھلک	۱۰۳
۵۳	دل کی حسرت	۱۰۷
۵۴	دورۂ حدیث کے اختتامی کلمات	۱۰۸
۵۵	زندگی کا نصب العین	۱۰۸
۵۶	درسِ انوری کی ایک اور خصوصیت	۱۰۹
۵۷	باب ۹ شاہ صاحب اور علومِ قرآنی	۱۱۱
۵۸	قرآن کے سہل ہونے کا مطلب	۱۱۴
۵۹	کیا قرآن میں سب کچھ ہے؟	۱۱۸
۶۰	قرآنی تعبیروں کے متعلق ایک عالمانہ نکتہ	۱۲۰
۶۱	محکمات و متشابہات	۱۲۶
۶۲	تفسیر بالرائے	۱۳۰
۶۳	ذکرِ انوری کا اختتام	۱۳۸
۶۴	باب ۱۰ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ	۱۴۲
۶۵	داستانِ انقلاب	۱۴۳
۶۶	حضرت شیخ الہند کا درس	۱۴۵
۶۷	ایک عجیب ہولناک کیفیت	۱۴۷
۶۸	قدرتی دستگیری	۱۴۸
۶۹	پندِ پیرِ دانا	۱۴۹
۷۰	شیخ الہند کی خدمت میں حاضری	۱۵۰
۷۱	زندہ کرامت	۱۵۱
۷۲	بدلا ہوا رنگ	۱۵۲
۷۳	محبتِ نبوی میں نفسانیت	۱۵۳
۷۴	درسِ بخاری	۱۵۵
۷۵	تبدیلیوں کی داستانِ عجیب	۱۵۷
۷۶	عبرتناک خواب	۱۵۸

Toobaa-elibrary.blogspot.com

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
٧٧	چہ گویم جلوہائے دیدنی را	١٦٠
٧٨	مزاحی لطیفے	١٦١
٧٩	حضرت مدنی کے حلقۂ درس میں	١٦١
٨٠	حضرت شیخ الہند سے ارادت و بیعت	١٦٢
٨١	تحریری زندگی کی بسم اللہ	١٦٢
٨٢	دو اہم باتیں	١٦٣
٨٣	مولانا عبید اللہ سندھی کا مسئلہ	١٦٤
٨٤	دار العلوم کا مقصد، شیخ الہند کا نقطۂ نظر	١٦٩
٨٥	باب ١١ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی علیہ الرحمۃ	١٧٢
٨٦	سننِ ابوداؤد کا پہلا درس	١٧٢
٨٧	قاسمی نظریات و معارف	١٧٣
٨٨	ذاتی تعارف	١٧٤
٨٩	درِ دولت پر حاضری	١٧٥
٩٠	مولانا عثمانی کی زندگی میں انقلاب	١٧٦
٩١	غیبی امداد	١٧٨
٩٢	فتح الملہم کی ابتداء	١٧٩
٩٣	مولی حجام	١٨٠
	جملہ مولیہ	١٨١
	دار العلوم کا ہر تنکا پیام اصلاح	١٧٩
٩٥	باب ١٢ دوسرے اساتذہ اور دار العلوم کا ماحول	١٨٣
٩٦	مولوی گل محمد خاں اور مولانا غلام رسول مرحوم	١٨٣
٩٧	حضرت میاں سید اصغر حسین صاحب	١٨٦
٩٨	حقہ ہی پر کھڑا کیجئے	١٨٦
٩٩	حضرت میاں صاحب کا کرم	١٨٧
١٠٠	حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب	١٨٨
١٠١	درس کا صحیح طریقہ	١٨٨
١٠٢	عملی درس	١٨٩
١٠٣	ملکوتی تلاوت قرآن	١٩٠
١٠٤	سارا ماحول سبق آموز تھا	١٩١
١٠٥	جاگیری عطیہ کو ٹھوکر ماردی	١٩٢

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
١٠٦	باب ١٣ طلبہ برادری کے کچھ مشغلے	١٩٤
١٠٧	ٹیکہ بازی	١٩٥
١٠٨	عالم نسیم فاطلہ کا لطیفہ	١٩٧
١٠٩	ہنڈیہ بازی	١٩٨
١١٠	رنگ بازی	〃
١١١	پٹاخے بازی	〃
١١٢	خر سواری	١٩٩
١١٣	شب شکاری کی مہم	١٩٩
١١٤	خرگوش کا شکار	٢٠٠
١١٥	چنے مٹر گنے کا موسم	٢٠١
١١٦	گنے میں ہرن کی ڈار	٢٠١
١١٧	مسلم حلوان اور مزعفر کی دعوت	٢٠٢
١١٨	غیب سے نازبرداریاں	٢٠٣
١١٩	باطنی اشاروں کی کرشمہ سازیاں	٢٠٤
١٢٠	باب ١٤ چند یادگار تقریبات	٢٠٦
١٢١	پہلی تقریب	٢٠٦
١٢٢	دوسری تقریب	٢٠٧
١٢٣	تیسری تقریب	٢٠٧
١٢٤	چوتھی تقریب	٢٠٧
١٢٥	پانچویں تقریب	٢١٠
١٢٦	"دیدۂ عبرت جو وا ہو"	〃
١٢٧	مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات	٢١٢
١٢٨	مسئلہ رفعِ یدین کی نئی توجیہ	٢١٣
١٢٩	باب ١٥ آستانہ صابری کی زیارت	٢١٥
١٣٠	ایمان سوز نظارہ	٢١٧
١٣١	للّٰہی ضیافت	٢٢١
١٣٢	کلیر سے منگلور	〃
١٣٣	اس قلندری رنگ سے کام نہ چلے گا	٢٢٢
١٣٤	باب ١٦ گروکل کانگڑی کا سفر	٢٢٤
١٣٥	گروکل	٢٣٤
١٣٦	سفر ٹونک و حیدرآباد	٢٤٤

Toobaa-elibrary.blogspot.com

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۱۳۷	مولانا انوار اللہ خاں کی بارگاہ میں	۲۴۷
۱۳۸	مجلسِ درس میں	۲۴۹
۱۳۹	مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کی بارگاہ میں	۲۵۰
۱۴۰	ایمانی کشمکش	۲۵۲
۱۴۱	ضمیر کی پکار	۲۵۵
۱۴۲	کشمکش کا خاتمہ اور ایمانی فیصلہ	۲۵۶
۱۴۳	مہاراجہ کا عطیہ	۲۵۸
۱۴۴	باب ۱۸ ایک اور لغزش گاہ	۲۶۰
۱۴۵	باب ۱۹ انّ ربّی سیہدین	۲۶۴
۱۴۶	پھر دیوبند میں	۲۶۵
۱۴۷	بہار میں عارضی قیام، اور دیوبند واپسی	۲۶۸

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
	باب ۲۰ دارالعلوم سے پھر حیدر آباد	۲۷۱
۱۴۸	ناگہانی اطلاع	۲۷۲
۱۴۹	میرا سفر کلکتہ جاری رہا	۲۷۳
۱۵۰	استقبال کرنیوالوں کا ہجوم اور مایوسی	۲۷۴
۱۵۱	حاجی عبدالصمد	۲۷۵
۱۵۲	خانہ قید میں	۲۷۶
۱۵۳	حیدر آباد میں	۲۷۷

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیامِ دارالعلوم

رکے جو پاؤں سے کانٹے نکالنے کیلئے — جنوں کو علم کی راہوں پہ ڈالنے کیلئے
بھنور میں اپنا سفینہ سنبھالنے کیلئے — تصورات کو سانچوں میں ڈھالنے کیلئے
انہی کی جہدِ مسلسل پہ گامزن ہوں میں!
رشید و قاسم و محمود کا چمن ہوں میں

تلاش کرکے محبت میں نقشِ پا ہم نے — نظر کو پاک کیا دل کو پارسا ہم نے
جنوں کو بادۂ عرفاں پلا دیا ہم نے — یہاں خرد کو مسلماں بنا دیا ہم نے
جہاں میں مہرِ نبوت کی اِک کرن ہوں میں
رشید و قاسم و محمود کا چمن ہوں میں

اسی زمیں نے غزالی بنائے ہیں کتنے — چراغ نسبتِ عالی جلائے ہیں کتنے
جنید و شبلی و رازی بنائے ہیں کتنے — دل و نگاہ کے عالم سجائے ہیں کتنے
ہوں دیوبند مگر جوہرِ وطن ہوں میں
رشید و قاسم و محمود کا چمن ہوں میں

★

حضرت مولانا افضال الحق صاحب جوہر قاسمی اعظمی
مہتمم مدرسہ دارالعلوم رسولپور
گورکھپور

Toobaa-elibrary.blogspot.com

داستان اس کتاب کی

تینتیس چونتیس سال کی مدت گزری ہیں بچپن کی بے شعوری سے نکل کر شعور و آگہی کی روشنی میں داخل ہو رہا تھا۔ میں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی، وہ دیندارانہ ماحول تھا، علم اور علماء کے چرچوں سے معمور تھا۔ اس ماحول میں آنکھوں اور کانوں کے راستے سے کچھ چیزیں دل کے اندر داخل ہو کر اپنی اپنی جگہ بنا رہی تھیں۔ خوب یاد ہے کہ ان دنوں دارالعلوم دیوبند کا تذکرہ بار بار کانوں میں پڑتا تھا، کتابوں اور رسالوں میں نظر سے گزرتا تھا۔ اور دل اس کی عقیدت اور محبت سے معمور ہوتا جا رہا تھا۔ اپنے ایک بزرگ جناب مولوی حکیم بشیر الدین صاحب علیہ الرحمہ کی خدمت میں اکثر میری حاضری ہوتی تھی، وہ دارالعلوم دیوبند کے تعلیم یافتہ اور فاضل تھے، اور اب طبابت کرتے تھے، ان کے یہاں ماہنامہ دارالعلوم دیوبند آیا کرتا تھا۔ مجھے اس سے بہت دلچسپی تھی، ہر تازہ شمارہ تو پڑھتا ہی تھا، پچھلے شماروں کی بھی جستجو رہا کرتی تھی، پھر ایک شمارہ ایسا بھی ملا جس میں "احاطۂ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن" کا عنوان تھا۔ اسے بہت شوق سے پڑھا۔ اس کی اور قسطیں تلاش کیں کچھ ملیں اور زیادہ تر نہیں ملیں۔ جو کچھ ملا، پڑھ لیا۔ اور جو نہیں ملا۔ اس کا شوق دل کو گرماتا رہا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے عرصہ کے بعد بصیغۂ طالب علمی دیوبند پہونچا دیا۔ وہاں موقع نہ مل سکا۔ پھر مرورِ زمانہ سے اس کا خیال بھی دھندلا گیا۔ سرسری سا خیال آتا اور نکل جاتا۔ ایک عرصہ کے بعد میرے ایک عزیز مولوی شبیر احمد مونگیری سلمہٗ نے اپنی

اپنی طالب علمی ہی کے دور میں سنہ ۱۴۰۱ھ میں "حیات مولانا گیلانی" شائع کی۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک دھنی اور باحوصلہ آدمی ہیں، حیات گیلانی میں جگہ جگہ مذکورہ بالا مضمون کا حوالہ آیا ہے، میرے شوق نے پھر انگڑائی لی، میں نے عزیز موصوف سے گزارش کی کہ اب دوسرے نمبر پر "احاطۂ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن" کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا انتظام کرو۔ انھوں نے اس تجویز کو پسند کیا، چنانچہ رسالہ دارالعلوم کی پرانی فائلوں میں اس مضمون کی جستجو کی گئی۔ عزیز موصوف نے یہ کام اپنے ایک دوست مولوی سید علی معصوم ثاقب فیض آبادی کے حوالے کیا، انھوں نے محنت شاقہ برداشت کر کے کچھ خود، اور کچھ اپنے دوستوں سے نقل کروایا، پچیس چھبیس قسطوں کا یہ مضمون مولوی صاحب موصوف کی کد و کاوش سے یکجا ہو گیا۔ انھوں نے اسے مرتب کیا، اس کی فہرست بنائی، اور کام مکمل کر کے مولوی شبیر احمد سلمہ کے سپرد کیا کہ اب وہ کتابت شروع کرائیں۔

مولوی شبیر احمد نے پورا مسودہ میرے حوالے کیا کہ ایک نگاہ میں بھی ڈال لوں، میں نے بغور پورے مضمون کا مطالعہ کیا، مجھے محسوس ہوا کہ نقل کرنے والوں سے اس کی نقل میں اتنی غلطیاں ہوئی ہیں کہ موجودہ حالت میں کاتب کے حوالے کرنا ممکن نہیں، اور جس طرز سے مسودہ تیار کیا گیا ہے، وہ بھی بہت ناقص اور سقیم ہے۔ اب مجھے دو محنتیں کرنی پڑیں، اوّل تو نقل کا اصل سے مقابلہ کرنا، چنانچہ اس کے لئے دیوبند سے متعدد قسطوں کے فوٹو منگوائے، کچھ قسطیں دارالمصنفین سے حاصل کیں، اور جہاں جہاں ضرورت محسوس ہوئی، اصل سے مقابلہ کیا، اور یہ ضرورت کتاب کے اکثر حصے میں ہوئی، اغلاط کی تصحیح کی، عنوانات کو درست کیا۔

دوسری محنت یہ کی کہ از سر نو پورا مسودہ اپنے قلم سے لکھا، اور اس کی ترتیب و تہذیب اس طرح کی کہ کاتب کو کوئی زحمت نہ ہو، ابواب قائم کئے، سابق فہرست ناتمام تھی، نئے سرے سے فہرست مرتب کی، مبیضہ تیار کرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ یہ داستان ابھی ناتمام رہے گی، جب تک اس میں مولانا کا ایک اور

Toobaa-elibrary.blogspot.com

مضمون نہ شامل کیا جائے، جو "یاد ایام گذشتہ" کے عنوان سے دار العلوم میں چار قسطوں میں شائع ہوا تھا، چنانچہ دیوبند سے اس کا فوٹو حاصل کر کے اسے بھی کتاب کا جز، بنا دیا۔ اس طرح یہ ایک مکمل کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے اس میں ابواب میرے متعین کئے ہوئے ہیں، ذیلی عناوین زیادہ تر مولوی معصوم صاحب کے متعین کئے ہیں۔ کہیں کہیں بعض عنوانوں کا اضافہ میں نے کیا ہے لیکن وہ اتنے کم ہیں کہ انھیں ممتاز کرنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی۔

اسطرح یہ کتاب کئی شخصوں کی محنت و کاوش کا حسین جمیل ہے، مولوی شبیر احمد صاحب اور مولوی معصوم علی ثاقب کا ذکر آپ پڑھ چکے ہیں، میرے ساتھ میرے چند عزیزوں نے بہت محنت کی، اوّل حافظ ضیاء الحق خیر آبادی سلمہٗ (عرف حاجی بابو) انھوں نے کتاب کی تکمیل میں بہت کاوش کی، دیوبند سے فوٹو انھیں نے منگوائے۔ اصل سے مقابلہ زیادہ تر انھوں نے کیا، پھر پروف کی تصحیح میں بہت محنت کی، کاتب سے برابر رابطہ قائم رکھا۔ اس کے لئے سفر کیا، غرض یہ کہ اگر انکا جذبۂ شوق اور محنت نہ ہوتی تو شاید کتاب اس شکل میں نہ آپاتی، دوسرے مولانا منظور احمد قاسمی استاد مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور۔ انھوں نے پروف کی تصحیح میں بھی مدد کی تیسرے حاجی بابو کے بڑے بھائی منظور الحق سلمہٗ جب یہ مسودہ تیار ہو رہا تھا، اسوقت یہ دار العلوم میں زیر تعلیم تھے، دار العلوم کے محافظ خانے سے مطلوبہ رسالے نکلوانا پھر ان کا فوٹو لینا، انھیں میرے پاس بھیجنا، یہ ساری مشکل مولوی منظور الحق نے حل کی۔ اور آخر میں میرے عزیز دوست مولانا قاری عبد الستار صاحب بلا آلی فتحپور بارہ بنکی نے نہایت ذوق و شوق کے ساتھ کتابت کی، اللہ تعالیٰ ان سب عزیزوں کو جزائے خیر عطا فرمائے، اور علم و عمل کی حلاوت و لذت نصیب فرمائے۔

ان مراحل کے بعد، اس کی طباعت کا مرحلہ تھا، مولوی شبیر احمد سلمہٗ اسکو شائع کرانے کا قصد رکھتے تھے، مگر وہ اپنے کچھ حالات کیوجہ سے مجبور ہو گئے، تو میرے عزیز دوست مولوی محمد طیب مالک مکتبہ طیبہ دیوبند، جنھوں نے میری ایک اور تالیف تسہیل المبتدی

شائع کی ہے انھوں نے اس کی طباعت کا بیڑا اٹھایا، چنانچہ انھیں کے تعاون سے یہ کتاب منظر عام پر آرہی ہے۔

جی چاہتا تھا کہ اس بیش قیمت کتاب پر اسی کے شایانِ شان ایک مقدمہ لکھا جاتا، مُلّا کی دوڑ مسجد تک۔ میں اور کہاں جاتا، مجھے کون پوچھتا؟ علم اور قلم میں میرے مرکزِ عقیدت، میرے جلیل القدر استاد حضرت مولانا محمد افضال الحق صاحب قاسمی مدظلہ ہیں۔ جن کے فیضانِ نظر سے ــــــ اگرچہ میں اپنی کم سوادی اور بے استعدادی کیوجہ سے یہ تو نہیں بتا سکتا کہ کیا ملا ہے لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ــــــ اس مشت خاک میں، اگر کسی کو کوئی ہنر نظر آئے، تو یہ انھیں کا فیضانِ نظر ہے، میں اپنی یہ کوشش اور محنت ان کی خدمت میں لے گیا، انھوں نے حسن قبول کی سند دی اور جیسا میں چاہتا تھا، حضرۃ الاستاذ نے ویسا ہی مقدمہ لکھ کر عنایت فرما دیا، جس کے الفاظ اگرچہ قلیل ہیں، لیکن معانی و مقاصد اسکے جلیل ہیں، غور و فکر کرنیوالوں کے لئے اس مختصر مقدمہ میں ایک جہاں پنہاں ہے فہل من مُدَّکِر ؟

اعجاز احمد اعظمی

مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور اعظم گڈھ

یکم محرم الحرام ۱۴۱۶ھ

Toobaa-elibrary.blogspot.com

باسمہٖ سبحانہ وتعالیٰ

مقدمہ

یادش بخیر

حضرت مولانا محمد افضال الحق صاحب قاسمی اعظمی مدظلہم

بچپن تو بچپن ہے، اسے کون لکھتا ہے اور کون پڑھے گا، لیکن یہی بچپن کبھی اتنا انوکھا، اس قدر دلچسپ اور ایسا پُرکیف ہوتا ہے کہ خالقِ کائنات بھی اسے لطف لیکر بیان کرتا ہے، اور سارے عالم سے پڑھوا دیتا ہے۔ جیسے حضرت موسیٰؑ کا بچپن، حضرت یوسفؑ کا بچپن، حضرت عیسیٰؑ کا بچپن (علیہم السلام) یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بچپن، لیکن کبھی بچپن عجیب نہیں ہوتا، مگر اس کا لکھنے والا قلم ایسا سحر بیان ہوتا ہے کہ ہم پڑھتے ہیں اور سر دھنتے ہیں، جیسے مولانا رومی، حضرت سعدی اور مولانا آزاد کے تراشے، افسانے اور ڈرامے ؎

افسانہ کہ گفت نظیری کتاب شُد

اسی کے ساتھ کبھی بچپن عجیب نہیں ہوتا، مگر وہ ماحول عجیب ہوتا ہے، جہاں یہ بچپن پرورش پاتا ہے کہ وہ سنگ پاروں سے ہیرے تلاش لیتا ہے، اور پتھروں کو کسوٹی بنانے کا ہنر جانتا ہے، ایسا ماحول قسمت سے ملتا ہے،

اور بڑی جگر کاوی اور دلسوزی اور عرق ریزی سے بن کر تیار ہوتا ہے، جیسے اصحابِ صفہ کا ماحول جس نے ابوہریرہؓ ایسے بدّو کو صرف تین سال میں امیرالمؤمنین فی الحدیث بنا دیا، اور جیسے شاہ ولی اللہ کا ماحول جس نے شاہ عبدالعزیز ایسے شاہکاروں کو سراج الہند بنا کر ہندوستان روشن کر دیا یا جیسے فرنگی محل کا خاندان جس نے عبدالحیؒ کو فقیہ الامت بنا کر ہمارے سامنے رکھ دیا تھا، اور جیسے دیوبند کا وہ ماحول جس نے محمود حسن کو شیخ الہند، انور شاہ کو محدثِ عصر، حسین احمد کو شیخ الاسلام بنا کر سارے زمانہ کو محوِ حیرت کر دیا، جس کی فنکاری، مردم شناسی اور سیرت سازی کی مثال آج نہیں مل سکتی، شکر اللہ مساعیہم،

آپ کے ہاتھوں میں جو کتاب ہے، وہ بچپن کے ایسے ہی ماحول کی عکاسی ہے اس کو کسی قلم کار نے عجوبۂ روزگار نہیں بنا دیا ہے، بلکہ وہ ایک عجوبۂ روزگار ماحول کی صرف ہو بہو تصویر ہے، مگر ایسی خوبصورت، اتنی دلکش اور اسقدر جذب و گداز پیدا کرنے والی ہے کہ آج کا عالم منہ دیکھتا رہ جائے گا، اسے یقین کرنا مشکل ہو گا کہ یہ کل کے واقعات ہیں، افسانہ نہیں ہیں، یہ کل کا دارالعلوم تھا، آج کا جامعہ نہیں۔

اس لئے مجھے اس پر حیرت نہیں ہوتی کہ مولانا اعجاز احمد صاحب ایسے استاذ، ایڈیٹر، خطیب اور مربی نے ایک صاحب کے بچپن کی کہانی کو کتاب بنانے کی ہمت کیسے کی ہے، ہاں میں شکر گذار ہوں کہ مولانا کی نظر نے تعلیم و تربیت کی ایسی یادگاریں تلاش کر دی ہیں کہ دینی مدارس دارالعلوم اور جامعات کے لئے قدِ آدم آئینہ ثابت ہو جائیں گی، بلکہ دارالعلوم دیوبند کو وہ آئینہ دکھائیں گی، اور وہ دم بخود ہو کر رہ جائے گا بقول شفیق جونپوری مرحوم ؎

زمانے کے تغیر کی کہانی پوچھتے کیا ہو!
کہ ہم سے اپنی ہی تصویر پہچانی نہیں جاتی!

Toobaa-elibrary.blogspot.com

میں نے دار العلوم سے ۱۳۶۰ھ میں فراغت پائی ہے، اور یہ کہانی ۱۳۳۲ھ کی ہے، مگر ان دونوں میں بھی بڑا فرق ہے، اتنا فرق کہ آج کے دار العلوم کو اور طلبا کو یقین نہیں آسکے گا کہ یہ کہانی ہماری ہی ہے، اور ہمارے ہی اساتذہ کرام کی ہے ___ مگر انھیں یقین کرنا چاہیے کہ یہ عثمانیہ یونیورسٹی میں دینیات کے صدر محترم کا بیان ہے، اور ان کی آپ بیتی ہے۔ کل آپ بھی ایسے ہی تھے، اگر یہی ماحول ہوتا تو آپ بھی آفتاب و ماہتاب بن جاتے۔

تعلیم و تربیت کا بنیادی پتھر ___ استاد ___ ہوتا ہے ایسا استاد جو ایک نظر میں بھانپ لیتا ہے کہ یہ ہیرا ہے یا پتھر، اگر ہیرا ہے تو تاج میں جڑ جڑ دیتا ہے، ورنہ عمارتوں میں لگا کر تاج محل اور لال قلعہ بنا دیتا ہے۔

جو استاد بچے کا مستقبل پڑھ لیتا ہے کہ اس کلی کو پھول بننا ہے، پھر اپنی لیاقت، توجہ اور شخصیت کی شبنم سے اس کو پھول بنا دیتا ہے اور کبھی گل و گلزار بھی۔

جو استاد ___ کشا گرد کی تہ بہ تہ انجمن کو شیخ الہند کی طرح دور بھی کر دیتا ہے، اور ہمیشہ کے لئے خیر کی طرف اس کا رخ بھی موڑ دیتا ہے۔

وہ استاد ___ جو عقلیت پسندی سے کبھی ٹکراتا نہیں، ہاں اپنی برتر علمیت اور فنکاری سے اس میں جلا پیدا کر دیتا ہے، پھر اسے حق کے سامنے جھکا دیتا ہے، جیسے حضرت کشمیری اور مولانا عثمانی جیسے حضرات نے مناظر احسن کی نگاہیں چکا چوند کر دیں کہ وہ میر زاہد کا حاشیہ بھول گئے کہ علم حصول کا نام ہے یا زوال کا ___ جب انھوں نے سن لیا کہ علم ایک نور ہے جو خدا کی بارگاہ سے ملتا ہے، اس طرح اساتذۂ دار العلوم نے ان کی علمی تشنگی کو آب زمزم پلا کر ایسا سیراب کر دیا کہ عثمانیہ یونیورسٹی بھی انکی شادابی کو ختم نہ کر سکی

وہ استاد جو شاگرد کو علم ہی نہیں دیتا بلکہ علم کی جستجو اور لگن بھی دیتا ہے، جس پر آگے چل کر وہ اپنی شخصیت کو مکمل کرتا ہے، اور اپنی معراج کی طرف قدم بڑھاتا ہے، جیسے شیخ الہند کی گفتگو، ان کے مختصر اسباق اور دلنواز صحبتیں،

جن سے دل و دماغ کی گرہیں کھلتی چلی جاتی ہیں اور ان کی وہ بحثیں جو مولانا حسین احمد مدنی سے اور شیخ الہند سے حدیث و فقہ کے لئے ترمذی و بخاری میں ہوتی تھیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

وہ استاد ___ جو روحانیت کے جذب باطن سے اور قلبی طمانیت سے دماغ کو نہیں بلکہ دل کو زندہ کر دیتا ہے، اور خدا سے زندہ تعلق پیدا کر کے عقل و خرد کو دل کا حاشیہ بردار بنا دیتا ہے، جیسے مفتی عزیز الرحمٰن کی ہدایات؛ میاں اصغر حسین کی صحبت، حضرت شیخ الہند کی تسلی، اور حضرت مدنی کا خواب میں آکر ان کی مدد کرنا، چنانچہ مناظر احسن جیسا معقولی نوجوان جب روحانیت سے مطمئن ہو گیا، تو اس کے والہانہ پن، اس کے جذب باطن اور معرفت و سلوک کی پرواز نے اس کو کبریت احمر بنا دیا اور دنیا کی کوئی شخصیت کوئی جامعہ اور کوئی یونیورسٹی اسے مرعوب نہیں کر سکی، بلکہ اس کے سامنے سپر انداز ہو گئی، اس لئے وہ [illegible] مناظر احسن گیلانی ہو گئے، ایسی ہی فضا کا اثر ہے کہ آج تک دار العلوم میں یہ کہاوت چلی آرہی ہے کہ یہاں کا چپراسی بھی صاحب نسبت ہوتا ہے

مگر یہ باتیں ہیں جب کی کہ آتش جواں تھا

دار العلوم کی یہ ساری علمی، روحانی، عملی اور جذب و سلوک کی فضا وہاں کے بانیان محترم خصوصاً مولانا محمد قاسمؒ وغیرہ کی دین ہے، جنھوں نے دار العلوم میں منتخب روزگار افراد اکٹھا کر دیئے تھے جو علمی بھی تھے، روحانی بھی تھے، اہل تقویٰ بھی۔ اس لئے حضرت شیخ الہند اور حضرت تھانوی ایسے رجال امت تیار ہوئے، پھر ان حضرات نے فضا بنائی تو مولانا عثمانی، علامہ کشمیری جیسے نابغۂ روزگار اٹھے، ان کے بعد بہت واضح کوشش مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دار العلوم نے فرمائی کہ مولانا انور شاہ کو فتحپوری دہلی سے حضرت مدنی کو آسام سے اسی طرح مولانا ابراہیم صاحب اور مولانا اعزاز علی جیسے حضرات کو کہاں کہاں سے تلاش کر کے لائے اور دار العلوم "ایں خانہ

Toobaa-elibrary.blogspot.com

ہمہ آفتاب است" بن گیا۔ تو کسی دار العلوم کی مردم ساز فضا بڑی لگن، ذہانت اور دلسوزی سے بنتی ہے، اور جب بن جاتی ہے تو ایک طرف قَالَ اللّٰہُ وَقَالَ الرَّسُول کی آواز آتی ہے اور دوسری طرف الا اللہ اور اللہ ہو کی ضربیں سنائی دیتی ہیں، ان دونوں پہیوں سے گاڑی چلتی رہے تو صراطِ مستقیم پر قائم رہتی ہے ورنہ کسی طرف لڑھک جاتی ہے

آپ اس کتاب کو پڑھیے تو ـــــ اس کی عبارتوں کے ساتھ اسکے بین السطور کو بھی پڑھیے اور دیکھیے کہ اک وہ بھی انسان تھے جنھوں نے ائمہ فن پیدا کئے اور اک ہم بھی عالم، فاضل خطیب اور مدرس ہیں کہ کام کے آدمی نہیں پیدا کر پاتے، آخر کیوں؟

مولانا گیلانی کے یہ تأثرات صرف ایک سال کے قیام دار العلوم کے تھے، مگر ہم کو آپ کو تعلیم و تربیت کے برسہا برس ہاتھ آئے ہیں، غور کیجیے، ہم نے آپ نے کیا کیا؟ طلباء آئے تو انھیں کتاب پڑھائی یا ان، انھیں علم دیا یا عمل اور آپ کے انھوں نے اسلام پایا یا ایمان۔ ہم نے آپ نے ان سے خدمت لی یا ان کی خدمت بھی کی، ہمارے آپ کے اخلاق و عادات شعور و قلم و زبان سے کتنے لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلنے لگے، یہ کتاب کہتی ہے کہ اس مسئلے پر غور کیجیے، اپنے اور اپنے ماحول کا جائزہ لیجیے اور فیصلے کیجیے پھر مستقبل سنوارنے کے لئے اقدام کیجیے۔

مولانا اعجاز احمد صاحب تعلیم و تربیت کے آدمی ہیں، میں نے انکے نمونے غازی پور، گورینی جونپور میں ـــــ اور اب شیخوپور میں دیکھے ہیں مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تعلیم و تربیت کی فضا مزید بہتر، خوش گوار اور علیٰ منہاج النبوۃ بنانے کی تڑپ ان میں موجود ہے، اور اسی تڑپ نے اس روداد سفر کو کتابی شکل میں لاکر اہل مدارس کو اپنی جد وجہد کی راہ دکھانا ضروری سمجھا ہے۔

خدا اس مسافر کی ہمت بڑھائے ــــ جو منزل کو ٹھکرا دے منزل سمجھ کر

سمجھ میں نہیں آتا کہ دار العلوم کا ایک طالب علم، ایک گاؤں میں بیٹھ کر تعلیم و تربیت کو خالص دیوبندی اسلاف کے نہج پر لانے کی دھن میں سرگرداں ہے، اور خود اہل دار العلوم اوّل و ثانی کو اس کی مطلق پروا نہیں کہ وہ بھی اپنی متاعِ گمشدہ کو تلاش کریں، اس کی گرتی ہوئی دیوار کی مرمت کریں۔ شاید ؎

کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا
اگر یہ سچ ہے تو یہ بھی سچ ہے کہ متاعِ کارواں جاتا رہا۔

کاش دار العلوم کو کوئی پھر حبیب الرحمٰن عثمانی میسر آتا، کوئی وحید الزماں کیرانوی مل جاتا، کوئی صاحبِ دل، صاحبِ اجتہاد نصیب ہوتا، جو اسکی نشاۃِ ثانیہ کے لئے سعی جمیل کرتا، اور یہ ادارہ اپنی بنیادوں پر قائم ہو سکتا ـــــ لیکن اس سے ان حضرات کی ذمہ داریاں کم نہیں ہوتیں جو تحریکِ دار العلوم کے علم بردار ہیں، کہ وہ تعلیم و تربیت کے اعلیٰ معیار کے ساتھ روحانیت کی فضا بنا کر ایسے انسان بنانے لگیں جو دنیا کے بھی آدمی ہوں اور آخرت کے بھی، اور پورا ادارہ علیٰ منہاج النبوۃ چل رہا ہو یا چلنے کی کوشش کر رہا ہو۔

محمد افضال الحق قاسمی
نزیل دار العلوم رحمانی حیدرآباد
۱۰؍ ذی الحجہ ۱۴۱۵ھ

Toobaa-elibrary.blogspot.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب ١

ٹونک میں

الاستاذ الامام الہمام المقدام مولانا السید انور شاہ الکشمیری نوّر اللہ مضجعہٗ کے ثمرۃ الفواد، خلفِ رشید مولانا سید ازہر شاہ قیصر سلمہ اللہ تعالیٰ کے مسلسل تقاضوں سے آخر اس پر آمادہ ہونا ہی پڑا کہ دارالعلوم دیوبند کے حظیرۃ القدس میں چند سال خاص حالات کے تحت اس فقیر کے جو گزرے ہیں ان کے مٹے مٹائے ارتسامات، بچی کھچی یاد، دل و دماغ کے گوشوں میں دبی چھپی جو رہ گئی ہے۔ انھیں قلم بند کر کے ان کی خدمت میں پیش کروں، تاکہ "دارالعلوم" جدید میں انکو وہ شائع کریں۔ کم و بیش چالیس سال کی مدت اس واقعہ پر گزر چکی ہے، صرف حافظہ کی مدد سے، جو باتیں یاد آتی چلی جائیں گی۔ انھیں حوالۂ قلم کروں گا، نہیں کہہ سکتا کہ حافظہ کی کمزوریوں کے اثر سے میرا یہ تحریری بیان قطعاً محفوظ ہے۔ انسان ہوں، نسیان کا ترکہ فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَہٗ عَزْمًا، دلیں آدم بھول گیا، اور ہم نے اس میں عزم و ارادہ کی پختگی نہیں پائی، کے قرآنی وثیقہ کی بنیاد پر یقیناً مجھے بھی ملا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم

سچ پوچھیے تو دارالعلوم دیوبند سے میرا تعلیمی رشتہ تقدیری فیصلے کی ایک زندہ شہادت ہے۔ یوں تو بحمد اللہ پیدا ہوا تھا ایک اسلامی گھرانے میں۔ ایسے گھرانے میں جہاں عربی علوم و فنون کا چرچا پہلے سے موجود تھا۔

لیکن میرے جدّ امجد مولانا محمد احسن گیلانی مرحوم کے علمی ذوق پر معقولیت کا رنگ غالب تھا، بہار کے ایک گاؤں میں قیام کرنے کے بعد بھی اسی ذوق کا نتیجہ تھا کہ الافق المبین، شرح تجرید، اور اس کے حواشی قدیمہ وجدیدہ وغیرہ کے نسخے بھی ان کے اس دہقانی کتب خانے میں موجود تھے، اور میں نے دیکھا تو نہیں لیکن سنا ہے کہ مسلمانوں کی قدیم منطق اور فلسفہ کے تشنہ کاموں کا ایک گروہ اسی گاؤں میں ان کے اردگرد جمع بھی ہو گیا تھا جن میں مغربی پنجاب، بلکہ سرحد تک کے طلبہ بھی شریک تھے، سرحدی علاقہ ہزارہ کے ایک بزرگ مولانا عبداللہ مرحوم تو پڑھنے کے لئے گیلانی آئے اور اسی کو وطن بنا کر یہیں آسودۂ خاک ہوئے، خاکسار نے ان کو دیکھا بھی تھا بچپن میں ان کے ہفتہ داری مواعظ سے مستفید بھی ہوتا رہا۔

خیر عرض کرنے کی بات یہ ہے کہ علوم عربیہ کا ذوق گو ہمارے خاندان کا موروثی ترکہ تھا، لیکن اس ذوق پر معقولیت کا رنگ چونکہ مستولی تھا، اس لئے ہمارے مرحوم عمّ محترم مولانا الحاج الحکیم سید ابو النصر نور اللہ مرقدہٗ، جن سے عربی کی ابتدائی تعلیم فقیر حاصل کر رہا تھا، انھوں نے آئندہ تعلیم کے مراحل کی تکمیل کے لئے مجھے ریاست ٹونک پہنچا دیا، جہاں خیرآباد کے معقولی اسکول کے امام مولانا سید برکات احمد رحمۃ اللہ علیہ اپنے درس کی مسند بچھائے ہوئے زیادہ تر عقلی علوم (منطق و فلسفہ) کی تدریس و تعلیم میں بصد ذوق و شوق منہمک تھے، مولانا برکات احمد نور اللہ مرقدہٗ براہ راست مولانا عبد الحق خیرآبادی کے تلمیذ رشید تھے۔ گویا خیرآبادی درس کا آخری چراغ ان ہی کی بدولت 'راجپوتانہ' کے اس سنگستانی علاقہ کے ایک گوشہ میں روشن تھا، تیرہ چودہ سال کی عمر تھی، جب اسی معقولی ماحول میں فقیر داخل ہوا تھا، دوسرے علوم نحو و فقہ وغیرہ کی کتابیں تو ٹونک کے مدرسہ خلیلیہ کے درسی

Toobaa-elibrary.blogspot.com

اساتذہ سے شروع ہوئیں، اور منطق کی کچھ کتابیں گو پڑھ چکا تھا، لیکن مولانا برکات احمد صاحب نے غیر معمولی شفقت اور توجہ کی وجہ سے اس فن کے ابتدائی رسالہ ایساغوجی ہی سے پڑھانا شروع کیا، تمام اسباق میں قدرۃً اسی سبق کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی۔ فن کا ذوق اتنا مستقل کر دیا تھا کہ اس چند ورقی رسالہ کے مطبوعہ نسخے بکثرت ملتے تھے، لیکن فقیر نے ایساغوجی کا قلمی نسخہ اپنے ہاتھ سے تیار کیا، روز کا سبق قلم سے لکھ لیا کرتا تھا، اور استاذ محترم سے جو تقریر اس سبق کے متعلق سنتا حاشیہ پر بزبان اردو چڑھا لیا کرتا تھا کہ معقولات کی ایک ایک کتاب کو اسی التزام کے ساتھ پڑھوں گا، بزرگوں کے قصے سمند ناز کے لئے تازیانہ کا کام کرتے تھے، مولانا اپنی تفریحی صحبتوں میں سلف کی علمی اولوالعزمیوں کا تذکرہ کرتے اور کچھ اس والہانہ انداز میں یہ داستان سناتے کہ ولولوں کا ایک طوفان دلوں میں امنڈنے لگتا تھا، اور گویہ التزام کہ عقلیات کے سلسلے کی ہر کتاب کو اپنے ہاتھ سے لکھوں گا، اور استاد سے جو کچھ سنوں گا حرف بحرف، اس کتاب کے حاشیہ پر اس کو درج کرتا چلا جاؤں گا، یہ التزام جو قطعاً مالایلزم تھا، صرف ایساغوجی ہی کی حد تک محدود ہو کر رہ گیا، ایساغوجی کا وہ قلمی نسخہ، اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا، استاذ مرحوم کے حواشی سے مزین، میرے کتب خانے میں بحمد اللہ اس وقت موجود ہے، اس عہد کی، ایک لذیذ یادگار ہے، اپنے عہد طالب علمی کے حروف اور عبارات کو دیکھتا ہوں اور عبرت و بصیرت حاصل کرتا ہوں۔

بہرحال پھر دوسری کتابوں کا سلسلہ شروع ہوا، اور تقریباً چھ سات سال تک ٹونک میں اپنی زندگی خیرآبادی اسکول کے خصوصی مذاق کے زیر اثر گزرتی رہی، ہاتھ سے لکھ لکھ کر نصابی کتابوں کے پڑھنے کا قصہ

تو شروع ہی میں ختم ہو گیا تھا لیکن استاذ مرحوم کی درسی تقریروں کے نوٹ کرنے کا سلسلہ زمانے تک جاری رہا، اس سلسلے میں بعض دلچسپ لطائف بھی پیش آئے جنھیں اب بھی جب سوچتا ہوں تو تھوڑی دیر کے لئے عہد ماضی کی لذتوں میں کھو جاتا ہوں (۱)

اسی کے ساتھ معقولات ہی کے سلسلے کے بعض نادر مخطوطات کے نقل کرنے میں جس خاص طریقے سے یہ فقیر کامیاب ہوا تھا، اور زندگی کے بڑے کارناموں میں ان کو شمار کرتا تھا، جب اپنی ان باتوں کا خیال آتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ ایک ہی آدمی کو خیالات کی رنگا رنگی کے ہاتھوں گردش ایام کے کن کن چکروں سے گزرنا پڑتا ہے۔

یاد آتا ہے کہ بو علی سینا کی مشہور کتاب شفا پر ایک ایرانی فاضل، جسے موجودہ دنیا تو بھلا چکی ہے، لیکن ایک مدت تک "عقل حادی عشر" (گیارہویں عقل)

---

(۱) معقولیت کے ساتھ ساتھ اردو ادب کا ذوق بھی فقیر پر اسی قدیم ماحول میں بعض بیرونی موثرات کے تحت غالب تو نہ تھا لیکن گونہ اس سے بھی تعلق کچھ مزید قائم ہو گیا تھا، اسی کا شاید نتیجہ تھا کہ منطق میں قضایا موجہات کی جو بحث ہے، اور انکی مختلف پیچیدہ قسمیں بنائی گئی ہیں، میں نے ہر قضیہ کو ایک زندہ شخصی وجود قرار دیا، اور ہر قضیہ کا رشتہ دوسرے قضیہ سے قائم کر کے ایک مقالہ ہی لکھ ڈالا، خدا جانے کس طرح اس مقالے کے چند اوراق استاد مرحوم کی نظر سے بھی گزر گئے، ہمیشہ اس کا ذکر فرماتے، اور کہتے کہ اس شخص کی حماقت ملاحظہ فرمائیے۔ آپ نے ہر قضیہ کو گویا مجسم ایک انسانی وجود فرض کر لیا، اور باہمی ان قضایا میں رشتے قائم کئے ہیں، ہر ایک کی زبان سے تقریر کرائی گئی ہے، حضرت حکیم صاحب پر جہاں منطق و فلسفہ کا ذوق غیر معمولی طور پر مسلط تھا وہیں جدید اخباری ادبیات سے سخت کارہ تھے وہ ان چیزوں کو (باقی جفوآئندہ)

Toobaa-elibrary.blogspot.com

کے نام سے مشہور تھا، گویا ارسطاطالیسی نظام میں "عقولِ عشرہ" کے ساتھ گیارہویں عقل کا اضافہ اس کے وجود سے سمجھا جاتا تھا کہ ہو گیا ہے (آقا حسین خوانساری) ان کا نام تھا، شفا پر ان کا ایک حاشیہ ہے، سارے ہندوستان میں اس حاشیہ کا صرف ایک ہی نسخہ حکیم صاحب مرحوم کے پاس تھا، اتفاقاً اس کی جلد ٹوٹ گئی، حکیم صاحب اپنے اخص ترین تلامذہ سے بھی اس حاشیہ کو مخفی رکھتے تھے، فقیر پر غیر معمولی اعتماد فرما کر صیغۂ راز میں یہ کتاب جلد بندھوانے کے لئے میرے سپرد فرمائی، ہدایت تھی کہ کسی طالب علم کی نظر اس پر نہ پڑے، وقت کُل دو دن کا دیا گیا، لیکن فقیر نے دوسروں کی حد تک تو دیانتداری سے کام لیا، مگر خود بیٹھ گیا، اور شب و روز کی مسلسل محنت سے کئی سو صفحوں کی اس کتاب کو اپنے ہاتھ سے نقل کر کے جلد بنوا کر تیسرے روز کتاب حکیم صاحب کی خدمت میں پیش کر دی، زندگی بھر ان کو خیال رہا کہ کسی دوسرے کے پاس یہ نسخہ نہیں ہے، ان کو معلوم نہ ہو سکا کہ جس پر اعتماد کیا گیا تھا، اسی نے خیانت سے کام لیا، اور اب یہ حال ہے کہ خود مجھے معلوم نہیں کہ اس منقولہ نسخے کو کس کے حوالے کر دیا) (۱)

اسی عرصے میں طرابلس کی جنگ کا شعلہ بلند ہوا، جنگِ طرابلس کا وہی شعلۂ جوالہ، جس کے بعد دنیا کو جنگوں اور لڑائیوں سے کبھی فرصت نہ ملی، گویا ایک ہی شعلہ تھا، جو دب دب کر بھڑکتا رہا، اور اس وقت تک بھڑک اٹھنے کی دھمکیاں دے رہا ہے، جنگِ عظیم اور جنگِ عظیم کے بعد جنگِ اعظم کی آگ بلند ہوتی رہی، اور کون کہہ سکتا ہے کہ جنگِ اعظم پر نصف ختم ہو چکا ہے۔ الملحمۃ الکبریٰ کے نام سے جس جنگ کی پیشین گوئی کی گئی ہے، کیا دبانے والوں کی

---

(۱) حاشیہ سو گذشتہ کا: سطحیت قرار دیتے تھے، تو غرض تھی کہ ذکا گوئی طالب العلم اخبار نہ دیکھے، ناول نہ پڑھے، اور جدید اردو ادب کے مصنفین کی سطحی کتابوں کا مطالعہ نہ کرے، دراصل میرا مضحکہ اسی رجحان کے تحت اڑایا جاتا۔

(۱) قوسین کے درمیان کی یہ عبارت اصل مضمون میں حاشیہ پر تھی

کوششیں اس کے دبانے میں کامیاب ہوں گی؟ طرابلس کے بعد بلقان کی ریاستوں کی ہلچل شروع ہوئی، خلافتِ اسلامیہ اور استامبول کی شاہنشاہیت خطرے میں آ گئی، اسلامی دنیا، جس میں ہندوستان کا اسلامی علاقہ بھی شریک تھا سب پر بدحواسی طاری تھی، ہر شہر اور قصبے میں جلسے ہو رہے تھے، چندوں کی بھرمار تھی، اُردو پریس جس کی پرواز ہفت وار اخباروں سے زیادہ نہ تھی، اسی حادثہ کبریٰ نے اس کی سطح کو بھی بلند کر دیا خبروں کی طلب بڑھ گئی، چھوٹے سائز کے یک ورقے، دو ورقوں سے روزناموں کی ابتدا ہوئی، پھر تو طوفان ہی آ گیا، خیر کہنا یہ ہے کہ رفتہ رفتہ اسلامی ممالک کے ان جانگزا حوادث سے راجپوتانہ کا دور افتادہ ٹونک کا اسلامی گوشہ قدرۃً متاثر ہونے لگا۔ بعض لوگ چندہ گری کے مشغلے کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے، جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کے بعد ایک ندوی مولوی صاحب ٹرکی کی امداد کے لئے مسلمانوں سے امداد طلب کرتے تھے، چار پانچ روپے ہر ہفتہ میں مل بھی جاتے تھے، فقیر بھی ان کی تقریروں کے سننے والوں میں سے تھا۔ ایک دفعہ اپنی تقریر میں غیرت دلاتے ہوئے بولے کہ اس شہر میں عربی مدرسہ بھی ہے، علماء بھی ہیں، طلبہ بھی ہیں، لیکن جمود اور بے حسی کی انتہا ہے کہ ہفتوں سے چلا رہا ہوں، کوئی پشت پناہی کے لئے تو کیا اٹھتا، بات بھی نہیں پوچھتا، یہی پہلا تیر تھا جو میرے عقلیت زدہ دل میں تیر انداز ہوا، ہفتہ بھر سوچتا رہا،

پہلی تقریر

جمعہ تک طے کر لیا کہ آج نمازِ جمعہ کے بعد مسلمانوں کو خود توجہ دلاؤں گا، عام پبلک میں تقریر کرنے کا یہ پہلا موقعہ تھا، اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ استاد مرحوم نواب ٹونک کے ساتھ ایک مہینہ کے لئے باہر چلے گئے تھے، میدان خالی بھی تھا، ورنہ جیسے ان کے یہاں اخبار بینی وغیرہ سطحیت کے الزام سے مطعون تھی، اسی طرح وعظ گوئی بھی، حکیم صاحب قبلہ

Toobaa-elibrary.blogspot.com

کے نزدیک سطحی مولویوں کا پیشہ سمجھی جاتی تھی، خیر جمعہ کا دن آگیا، نماز بھی ہوگئی، صرف درس کے چند خاص رفقاء ہی کو اپنے ارادے سے مطلع کیا گیا تھا۔ اچانک بیچ مسجد میں کئی ہزار نمازیوں کو بلند آواز میں کھڑے ہوکے

وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ۔ اور جدا ہو جاؤ آج کے دن اے جرم کرنے والے لوگ کی قرآنی آیت سے کچھ اس طرح خطاب کیا گیا کہ، جو جہاں تھا، وہاں سے ہلنا بھی محسوس کر رہا تھا کہ ناممکن ہے، معًا اسی کے ساتھ رسمی حمد و نعت کے بعد قرآن کی ایک آیت کو تلاوت کرتے ہوئے کہنے والا کچھ کہنے لگا، دس پندرہ منٹ سے زیادہ وقت شاید نہ گزرا تھا کہ ساری مسجد میں کہرام مچا ہوا تھا، جو کہہ رہا تھا وہ بھی بے ہوش تھا، رو رہا تھا اور جوش رہے تھے، وہ بھی دھاڑیں مار رہے تھے، جس کے پاس جو کچھ بھی تھا پھینکتا چلا جاتا تھا، روپئے بھی تھے، پیسے بھی تھے، گھڑیاں بھی تھیں، انگوٹھیاں بھی تھیں شیروانیاں بھی تھیں چھڑیاں بھی تھیں، سب سمیٹی گئیں، اندازہ کیا گیا، تو جس مسجد میں چند ہفتوں تک کی تقریروں سے سو روپے بھی نہ وصول ہو پائے تھے، اسی مسجد میں دیکھا گیا کہ تقریبًا پانسو سے اوپر کا سرمایہ جمع ہو گیا ہے، ایک حال تھا، جس کا تجربہ زندگی کے ماضی میں کبھی نہ ہوا تھا، اور مستقبل میں بھی اس کی کوئی نظیر سامنے نہ آئی، ٹونک والوں میں سے کچھ مردانِ راہ کھڑے ہو گئے، جو گونگا تھا، اسی کو بولتے ہوئے دیکھ کر ان لوگوں نے اپنا مستقل واعظ ہی اس کو بنا لیا، محلہ محلہ میں جلسے ہونے لگے، اور جسے واعظِ شہر بنا لیا گیا تھا، وہی چیختا چلا تا گاتا بجاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس بے نوا مفلس شہر سے بھی بیس ہزار کے قریب کا سرمایہ ٹرکی کے امدادی فنڈ میں ارسال کیا گیا، حکیم صاحب قبلہ کی غیبوبت سے خوب بددلی، جب واپس ہوئے تو

نہ پوچھئے کہ اپنے اس شاگرد کے متعلق جسے وہ حمد اللہ اور قاضی مبارک کا کامیاب مدرس بنانا چاہتے تھے، اسی کے متعلق یہ سن کر کہ وہ واعظِ شہر بن گیا ہے، ان پر کیا گزری، خود اس پر جس حد تک برس سکتے تھے برسے ہی، اور جن لوگوں نے واعظِ شہر بنانے کے جرم میں حصہ لیا تھا، ان کی جو درگت بنی، وہی بیچارے جانتے ہوں گے۔ غفر اللہ لھم ولنا اجمعین۔

ہاں تو ہوا یہ کہ اس عرصہ میں چند دنوں تک تو دماغی سرمایہ سے اپنی تقریروں میں کام لیتا رہا، لیکن نوعمری کا زمانہ، سرمایہ بہت جلد ختم ہو گیا۔ ضرورت اضافہ کی ہوئی، اتنی سمجھ پیدا ہو چکی تھی کہ احیاء العلوم غزالی کا مطالعہ عربی زبان میں کر کے مطالب کو اخذ کر سکتا تھا۔ احیاء العلوم کا مطالعہ شروع ہوا۔ مطالعہ کلیتًہ دوسروں کے لئے کیا جاتا تھا، لیکن بجائے دوسروں کے، سب سے پہلے غزالی کی گرفت میں خود مطالعہ کرنے والا پھنس گیا، اور ایسا پھنسا کہ شاید آخری سانس تک یہ گرفت ڈھیلی ہوتی ہوئی نظر نہیں آتی، بلکہ آرزو اگر کچھ رہ گئی ہے تو یہی رہ گئی ہے کہ ؂

گر اے زاہد دعائے خیر می گوئی مرا ایں گو
کہ ایں آوارہ کوئے بتاں آوارہ تر بادا[1]

دماغ الٹ گیا، طبیعت پلٹ گئی، دل بدل گیا، جو کچھ اب تک تھا، وہ باقی نہ رہا، نتیجہ یہ ہوا کہ اب نہ منطق کی کتابوں میں جی لگتا ہے نہ فلسفہ میں لذت ملتی ہے، سب سے دل اچاٹ ہو گیا، اسی اضطراب میں کچھ دن کیلئے ٹونک سے غائب بھی ہو گیا، قربِ مکانی کی وجہ سے خواجہ ہند کے آستانے پر

---

(۱) اے زاہد اگر تم میرے حق میں دعائے خیر کرنا چاہتے ہو تو یہ دعا کرو کہ یہ آوارہ کوئے بتاں، کچھ اور آوارہ ہو جائے (مرتب)

Toobaa-elibrary.blogspot.com

جاگرا، اسی زمانہ میں وہ نظم، حضرت خواجہ اجمیریؒ کے "قبۂ بیضا" کے سامنے کھڑے ہوکر سنائی گئی، جو متعدد بار شائع بھی ہوئی، سنا ہے کہ اجمیر شریف کی مقامی حکومت کی طرف سے ضبطی کا حکم بھی صادر ہوا تھا۔ یہ نظم اب نہیں ملتی ہے، مناسب ہے کہ اس موقع پر اسے درج کردوں، لوگوں کو اسکی یاد بھی تازہ ہو جائے گی، اور جن جذبات سے اس زمانہ میں سینہ معمور تھا، کچھ ان کا بھی اندازہ اس نظم سے ہو سکتا ہے، نظم کی پیشانی پر لکھا ہوا ہے

شکوۂ خواجہ

"یعنی وہ نظم" جو قبۂ بیضاء اجمیر قدس سرہٗ کے روبرو ۲۲ صفر المظفر ۱۳۳۲ھ میں سنائی گئی" اس کے بعد یہ اشعار تھے۔

بے طرح درد سے دل آج بھرا آتا ہے خون بن کر جگر آنکھوں میں چلا آتا ہے
حسرت و یاس کا سینے سے پرا آتا ہے لب پہ شکوے چلے آتے ہیں گلہ آتا ہے
جسم میں آج مری جان گھٹی جاتی ہے
میرے ارمانوں کی اقلیم لٹی جاتی ہے
خوف بھی آتا ہے، کچھ شرم سی بھی آتی ہے کبھی عقل ادب آموز بھی سمجھاتی ہے
شانِ اجلال کسی کی کبھی دھمکاتی ہے بات آآکے مرے لب پہ پلٹ جاتی ہے
سطوت و صولتِ خواجہ سے میں تھراتا ہوں
دل میں جو بات ہے کہتے ہوئے گھبراتا ہوں
پر یہ مشکل ہے کہ ہم اب تو پھنکے جاتے ہیں آتشِ جورِ نصاریٰ میں بھنے جاتے ہیں
کفر کے ابر میں ہر لحظہ گھرے جاتے ہیں اشک کی طرح سرِ فرش گرے جاتے ہیں
اب میسر ہے کہاں جلوۂ عیش و راحت!
چار جانب نظر آتی ہے تو آفت آفت

حالتِ قوم وہ بگڑی کہ بدلنے کی نہیں چپ رہوں میں تو مصیبت کبھی ٹلنے کی نہیں
آرزو میری خموشی سے نکلنے کی نہیں اب سنبھالوں بھی طبیعت تو سنبھلنے کی نہیں
بات جو کچھ ہے مرے دل میں وہ کہہ ڈالوں گا
ایسی حالت میں بھی کیا دل میں گرہ ڈالوں گا
دل میں جب ضبط نہیں، بندشِ لب بھی نہ سہی مہرِ تاباں جو نہیں، انجمِ شب بھی نہ سہی
جس طرح اور نہیں، ایک ادب بھی نہ سہی آج تک کون سے اچھے تھے تم اب بھی نہ سہی
آج گستاخی مری حد سے گزر جائے گی
جانے کیا شعلہ بیانی مری کر جائے گی
آج آقا سے غلاموں کی شکایت ہوگی روبرو ان کے بیاں غم کی حکایت ہوگی
شمس کے سامنے ذرے کو جسارت ہوگی آج پُر درد صداؤں کی سماعت ہوگی
ایک مدت کے دبے شعلے بھڑک اٹھیں گے!
سرد سے سرد بھی دل آج بھبھک اٹھیں گے
کشورِ ہند کے سلطاں سے گزارش ہے مری اسکی سرکار میں کچھ کہنے کی خواہش ہے مری
دل سے فریاد سُنے وہ بھی، یہ کوشش ہے مری ایک ہی چھینٹے کی محتاج یہ سوزش ہے مری
آج میں اپنی شکایت کا صلہ پاؤں گا
اپنی بگڑی ہوئی تقدیر بنا لاؤں گا
کیا غریبوں پہ مرے خواجہ نوازش ہے یہی ہم ستم دیدوں کا پاس گزارش ہے یہی
چشت کے ابر کی دنیا میں تراوش ہے یہی کیا مسلمانوں پہ فیضان کی بارش ہے یہی
حیف باشد کہ دریں وقت نہ خیزی آقا
لختے برحالتِ ما لطف و ترحم فرما
ہائے اسلام پہ کفار مظالم توڑیں! ہم ضعیفوں پہ جلے دل کے پھپھولیں پھوڑیں
عورتوں تک کو نہ مردود شیاطیں چھوڑیں تہمتیں سینکڑوں الٹی وہ ہم پر جوڑیں

Toobaa-elibrary.blogspot.com

آہ! دنیا سے مسلمان اٹھے جاتے ہیں
تیغِ تثلیث سے مظلوم کٹے جاتے ہیں

خوب تہذیب کا یورپ کی تماشا دیکھا　　ارضِ مغرب میں فرنگیوں کی ہر آفت پایا
خم پہ خم بادۂ توحید کا توڑا پھوڑا　　خونِ مسلم سے وہاں کتنے بہائے ریا
اس پہ بھی جوشِ صلیبی نہ تھما ہے اب تک
شعلۂ جنگ "مراکو" نہ دبا ہے اب تک

لے کے افواج چڑھا روس ادھر فارس پر　　توپیں چلنے لگیں ہر بے کس و بے مونس پر
دھجیاں اڑ گئیں گولے وہ پڑے جس جس پر　　اور قیامت سی قیامت ہے دریغا اس پر
مجتہد تک کو سرِ دار چڑھایا اس نے
آتشِ بغض کو اسطرح بجھایا اس نے

نہ یہی بلکہ وہاں گنبدِ اقدس ڈھایا　　لوٹا غارت کیا جس چیز کو اس نے پایا
اس ستم نے فلکِ پیر کو بھی چکرایا　　گویا ایران پہ پھر چڑھ کے ہلاکو آیا
روضۂ پاک میں اور خون مسلمانوں کا
پھر بھی ٹھنڈا نہ کلیجہ ہوا شیطانوں کا

★

---

(۱) دار العلوم رسالہ میں اسی قدر اشعار مل سکے، کچھ اور ہوں گے، مگر وہ دستیاب نہ ہو سکے
(مرتب)

باب ۲

ذکرِ دیوبند

اجمیر شریف کی حاضری کے ان ایام میں اب بھی دماغ پر زور دیتا ہوں، یاد کرتا ہوں کہ دیوبند کے متعلق اسوقت میرے احساسات کی کیا نوعیت تھی، تو اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ دیوبند کو میں بھی جانتا تھا، اور یہ بھی جانتا تھا کہ دیوبند میں ایک بڑی مرکزی درسگاہ ہے، جس کے مدرسِ اوّل مولانا محمود حسن نامی کوئی بزرگ ہیں، مولانا حافظ محمد احمد، مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے صاحبزادے، اس مدرسہ کے مہتمم ہیں، یہ بھی خیال آتا ہے، کہ ادھر اُدھر سے کان میں حضرت الاستاد الامام مولانا السید انور شاہ الکشمیری کے غیر معمولی حافظہ، قوتِ یادداشت وغیرہ کی خبریں بھی آتی رہتی تھیں، ہلکا سا ذکر مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کا بھی گوش زد ہو چکا تھا، لیکن جہاں تک سوچتا ہوں، میری زندگی کا یہ عجیب واقعہ تھا کہ دار العلوم کی سربر آوردہ مثالی ہستیوں میں سے کسی بزرگ کے شفاہی لقاء سے اُس وقت تک محروم تھا بلکہ میرا حافظہ اگر غلطی نہیں کر رہا ہے، تو کہہ سکتا ہوں کہ صحیح معنوں میں دار العلوم کے فارغ التحصیل عالم کے دیکھنے کا بھی شاید شرف حاصل نہیں ہوا تھا، اور اس عجیب و غریب صورتِ حال کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ٹونک آنے سے پہلے، تیرہ چودہ سال کی عمر تک میری زندگی کلیۃً گیلانی جیسے ایک دور افتادہ گاؤں میں گزری تھی، جہاں سے

Toobaa-elibrary.blogspot.com

ریل کے کسی اسٹیشن تک پہونچنے کے لئے آج بھی پانچ چھ کوس کا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے، اب تو خیر ڈسٹرکٹ بورڈ کی ایک سڑک اس گاؤں سے گزرتی ہے جس پر لاریاں، پچھلے چند سالوں سے چلنے لگی ہیں، ورنہ جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں صرف ایک پگڈنڈی پر چل کر یہاں کے رہنے والے کسی سڑک تک پہنچنے میں کامیاب ہوتے تھے۔

اگرچہ میرا یہ گاؤں تعلیم یافتوں کا گاؤں سمجھا جاتا تھا، لیکن زیادہ تر انگریزی تعلیم ہی کی طرف لوگوں کا رجحان تھا، ایک بڑے عالم پنجاب کے، جن کا نام مولانا عبداللہ (مرحوم) تھا، انھوں نے اس گاؤں کو اپنا وطن بنا لیا تھا، وہ بڑے اچھے واعظ بھی تھے، بچپن میں ہر جمعہ میں ان کے ہفتہ واری خطبے سننے کا اتفاق ہوتا تھا، لیکن اتفاق سے وہ غیر مقلد تھے، ان کی صحبت میں علماء دیوبند کا ذکر، جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، نہیں آتا تھا۔ خود میرا گھر بھی، گو مولویوں کا گھر تھا، لیکن عرض کر چکا ہوں کہ میری خاندانی مولویت پر معقولیت کا رنگ غالب تھا۔ الغرض گاؤں میں جب تک رہا، دیوبند اور علمائے دیوبند سے آشنا ہونے کا موقع نہ مل سکا، اور اس گاؤں سے پڑھنے کے لئے، جب باہر نکلا، تو بہار، یوپی جیسے علمی صوبوں کے شہروں اور بڑے بڑے علمی مراکز سے ریل پر گزرتے ہوئے، راجپوتانے کی ایک ایسی دورافتادہ آبادی میں پہونچا دیا گیا جو ریلوے اسٹیشن سے، اس وقت تک تیس چالیس میل دور ہے، اب تو وہاں پہونچنے کے لئے لاری بھی مل جاتی ہے، لیکن فقیر نے راجپوتانے کے اس سنگستانی خطے میں، جس زمانے میں قدم رکھا تھا تو نوائی نامی اسٹیشن سے اونٹوں کی دو منزلہ عجیب و غریب شکل کی گاڑی پر آہستہ خرام بلکہ مخرام کی شتر خرامیوں کا تجربہ کرتے ہوئے صبح سے چل کر شام کو غالباً ٹونک پہونچنے کی مسرت حاصل کر سکا تھا محدود آبادی کے اس شہر میں، جو لوگ پڑے ہوئے تھے۔ بس ان ہی پر یہ

آبادی مشتمل تھی، نہ باہر ہی سے اس ویرانے تک پہونچنے کی آرزو کسی میں پیدا ہوتی تھی، اور نہ یہاں کے قناعت پسند باشندے باہر نکلنے کی زحمت برداشت کرنا چاہتے تھے (۱)

اگرچہ ریاست ٹونک ابتدائے قیام سے حضرت مولانا سید احمد بریلوی، اور مولانا شاہ اسمٰعیل الشہید الدہلوی رحمۃ اللہ علیہما کے مسلک کے زیر اثر تھی، اور یوں ابتداء ہی سے خانوادہ ولی اللّٰہی سے اس ریاست کے مسلمان باشندے وابستہ تھے، لیکن جیسا کہ معلوم ہے، آخر میں مولانا سید احمد بریلوی کی جماعت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی، ایک طبقہ، جو اپنے آپ کو حضرت ہی کے نام لیواؤں میں شمار کرتا تھا، اس پر عدم تقلید کا اثر غالب

---

(۱) ٹونک کی یہ ریاست، اس زمانے میں قائم ہوئی، جب انگریزوں کا تسلط ملک پر تقریباً مکمل ہو چکا تھا، سنبھل کے ایک منچلے پٹھان امیر خاں کو یہ ریاست مہاراجہ اندور سے بطور جاگیر ملی تھی، بڑے قصے قضیوں کے بعد، انگریزوں نے اس جاگیر کو ایک باضابطہ اسلامی اسٹیٹ تسلیم کر لیا تھا، بلکہ امیر خاں مرحوم کے ولی عہد وزیر الدولہ مرحوم کو پانسو روپئے کے حساب سے انگریز انعام کہئے، یا خراج بھی ادا کرتے رہے، پانچویں پشت میں مسلمانوں کی یہ ریاست راجستھان یونین میں راجپوتانے کی دوسری ریاستوں کی طرح ضم ہو گئی، حضرت بریلوی (سیّد احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ) سے ریاست ٹونک کے تعلقات کی تفصیل سیرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ مصنفہ مولانا سیّد ابوالحسن علی میں آپ پڑھ سکتے ہیں۔

Toobaa-elibrary.blogspot.com

تھا، اور اتفاق کی بات تھی کہ ٹونک پر اقتدار اسی طبقہ کے علماء کا قائم تھا، اگرچہ عام مسلمان عملاً حنفی مذہب ہی کے پابند تھے، لیکن بریلوی خاندان(۱) کے جو لوگ یہاں آباد تھے، عموماً ان پر غیر مقلدیت کا رنگ غالب تھا، خود جس تعلیم گاہ میں فقیر پڑھنے کے لئے داخل ہوا تھا عرض کر چکا ہوں کہ اس پر خیرآبادی منطقیت اور فلسفیت کا رنگ چڑھا ہوا تھا، مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اور مولانا فضل حق خیرآبادی میں علمی نوک جھونک کا سلسلہ زمانہ تک جو جاری رہا تھا، خیرآبادیوں اور خانوادۂ ولی اللّٰہی میں علمی رقابت کا پیدا ہو جانا، اس کا ایک قدرتی نتیجہ تھا

الغرض ٹونک پہونچنے کے بعد بھی ایسے ماحول میں رہا جس میں خانوادۂ ولی اللّٰہی کے حقیقی نمائندوں یعنی علمائے دیوبند سے مانوس اور روشناس ہونے کا موقع نہ مل سکا، حالانکہ مطالعہ کا ذوق، میرا فطری تھا، ہر طرح کی رطب و یابس، بری بھلی کتابوں کے پڑھنے کا بچپن سے عادی تھا لیکن اب اس کو کیا کہوں کہ دیوبندی سلسلہ کی کسی کتاب، بلکہ اس طبقہ کے علماء کے کسی مضمون یا مقالہ کے پڑھنے کی بھی نوبت شاید اس وقت تک نہ آئی تھی، حد یہ ہے کہ حکیم الامّت قدس اللّٰہ سرہٗ، جن کی کافی کتابیں اس وقت تک ملک میں شائع ہو کر مقبول ہو چکی تھیں، ان کے مطالعہ سے بھی محروم تھا ذریعہ کو تو متعین کرنا دشوار ہے، لیکن خیال یہی دل میں ڈال دیا گیا تھا۔ کہ یہ بے چارے مولوی ملّا لوگ، کیا لکھیں گے، آریوں کے رد میں میرے استاذ مولانا برکات احمد صاحب مرحوم نے بھی ایک رسالہ اردو زبان میں لکھا تھا معمولی رد و بدل کے ساتھ وہی رسالہ مولانا کے

(۱) مراد رائے بریلی کا خاندان ہے (اعجاز)

مرحوم جوانا مرگ صاحبزادے حکیم محمد احمد صاحب غفر اللّٰہ لہٗ کے نام سے، جب شائع ہو رہا تھا، تو ان کے اصرار سے ایک مقدمہ فقیر نے بھی اس رسالہ کا لکھا تھا، جو اسی رسالہ کے ساتھ شائع ہوا ہے، اس مقدمہ میں، بعض تعریضی فقرے علمائے دیوبند کے علمی خدمات کے متعلق، اس خاکسار کے قلم سے نکلے ہوئے موجود ہیں، جب کبھی ان پر نظر پڑتی ہے، تو شرم سے گردن جھک جاتی ہے، اور دیر تک سوچتا رہتا ہوں کہ انسان کتنا جہول اور کیسا سخت ظلوم ہے، بے پڑھے اور بے جانے رجماً بالغیب صرف سنے سنائے قصوں کی بنیاد پر کتنی غلط رائے قائم کر لیتا ہے، اور طرّہ یہ کہ ایسی جاہلانہ تاثّرات کا اظہار، کتنے عالمانہ ادعائی لہجوں میں کرنے پر جری ہو جاتا ہے انکی شرمناک اور عبرت آموز مثال خاکسار کے یہ فقرے ہیں۔

علمائے دیوبند اور ان کے عارفانہ تحقیقاتی فیصلوں سے قطعاً ناواقف تھا، لیکن ان پر رائے زنی کرتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیوبندی ادبیات کا سارا ذخیرہ میری نظروں سے گزرا ہوا ہے، اور اپنی ان ہی دیکھی بھالی کتابوں کے عدم افادیت سے دوسروں کو مطلع کر رہا ہوں، اگرچہ خدا کا شکر ہے کہ اپنے اس مضمون میں صراحۃً دیوبند یا علمائے دیوبند کا نام میرے سیاہ قلم پر نہیں آیا ہے، اشارے اور کنائے میں گفتگو کی گئی ہے، اس لئے بظاہر اس کا پتہ نہیں چل سکتا کہ ان تعریضی کلمات کا نشانہ کون ہے لیکن آج جب ذکر ہی اس قصّے کا چھڑ گیا تو حقیقت کا اظہار عبرۃً للناظرین کر رہا ہوں، خدا ہی جانتا ہے کہ خاکسار کی طرح عدم علم کو علم قرار دینے کے اس مغالطے میں مبتلا ہو کر حق و صداقت کے ان الٰہی ترجمانوں کے کلام سے محروم رہ جانے کی بدبختیوں کے کتنے شکار ہوئے، اور اسوقت تک ان ہی بے جا بدگمانیوں کے پنجوں میں کتنے پھڑپھڑا رہے ہیں۔

Toobaa-elibrary.blogspot.com

مختصر المعانی کا حاشیہ شیخ الہند

ہاں ایک بات یاد آئی کہ جب مختصر المعانی ہماری شروع ہوئی، تو مطبع مجتبائی کی فہرست میں مختصر المعانی کے ایک ایسے نسخہ کے نام پر نظر پڑی جس کے متعلق لکھا ہوا تھا کہ دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین مولانا محمود حسن کا اس پر حاشیہ درج ہے، مولانا کا نام دیکھ کر اپنے پڑھنے کے لئے خاکسار نے مختصر المعانی کے اسی نسخہ کو منگوایا، خیال تھا کہ اس پر مولانا نے اپنے ذاتی حواشی درج کئے ہوں گے، لیکن مطالعہ سے معلوم ہوا کہ مختصر المعانی کی مشہور شرح، علامہ دسوقی کی مصر سے جو شائع ہوئی ہے، زیادہ تر اسی سے عبارتوں کا اقتباس کر کر کے کتاب پر مولانا نے چڑھا دیا ہے، اور خود اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا ہے۔ یا لکھا ہے تو بہت کم لکھا ہے، جس کا ہونا، گویا نہ ہونے کے برابر تھا، میری بے بصیرتی ملاحظہ فرمائیے کہ ان کا یہ کام میری نظروں میں کچھ زیادہ نہ جچا، خیال آیا کہ اس کے لئے اتنے بڑے عالم کو زحمت گوارا کرنے کی کیا ضرورت تھی جس کا جی چاہے، دسوقی کی شرح سے ان حواشی کو نقل کر کے کتاب پر چڑھا سکتا تھا، مگر یہ اپنے ایّام جاہلیت کا احساس تھا بعد کو جب دسوقی کے ساتھ ملا ملا کر ان حواشی کے مطالعہ کا موقع ملا، تب مولانا کی غیر معمولی انتخابی قوت کا اندازہ ہوا، گویا اس ضخیم و لحیم و شحیم شرح کی رُوح نکال کر مولانا نے رکھدی تھی، ہزار ہا ہزار صفحات کے پڑھنے سے بھی جو نتائج حاصل نہیں ہو سکتے، وہ ان چند سطروں میں مل جاتے تھے، اور اس وقت معلوم ہوا کہ کمال صرف یہی نہیں ہے کہ اپنی طرف سے کوئی نئی بات پیش کی جائے بلکہ دوسروں کے کلام سے چھلکوں کو اتار کر صرف مغز بر آمد کر لینا۔ اور جہاں ضرورت ہو، ٹھیک اسی جگہ پر موقع موقع کے ساتھ اس کو درج کر کے مشکلات کو حل کرتے چلے جانا۔ بجائے خود ایک ایسا کمال ہے کہ اپنی

طرف سے کچھ لکھ دینا، تجربہ بتاتا ہے کہ اس سے کہیں زیادہ آسان ہے اور اس نقطۂ نظر سے کوئی شبہ نہیں کہ مختصر المعانی پر مولانا مرحوم کا یہ حاشیہ ایک ایسا حاشیہ ہے، جس نے طلباء ہی کو نہیں، بلکہ مدرسین کو بھی اس کتاب کی تمام شرحوں سے مستغنی کر دیا ہے، فجزاہ اللہ عن العلم والعلماء خیر الجزاء

دارالعلوم کا ابتدائی تعارف

بہرحال میں قصہ اپنا سنا رہا تھا کہ اجمیر شریف کی شاہجہانی مسجد میں اپنی تقریر کے ساتھ مندرجہ بالا نظم فقیر نے جس زمانہ میں حضرت خواجہ کے "قبہ بیضا" کے سامنے تقریباً بیس پچیس ہزار کے مجمع میں سنائی تھی، اس وقت تک دارالعلوم دیوبند، اور سلسلۂ دیوبند کے اہل علم و فضل کے متعلق خاکسار کے احساسات و تاثرات کا یہی رنگ تھا، لیکن آستانہ سلطان الہند الچشتی نور اللہ ضریحہ تک تو غزالی کی احیاء العلوم مجھے گھسیٹ کر لائی تھی، یہاں کیوں آیا تھا؟ کس ارادہ سے حاضر ہوا تھا، اب ان بھولے بسرے قصّوں کے ذکر سے کیا فائدہ؟ ؎ جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

اب تو ان عزائم اور ارادوں کے تصوّر سے بھی معذور ہوں، جن سے آہ! کہ کبھی اجڑا دل بھی آباد تھا، اُف! جن آتشیں جذبات سے اس زمانہ میں سینے میں ہل چل مچی ہوئی تھی، کچھ ان کا اندازہ میری نظم کے بعض اشعار سے ہو سکتا ہے، شعر و شاعری سے پیشہ ورانہ تعلق تو کسی زمانہ میں بحمد اللہ قائم نہ ہوا، لیکن ظاہر ہے کہ جس سلیقہ کو عمر کی پختگی کے زمانہ میں پاتا ہوں، یقیناً اس سے نوعمری کے ان ایّام میں محروم تھا، لیکن یہ کہہ سکتا ہوں کہ آج بھی چاہوں تو اس نظم کے بعض مصرعے جن سے جوش و خروش گویا کہ پھٹا پڑتا ہے، خود مجھ ہی سے نہیں بن پڑ سکتے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسی بجھی بجھائی رو کھی پھیکی، افسردہ و پژمردہ طبیعت میں یہ آگ کہاں سے بھر گئی تھی، جہاں

Toobaa-elibrary.blogspot.com

آج راکھ کے سوا کچھ نہیں ہے، اسی میں یہ دہکتے ہوئے انگارے کہاں سے چمک اٹھے تھے، خیر اس دلِ مرحوم کا تو جنازہ نکل چکا ہے، بس بقول حالی ؎

جب دلِ زندہ تو نے مجھے چھوڑا — میں نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

عرض کرنے کی بات صرف یہ ہے کہ اجمیر شریف میں خاکسار کا قیام مولانا معین الدین اجمیری مرحوم کے دولت خانہ پر تھا، مولانا مرحوم ہمارے استاذ مولانا سید برکات احمد کے ارشد تلامذہ میں تھے، اسی تعلق سے خاکسار کو مولانا نے اپنا مہمان بنایا تھا، اور یوں بھی وہ اسلامی اخلاق کے ایک غیر معمولی نمونہ تھے، میں نے ان سے پڑھا تو نہیں تھا، لیکن ان کی عنایت و نوازش سے ہمیشہ مستفید ہوتا رہا۔ ان سے زیادہ بے تکلف نہ تھا، مگر ان کے چھوٹے بھائی، جو آب غازی محی الدین کے نام سے "خلافت"(۱) کی دنیا میں مشہور ہیں اور اس زمانے میں "پیارے میاں" کے نام سے پکارے جاتے تھے، ان کو میرے دل کی بے چینیوں کے بھانپ لینے کا موقع ملا، انھوں نے میرے حالِ زار کا تذکرہ بڑے بھائی سے کیا، مولانا، خدا انھیں جنت نصیب کرے مجھ پر بہت زیادہ مہربان ہو گئے، اور اسی سلسلہ میں دیر تک وہ گفتگو فرماتے رہے۔ اثناء گفتگو میں پہلی دفعہ انھیں سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ نرے مولوی اور مدرس ہی نہیں ہیں، بلکہ ایک خدا رسیدہ عارف ہونے کے ساتھ ساتھ، ان میں وہ تڑپ بھی پائی جاتی ہے، جس نے آج کل مجھے بے چین کر رکھا ہے، شعوری سمجھئے، یا غیر شعوری، لیکن یہ پہلا موقع تھا، جب، یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ حسن عقیدت کا تخم حضرت شیخ الہند کے متعلق میرے دل میں ڈالا گیا، مگر سوء عقیدت کا ازالہ، مولانا معین الدین صاحب

---

(۱) ہندوستان کی مشہور تحریک خلافت کی طرف اشارہ ہے (امی زاہد)

کی تقریروں ہی سے ہوا، رحمہ اللہ وغفر لہ، حالانکہ مولانا معین الدین، تعلیمی حیثیت سے از سرتا پا خیر آبادی ہی خیر آبادی تھے، لیکن زمانے کے مولویوں نے معمولی معمولی ناقابل لحاظ اختلافی نقاط نظر کے کاہ کو کوہ بنا بنا کر اپنی الگ الگ علمی دنیا جو بسا رکھی تھی، اور مولویوں کا ہر طبقہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی اپنی مسجدوں کی حد تک اپنی آمد و رفت کو محدود رکھنے پر مصر تھا ان خود ساختہ تنگ خیالیوں سے وہ بلند اور بہت زیادہ بلند ہو چکے تھے، خصوصاً حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ کے ساتھ ان کی گرویدگی کا جو رنگ تھا، مشکل ہی سے کہا جا سکتا ہے کہ براہ راست کسی تلمیذ و مرید کے رنگ سے وہ پھیکا تھا، مولانا معین الدین نے سمجھا بجھا کر مجھے پھر ٹونک لوٹا دیا، لوٹنے کی حد تک تو لوٹ گیا، مگر اجمیر شریف ہی کے قیام کے ایام میں مبہم مبہم سا ایک فیصلہ دل میں، جلوہ گر ہونے لگا۔ اب خیال کرتا ہوں تو شاید وہ یہ تھا کہ اپنی تعلیم کو مکمل کرنے کے لئے بجائے ٹونک کے مجھے کہیں اور چلنا چاہیئے، اور کہاں چلنا چاہیئے؟ ازل میں تو وہ مقدر ہو ہی چکا تھا، لیکن ناسوتی عالم میں یہ تقدیری فیصلہ واضح شکلوں میں اسوقت تک سامنے نہیں آیا تھا، اتفاق پر اتفاق دیکھئے، اجمیر سے ٹونک واپس ہوا، شاید چند ہفتے بھی نہ گزرے ہوں گے کہ کالرا اور ہیضہ کی وبا شہر میں پھوٹ پڑی، وبائی شدت کا اندازہ اسی سے کیجئے، کہ اس مختصر سی آبادی میں مرنے والوں کی تعداد اسّی اسّی پچاسی پچاسی تک کسی دن پہونچ جاتی تھی، دوسروں کے ساتھ خاکسار بھی اس وبائی مرض میں مبتلا ہوا۔ حملہ اتنا سخت تھا کہ شفایاب ہونے کے بعد بھی دس پندرہ دن تک مجھے کچھ سجھائی نہ دیتا تھا، بینائی گویا مفقود ہو چکی تھی، تین دن تک تو ہوش بھی نہ تھا کہ کہاں ہوں، اور کس حال میں ہوں، غریب الوطنی میں ہمارے رفقاء درس نے غیر معمولی ہمدردیوں سے خاکسار کی تیمار داری میں کام لیا، دس بارہ طالب العلم نوبت بنوبت میرے ارد گرد شب و روز جاگتے رہتے تھے، اور

Toobaa-elibrary.blogspot.com

تیمارداری کے فرائض انجام دیتے تھے۔ چند مہینے پہلے بجائے ایک معمولی طالب العلم کے چونکہ واعظ شہر بھی بن چکا تھا، اس لئے سارا شہر میرے بیمار پڑجانے کی خبر سے متأثر تھا، شہر کے ایک معمر بزرگ جنھیں حضرت سیّد صاحب بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی رفاقت کا شرف نوعمری کے زمانہ میں حاصل ہوا تھا، عیادت کے لئے تشریف لائے، اور نیم بیہوشی کی حالت میں ان کی زبان سے میں نے کچھ سنا، کیا سنا، جسے بھی سناؤں گا سننے کے لئے آمادہ نہیں ہوسکتا، بس میں نے سن لیا، اور جو سنا گیا تھا اسے دیکھ بھی لیا، گویا

غ باہم نگرستیم، گرستیم و گزشتیم

دیوبند جانے کا فیصلہ

خلاصہ یہ ہے کہ ہیضہ کا مریض کہ، جس کی نبض پر ہاتھ رکھنے کے ساتھ ہی طبیب[1] آب دیدہ ہو کر سرہانے سے اٹھ چکا تھا، وہی زندہ کیا گیا، جو آنکھیں نابینا ہو چکی تھیں، ان میں رفتہ رفتہ روشنی واپس آئی، اور وہی خیال یا فیصلہ، جو آستانہ سلطان الہند رحؒ پر قلب میں ڈالا گیا تھا، یقینی قالب اختیار کرنے لگا، صحت یاب ہونے کے چند ہی روز بعد، خاکسار، بہار اپنے وطن آیا، اور اپنے بزرگوں کو دل کے اس فیصلہ سے مطلع کیا، فیصلہ یہی تھا کہ دارالعلوم دیوبند پہونچ کر حضرت مولانا محمود حسن سے حدیث پڑھنا چاہتا ہوں۔ ردو قدح کا سلسلہ جاری تھا کہ بعض مبشرات اور رویائے

---

(۱) یہ خود ہمارے استاد مولانا حکیم برکات احمد رحؒ تھے، رات کا وقت تھا، تین ساڑھے تین بجے ہوں گے، مریض کی حالت غیر کو محسوس کر کے لوگوں نے حکیم صاحب مرحوم کو اطلاع دی، تشریف لا کر نبض پر ہاتھ رکھا، میں نے تو نہیں دیکھا تھا، لوگوں نے سنایا کہ آب دیدہ ہو کر فرمانے لگے، دیکھئے صبح تک کیا صورت پیش آتی ہے، ان تیمارداروں میں سب سے زیادہ مولانا عبدالحفیظ صاحب کابلی کی خدمات سے متأثر تھا، اب بھی ان کا خیال آجاتا ہے، تو آب دیدہ ہو جاتا ہوں، افسوس کہ طالبعلمی کے ان دنوں کے بعد پھر ان سے ملاقات نہ ہوسکی، جہاں کہیں ہوں ان کو سلام کرتا ہوں۔

صالحہ نے میرے تعلیمی سرپرست عم مغفور و مرحوم مولوی حکیم سید ابوالنصر کے قلب کو بھی اس فیصلہ کے ساتھ راضی کر دیا، اور طے ہو گیا کہ رمضان کے بعد بجائے ٹونک کے خاکسار دارالعلوم دیوبند ہی کا احرام باندھے گا لیکن سوال تعارف کا سامنے آیا، کہہ چکا ہوں کہ اس وقت تک، دیوبند اور علمائے دیوبند کے چھوٹوں اور بڑوں سے کسی قسم کا تعلق پیدا نہیں ہوا تھا، پھر خود ہی خیال آیا کہ دوسروں کا توسل کیوں ڈھونڈ ڈھول، گیلانی سے ایک خط حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحؒ کی خدمت میں ارسال کرتے ہوئے، مدرسہ میں داخلہ کی آرزو براہ راست پیش کر دی، جو کچھ لکھا پڑھا تھا، اس کی تفصیل درج کرتے ہوئے دورہ کی جماعت میں شریک ہونے کی آرزو اس عریضہ میں ظاہر کی گئی تھی، دورے میں شریک ہونے کے استحقاق کو ظاہر کرتے ہوئے میں نے یہ بھی کیا کہ الجواھر الغالیۃ فی الحکمۃ المتعالیۃ، کے چند ابتدائی فصول کو، اردو میں ترجمہ کر کے عریضہ کے ساتھ شریک کر دیا، مباحث امور عامہ اور الہیاتی مسائل کے متعلق مولانا عبدالحق خیرآبادی کی یہ کتاب شاہکار ہونے کی حیثیت رکھتی ہے، مضامین کافی دقیق اور پیچیدہ ہیں، مقصد یہ تھا کہ درخواست گزار کی علمی استعداد کا پختہ اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے، اور یہ کہ دورے میں شریک ہونے کا وہ مستحق ہے، یا نہیں اس فیصلہ میں بھی ترجمہ کے اس نمونہ سے ایک گونہ مدد ملے گی

میرا یہ عریضہ دیوبند پہونچا، اور میری حیرت کی انتہا نہ تھی کہ خلاف توقع گویا واپسی ڈاک سے یہ جواب ملا کہ فوراً دیوبند پہونچ جاؤ، ہر چیز کا نظم کر دیا جائے گا، یہ ایک پوسٹ کارڈ تھا، جس پر دستخط حافظ محمد احمد صاحب ہی کے تھے، یہی سمجھنا بھی چاہیئے تھا اور یہی سمجھا بھی کہ حافظ محمد احمد صاحب قبلہ ہی کی توجہ فرمائی کا نتیجہ ہے اسوقت میں قطعاً اس سراپا اخلاص، مجسمہ الست بلی حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی شخصیت سے کسی قسم کی واقفیت نہیں رکھتا تھا، ممکن ہے کہ نام سنا ہو لیکن دارالعلوم دیوبند کے تنظیمی کاروبار سے ان کا کیا تعلق ہے اس سے قطعاً آگاہ نہ تھا۔

Toobaa-elibrary.blogspot.com

باب ۳

دیوبند تک رسائی

رمضان کے بعد حسب طلبی، خاکسار گھر سے تن تنہا روانہ ہوا۔ کچھ نہیں جانتا تھا کہ جس ماحول میں شریک ہونے جا رہا ہوں، وہاں کی خصوصیات کیا ہیں؟ اس ماحول سے مناسبت پیدا ہوگی یا نہیں؟ تنہا ہی گھر سے نکلا، اور دیوبند کے اسٹیشن پر ٹھیک اسوقت جب اپنی عمر کے بیسویں سال میں خاکسار نے قدم رکھا تھا تنہا ہی اترا، مدرسہ میں واقفیت، اور وہ بھی صرف رسمی واقفیت ایک طالب العلم سے تھی ان کا نام منظر حسن تھا جو اب بوڑھے ہو کر، بہار ہی کے ایک گاؤں میں مولانا حکیم منظر حسن کے نام سے مشہور ہیں، اور اس علاقے کے پرانے گھاگ سال خوردہ حاذق اطباء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ وہ بہار ہی کے رہنے والے تھے، اور عزیز داری کا رشتہ بھی ان سے تھا، ایک خط ان کے بڑے بھائی کا انکے نام لے لیا تھا، اسٹیشن سے تانگے پر بیٹھ کر قصبہ کی سڑکوں، اور گلی کوچوں سے گزرتے ہوئے اچانک ایک شاہی دروازے کے سامنے تانگے کو دیکھا کر ٹھہر گیا، یہی

دارالعلوم دیوبند

ہے، تانگے والے نے کہا، ساز و سامان ایک غریب طالب العلم کا تھا ہی کیا، بستر او ستر، شاید کوئی ٹوٹا پھوٹا ٹرنک، انھیں کے ساتھ دروازے کو عبور کر کے پہلے دروازے کے پہلے صحن میں، میں آکر کھڑا ہو گیا، سامنے دوسرا دروازہ تھا پیشانی پر جس کی انتہائی سادگی کے ساتھ

مدرسہ اسلامی دیوبند

لکھا ہوا تھا، اس کو پڑھتا رہا، یہی دیوبند کا مدرسہ ہے؟ سوچتا رہا، کچھ طلبہ انتہائی لاپرواہیوں کے ساتھ آجا رہے تھے کسی غریب الوطن مسافر کو وہ کیا پوچھتے کہ صبح و شام وہاں آنے جانیوالوں کا تانتا ہی بندھا ہوا تھا۔ اب یاد نہیں رہا کہ وہ کون صاحب تھے، جن سے بڑھ کر دریافت کیا کہ "منظر حسن بہاری" طالب علم سے کیا آپ واقف ہیں، وہ واقف تھے، یہی واقفیت ذریعہ بنی، اور میں ان کے کمرے تک پہونچ گیا، مدرسہ کی مسجد کے جنوبی پہلو میں، جو چند حجرے مہمان خانہ کی چھت کے نیچے ہیں۔ انھیں میں سے ایک حجرے میں چند دوسرے بہاری طلبہ کے ساتھ مولوی منظر حسن کا قیام تھا، یہ مغربی سمت کا آخری کمرہ ہے جس کے اندر ایک حجرہ چھوٹا سا اور بھی ہے، مدّت تک اسی چھوٹے حجرے میں خاکسار مقیم رہا، اس زمانے میں نام اس کا "حجرۂ قبریہ" رکھ دیا تھا حجرے میں چٹائیوں کا فرش تھا۔ اسی پر بیٹھا دیا گیا۔ حکیم صاحب سے فقیر نے تقاضا شروع کیا کہ حضرت حافظ صاحب کی خدمت میں مجھے لے چلئے، آگے آگے وہ جا رہے تھے، اور کتب خانے کی طرف سیڑھیوں کا جو راستہ دارالمشورہ کی طرف جاتا ہے، ان ہی سیڑھیوں سے گذرتے ہوئے، دارالمشورہ کے کمرے میں پہونچ گیا، ایک نحیف و لاغر کچھ خمیدہ پشت بزرگ پر نظر پڑی جن کی ڈاڑھی کے کچھ بال سفید ہو چکے تھے، اور زیادہ ابھی سیاہ ہی تھے دیکھا کہ پلنگ کے پاس فرش پر بیٹھے ہوئے عینک لگا کر کاغذات کے مطالعہ میں

Toobaa-elibrary.blogspot.com

مصروف، حکیم منظر حسن صاحب نے ان ہی بزرگ کی خدمت میں پہونچاتے ہوئے کہا کہ یہی مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ہیں، اور ان سے کہا کہ بہار سے یہ آئے ہیں مناظر احسن ان کا نام ہے

اس تعارف کے بعد خاکسار نے ان کو سلام تو کیا، لیکن فوراً حکیم منظر حسن صاحب کی طرف مخاطب ہو کر بولا کہ آپ مجھے حافظ محمد احمد صاحب کے پاس لے چلیے، بے ساختہ میری زبان سے یہ الفاظ نکل رہے تھے، اور میں نے دیکھا کہ وہی نیم خام، اور نیم پختہ، جو بزرگ کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھل رہی ہے، اور عینک کے شیشوں سے نظر کچھ اونچی کر کے خاص ادا سے مجھے دیکھ رہے ہیں، اور خطاب کر کے خاکسار سے فرما رہے ہیں، آپ بہار کے ہیں؟ آپ کا خط آیا تھا، جواب آپ کے خط کا میں نے ہی دیا تھا، جواہر غالیہ کے ترجمہ کا جو نمونہ آپ نے بھیجا تھا، میں نے اسے بھی دیکھ لیا ہے، میں حیران تھا کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے میں تو اب تک سمجھے ہوئے تھا کہ مجھے حافظ محمد احمد صاحب نے طلب کیا ہے، یہ مولوی حبیب الرحمٰن کون آدمی ہیں؟ لیکن جو باتیں وہ فرما رہے ہیں، ان کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ حافظ صاحب مرحوم کا خیال دل سے نکال دوں حکیم منظر حسن، جو اس وقت بھی باوجود طالب العلم ہونے کے کچھ علاج و معالجہ کا کام مدرسہ میں کرتے تھے، اور حکیم کا لفظ ان کے نام کا جز اسی زمانہ میں بن چکا تھا، مولٰنا حبیب الرحمٰن کے خاص نیاز مندوں اور مخصوص خدام میں شمار ہوتے تھے، ان کی طرف خطاب کر کے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ مولوی صاحب نئے آدمی ہیں، ان کو آپ لے جائیے، اپنے حجرے میں رکھیے، داخلہ وغیرہ کا نظم کر دیا جائے گا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ میری دینی و دنیوی راہوں کی ہمواری، جس کی کریمانہ نوازشوں اور پدرانہ شفقتوں کے ساتھ ازل ہی سے مقدر ہو چکی تھی، اسکی قدم بوسی

کی سعادت کی ابتدا اس صورت میں پیش آئے گی، اس وقت کی مجلس اسی قصے پر ختم ہو گئی، میں حکیم صاحب کے ساتھ مسجد کے محاذی اسی حجرے در حجرے یا "حجرہ قبریہ" کیں واپس آکر داخل ہو گیا، راستہ میں حکیم منظر حسن نے مجھ پر یہ راز واضح کیا کہ مدرسہ کے سارے اندرونی انتظامات اسی نحیف و نزار، سراپا اخلاص، مطلق راست بازی کی چشم و ابرو کے اشاروں کے ساتھ وابستہ ہیں۔ حافظ محمد احمد صاحب مدرسہ کے گل سر سبد ہیں۔ باہر کی دنیا ان ہی کے اسم گرامی سے مدرسہ کو پہچانتی ہے۔

اللہ اللہ کیا ٹھکانہ ہے، اس سچائی اور بے ریا زندگی کا کر سارے کام جو انجام دے رہا تھا، مجھ جیسا آدمی، جو بہر حال عربی تعلیم کے دائرے ہی کا آدمی تھا، اس ملاقات سے پہلے، اس کے نام سے بھی شاید ناواقف تھا، ستر و اخفاء کی یہ ایک اتنی غیر معمولی مثال تھی کہ دل دیر تک اسکو سوچتا رہا میں دار العلوم کے احاطے میں ایک ایسی دنیا سے چل کر داخل ہوا تھا، جہاں کام سے پہلے نام ہی کے اچھالنے کا ذوق غالب تھا، میرے لئے یہ قطعاً غیر متوقع حادثہ تھا، کہ کام اور کام کے سوا، جو اور کچھ نہیں کرتا تھا۔ وہی اپنے نام کو چھپانے میں اتنا کامیاب کیسے ہوا۔ کہ چند منٹ پہلے میں اس نام سے قطعاً ناآشنا تھا، اسی ادھیڑ بن میں حجرے تک پہونچ گیا، پھر داخلہ کی رسمی کارروائیوں کا سلسلہ شروع بھی ہوا۔ اور شاید ایک ہفتہ کے اندر ہی اندر سارے مراحل طے ہو گئے، یوں بہار کے گاؤں کا ایک دہقانی دار العلوم دیوبند کے طلبہ کی جماعت میں باضابطہ شریک ہو گیا، یہ پہلا ہفتہ دار العلوم دیوبند کے احاطے میں میں اپنی بیست سالہ زندگی کا ایک غیر معمولی انقلابی ہفتہ تھا۔

تقدیری مواعید اور فیصلے تفصیل کے رنگ میں تو اپنے اپنے وقت میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتے ہی رہے۔ لیکن اسی ہفتے میں سکینت و طمانیت کی

Toobaa-elibrary.blogspot.com

جن جھنکیوں کے اجمالی اثر کو اپنے اندر پانے لگا، شاید اس کی اچھی تعبیر علی حزیں کا وہ مقطع ہوسکتا ہے جو آج بھی اس کی لوحِ تربت پر لکھا ہوا ہے ؎

زباں دانِ محبت بودہ ام، دیگر نمی دانم
ہمیں دانم کہ گوشش از دوست پیغامے شنید اینجا

اور یہ کہ

حزیں از پائے رہ پیما بسے سرگشتگی دیدم
سرِ شوریدہ بر بالینِ آسائش رسید اینجا (۱)

انقلابی ہفتہ

صحیح طور پر یاد نہیں رہا کہ رمضان گزارنے کے بعد شوال کی کس تاریخ کو میں دیوبند پہونچا تھا۔ بہرحال پہونچ گیا تھا، اتنا سویرے کہ ابھی نہ نئے طلبہ کے داخلے کی کارروائی مکمل ہوئی تھی، اور نہ اسباق ہی شروع ہوئے تھے، کتب خانہ کھل چکا تھا، پرانے طلبہ کتابیں لے رہے تھے، دارالعلوم کا مطبخ گرم ہوچکا تھا! الغرض دارالعلوم کے گوشہ گوشہ میں زندگی کی ہلچل اور سرگرمیوں کا یہ نظارہ میرے لئے ایک نیا نظارہ تھا۔ عرض کرچکا ہوں کہ میری زندگی کا ابتدائی زمانہ ایک گاؤں میں گزرا تھا، اور وہاں سے نکلا بھی تو راجپوتانہ جیسے دور دست علاقہ کی ایک قصباتی آبادی ٹونک میں بند ہوگیا تھا جو گاؤں تو نہ تھا لیکن شہری ہنگاموں سے تقریباً خالی تھا۔ اب اچانک دارالعلوم کے احاطہ میں پہونچ کر ہزار بارہ سو طلبہ کے مجمع میں شریک ہوجانا، اور طلبہ بھی

---

(۱) پہلے شعر کا ترجمہ میں صرف محبت کی زبان سمجھتا ہوں، اس کے علاوہ کچھ نہیں جانتا۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ دوست کا پیغام کانوں نے یہیں سنا تھا۔

دوسرا شعر:۔ اے حزیں! میں نے اپنے پاؤں کے چلتے بہت سرگشتگی پائی۔ راحت و آرام کی تکیہ گاہ میرے سرِ شوریدہ نے یہاں آکر پائی۔

کسی ایک صوبہ، بلکہ ایک ملک کے بھی نہیں، ان میں جہاں یوپی، بہار کے طلبہ تھے، جن سے فقیر مانوس تھا یا مانوس ہوسکتا تھا، وہیں بڑی تعداد بنگال اور پنجاب و سرحد کے طلبہ کی بھی تھی، ان ہی میں اچھی خاصی تعداد کابل، بخارا، سمرقند، کاشغر، توقند، وسط ایشیا کے باشندوں کی بھی تھی، اور کبھی کبھی اس جھمیلے میں عرب اور حبش عراق سے آئے ہوئے طالب العلموں پر بھی نظر پڑجاتی تھی، یہی نہیں بلکہ پہلی دفعہ دارالعلوم کی مسجد کی اذان کان میں آئی تو موذن کی آواز کی غیر معمولی بلندی اور کرختگی کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا کہ یہ اذان کس نے دی؟ معلوم ہوا کہ یہ مشرقی یورپ قازان (روس) کے رہنے والے مولوی محمد جان ہیں، اور نماز بھی جن امام صاحب نے پڑھائی، پتہ چلا کہ یہ صاحب مولوی حرمت اللہ اسی قازان کے باشندے ہیں، دیر تک سوچتا رہا کہ یورپ ہم پر چھا گیا، اور چھاتا ہی چلا جا رہا ہے کہ دیوبند کی مسجد کی اذان اور امامت پر بھی یورپ والوں ہی کا قبضہ ہے، ان میں مولوی محمد جان بڑے دیو ہیکل، ڈیل ڈول کے آدمی تھے، سینہ غیر معمولی طور پر چوڑا تھا شاید ایک ہندوستانی کے سینے میں جتنی ہوا سماتی ہو، مبالغہ نہ ہوگا کہ مولوی محمد جان کے سینے میں پچاس گنی زیادہ ہوا بھری ہوگی، ان کی اذان کی بلندی کی توجیہ بھی سمجھ میں آئی کہ اس شخص کے پھیپھڑے میں ہوا کا غیر معمولی ذخیرہ بھرا رہتا تھا، اسی کو اذان دیتے وقت خرچ کرتا ہے۔ غریب ہندوستانی کہاں سے یہ آواز پاسکتا ہے۔

الغرض میرے دل و دماغ کے لئے کالے پیلے، سرخ و سپید رنگ رنگ کے طلبہ کی یہ بھیڑ ہی حیرت انگیز تھی، دیر تک کسی مرکزی مقام پر کھڑے ہو کر میں ان طالب العلموں کو آتے جاتے، دوڑتے بھاگتے دیکھتا رہتا اور دل میں کہتا کہ بار الٰہا! میں کہاں آگیا ہوں، زیادہ سے زیادہ اب تک دس بیس

Toobaa-elibrary.blogspot.com

تیس طالب العلموں کے حلقوں میں رہنے سہنے پڑھنے لکھنے کا موقع تھا، ان میں اپنی حیثیت کے مطابق امتیاز کی صورت بھی نکل آتی تھی، لیکن اس طوفان میں محسوس ہوتا تھا کہ میں ڈوب جاؤں گا، پتہ بھی نہ چلے گا کہ کون ہوں؟ کہاں ہوں؟

دارالعلوم کا مطبخ

پہلی دفعہ میں نے دیکھا تھا کہ بغیر کسی معاوضہ کے دس بیس نہیں تقریباً ایک ہزار طالب العلموں کو دارالعلوم کے مطبخ سے دونوں وقت کھانا تقسیم ہو رہا ہے، معلوم ہوا کہ جو دارالعلوم کے مطبخ سے مفت کھانا لینا نہیں چاہتے، وہ غالباً جیسا کہ یاد پڑتا ہے کہ ڈھائی روپیہ ماہوار میں دونوں وقت کا کھانا خرید سکتے ہیں، جس میں ان کو دو تنوری روٹیوں کے ساتھ ایک وقت گوشت اور ایک وقت دال ملتی ہے، چونکہ اس وقت تک اسباق شروع نہیں ہوئے تھے، اس لئے طالب العلموں کے اس طوفانی وجود میں تقسیم طعام کے دونوں وقتوں میں جنبش ہوتی تھی

دارالعلوم کی مسجد اور نماز

اور پھر یہ ہلچل پانچوں وقت کی نمازوں میں مسجد کی طرف میرے لئے حیرت انگیز، اعجوبہ طراز نظارے تھے، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں اچانک کسی تاریکی سے روشنی میں آگیا ہوں، اور آنکھیں مل رہا ہوں، کچھ چیز دل پر نگاہ جمتی تھی، اور بہت سی چیزوں سے نظر مانوس نہیں ہوتی تھی، میں نے اب تک کسی مسجد کی اتنی طویل طویل صفوں کی پنجوقتہ نماز نہیں دیکھی تھی، زیادہ سے زیادہ ٹونک کی جامع مسجد میں جمعہ کے دن غیر معمولی مجمع اکٹھا ہو جاتا تھا، لیکن ملبے ملبے کرتوں اور سیدھے سادے لباس میں پانچوں وقت خالق کے سامنے ایک دفعہ سجدہ ریز سروں کا یہ منظر میرے لئے بالکل نیا تھا۔ خود اپنا حال یہ تھا کہ لشتم پشتم کسی نہ کسی طرح اس وقت تک نماز پڑھ تو ضرور لیتا تھا، لیکن جماعت کی پابندی کی قید سے میری یہ ٹوٹی پھوٹی نمازیں بھی

عموماً آزاد ہی ہوتی تھیں۔ اتفاق کی بات تھی کہ حکیم منظر حسن صاحب جنھوں نے اپنے کمرے میں، اس نووارد مسافر کو ٹھہرا لیا تھا، یہ مسجد ہی کے احاطہ کا ایک حجرہ تھا، شاید کہیں عرض کر چکا ہوں کہ مسجد کے جنوبی سمت میں جو کمرے مہمان خانے کے بالاخانے کے نیچے بنے ہوئے ہیں، ان ہی حجروں میں سیڑھیوں کے پاس کا یہ ایک وسیع کمرہ تھا، مسجد اور حجرے میں فاصلہ صرف ایک قدم کا تھا۔ ایک پاؤں حجرے کی چوکھٹ پر، اور دوسرا مسجد میں، مسجد سے مکانی قرب کا یہ اتفاقی واقعہ، میری اضطراری سعادت کا ذریعہ بن گیا تھا۔ پانچوں وقت اسی عجیب و غریب جماعت میں شریک ہو کر نمازوں کے پڑھنے کا موقع اسکو میسر آگیا تھا، جس کی پانچ وقت کی نمازوں میں بمشکل شاید ہی کوئی ایک دو خوش قسمت نماز جماعت کی فضیلت سے شرف اندوز ہوتی تھی، لیکن سرزمین ہند میں پانچوں وقتوں کی سب سے بڑی جماعت[1] والی مسجد ہی میں گویا لاکر اسے بیٹھا دیا گیا تھا۔ گر نستانی بستم می رسد، شاید کچھ اسی قسم کے اتفاقات کی تعبیر ہے، یہ اور اسی قسم کے تماشے تو آنکھوں کے سامنے گزر رہے تھے، عجب تماشے جنکا میرے دماغ نے بھی کبھی شاید تصور نہ کیا تھا

نئے نئے اسماء

دوسری طرف کان میں نئے نئے اسماء، اور نئے نئے

---

(۱) دل تو میرا ابھی کہتا تھا، لیکن کسی اندھے دل کے فیصلے کا اعتبار ہی کیا، تاہم بعد کو حضرت الاستاذ مولانا اصغر حسین صاحبؒ کی زبانی یہ روایت سن کر اطمینان ہوا کہ مکہ معظمہ کے مشہور مجاور بزرگ جن کا مولانا محب الدین نام تھا، دارالعلوم میں تشریف لائے، تو یہاں کی جماعت میں شریک ہو کر اپنا کشفی احساس یہ ظاہر کرتے تھے کہ جس کیفیت کی بات یہاں کی جماعت میں ہوتی ہے، اب تو حرم کی جماعت میں بھی اس کیفیت کو نہیں پاتا۔ الفاظ ممکن ہے روایت کے مختلف ہوں لیکن مطلب غالباً یہی تھا، شاید دوسروں نے بھی یہ روایت میاں صاحب سے سنی ہوگی۔

Toobaa-elibrary.blogspot.com

ناموں کا ایک سلسلہ تھا، جو یکے بعد دیگرے مسلسل ٹکراتا چلا جاتا تھا، میرے کان اب تک اہل علم کے جن تذکروں سے بھرے ہوئے تھے، اور دل کو جن کی عظمتوں سے لبریز کر دیا گیا تھا وہ دارالعلوم کے احاطہ کی ان نئی آوازوں سے کلیتہً مختلف تھے، عرض کر چکا ہوں کہ اکابر دیوبند کے اسماء گرامی سے فقیر ناواقف تو نہ تھا لیکن ناواقف نہ ہونا یہ اور بات تھی، اور اب جہاں بیٹھے جدھر جائیے، ہر مجلس، ہر حجرے، اور حجرے کی در و دیوار سے حضرت نانوتوی رح (مولانا محمد قاسم) حضرت گنگوہی رح (مولانا رشید احمد) حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رح، مولانا اشرف علی تھانوی رح مولانا عبدالرحیم رائے پوری کے چرچوں کے سوا اور کچھ نہ تھا ان چرچوں کو تو صرف سنتا تھا، ان ہی کے ساتھ کچھ گرامی اسماء ایسے بھی تھے کہ اسماء کے ساتھ خود ان کے مسمیٰ پر بھی دور سے نظر پڑ جاتی تھی یہ حضرات شیخ الہند مولانا محمود حسن، حضرت مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا حافظ محمد احمد صاحب، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب، مفتی عزیز الرحمٰن صاحب، مولانا شبیر احمد صاحب، رحمہم اللہ اجمعین کی مبارک اور قدسی ہستیاں تھیں، تھوڑی تھوڑی دیر بعد ان میں سے جو کوئی صاحب مدرسہ سے باہر تشریف لے جاتے یا اندر تشریف لاتے تو اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے طلبہ کی نگاہیں سمیٹ سمٹ کر ان ہی پر مرتکز ہو جاتی تھیں.. "بڑے حضرت جا رہے ہیں" مراد مرشدی مولانا محمود حسن صاحب سے ہوتی تھی "شاہ صاحب تشریف لا رہے ہیں" حضرت کشمیری کیطرف اشارہ ہوتا تھا "بڑے مہتمم صاحب آ رہے ہیں" حضرت حافظ محمد احمد صاحب مقصود ہوتے تھے، "چھوٹے مہتمم صاحب ہیں" مطلب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ہوتے تھے، جن ناموں کو ساری زندگی میں بمشکل کبھی سن پایا تھا اب ان ہی ناموں کی مسلسل چوٹ کان ہی پر پڑ رہی تھی۔ اور حاشیۂ خیال میں بھی جنکے دیکھنے کا خطرہ کبھی نہ گزرا تھا، وہی صبح و شام، شب و روز کی مختلف گھڑیوں

میں میری آنکھوں کے سامنے گزر رہے تھے دور، ان بزرگوں سے بہت دور طالب العلموں کی بھیڑ میں مل جل کر آتے جاتے، چلتے پھرتے ہوئے ان کو دیکھ لیتا، اور جب وہ گزر جاتے تو بساط ہوائے دل کے اس تازہ وارد کے سامنے پرانے طلباء اپنے معلومات، اور معلومات سے زیادہ ان بزرگوں کے متعلق شعوری اور غیر شعوری، نفسیاتی تاثرات کا تذکرہ اس انہماک اور محویت کے ساتھ میرے سامنے کرتے، ان کے رہنے سہنے، بولنے چلنے، ان کی عادتوں، ان کی نیکیوں، ان کی ظرافتوں، ان کی قربانیوں، ان کی للّٰہیت، اخلاص و صداقت، ان کی کرامتوں، اور سب سے زیادہ ان میں ہر ایک کی علمی خصوصیتوں کے سوا سچ پوچھئے تو اس پہلے ہفتہ میں میرے کانوں نے شاید ہی کوئی اور بات سنی ہو، میں اپنے ساتھ علم کے جن نمائندوں کے وقار و عظمت کو لیکر دارالعلوم میں داخل ہوا تھا۔ اچانک معلوم ہوا کہ علم ہی کی، اسی ہندوستان میں، ایک ایسی بھی دنیا ہے، جہاں ان کے وقار و وزن ہی سے نہیں بلکہ ان کے ناموں سے بھی لوگ ناآشنا اور قطعاً ناآشنا ہیں۔ گویا معدومات کی کوئی آبادی تھی جس میں اب تک زندگی کے دن پورے کر کے آیا تھا، سالہا سال کے راسخ خیالات وار تسامات مٹ رہے تھے، اور ان کی جگہ نئے نقش و نگار دماغی سطح پر مسلسل اپنی جگہ چپکے چپکے اندر ہی اندر بناتے چلے جا رہے تھے

دارالعلوم کے انتظامات

سب سے پہلی خبر، جس سے میرا دل متاثر ہو رہا تھا، وہ دارالعلوم کا عجیب و غریب نظم تھا، ہزار بارہ سو طلبہ کے لئے دونوں وقت پکے پکائے کھانے کا انتظام اور زیادہ تر بغیر کسی معاوضہ کے اس کھانے کی تقسیم، اسے تو دیکھ رہا تھا، پھر ان ہی پرانے طلبہ سے جن میں آکر میں شریک ہوا تھا، نئی نئی باتیں معلوم ہو رہی تھیں، دیکھا ہر طالب العلم خالص سرسوں کا تیل کافی مقدار میں اپنے ساتھ لا رہا

Toobaa-elibrary.blogspot.com

ہے۔ یہ کیا ہے؟ جواب دیا گیا کہ اصولاً مٹی کے تیل کی روشنی میں مطالعہ کو دارالعلوم کے ارباب بست وکشاد پسند نہیں کرتے، روشنی کے لئے ہر مہینہ میں طالب العلم کو سرسوں کا یہ تیل ملتا ہے۔ میں بہار کے طالب العلموں کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا، جن کے یہاں سرسوں کا تیل گھی سے زیادہ مرغوب غذائی چیز تھی، اسی دن اس کو، ترکاریوں، اور گوشت وغیرہ میں ملا کر پکا لیتے، اور چٹ کر جاتے اور وہی مٹی کے تیل کی لالٹینوں میں مطالعہ کرتے، مدرسہ کی طرف سے کسی قسم کا قدغن اس سلسلہ میں باقی نہ رہا تھا، گویا ایک پرانی رسم تھی جو جاری تھی۔ ہاں پنجاب اور سرحد کے طلبہ بیچارے مٹی کے چراغوں میں سرسوں کے اس تیل کو ڈال کر دیکھتا تھا کہ روشنی حاصل کر رہے ہیں کبھی کبھی پنجاب اور سرحد کے ان ہی طلبہ کو دیکھا کہ بان کے پلنگ کر الٹا کر زمین پر ڈالے ہوئے ہیں، اور اسکے کسی پائے کو شمعدان فرض کر کے مٹی کا دیا اسی پر رکھ کر پڑھ رہے ہیں۔

الغرض ہر روز ایک نئی بات کا علم اور نیا نظارہ نگاہوں کے سامنے پیش ہوتا کہ اپنی پچھلی زندگی خواب معلوم ہوتی تھی، یا اگر وہ بیداری تھی، تو اب گویا خواب دیکھ رہا تھا، کھانا بھی مفت، پینا بھی مفت، مکان بھی مفت، مکان کا فرش بھی مفت، اور نئی بات یہ کہ روشنی بھی مفت، یہ سب کچھ ان ہی ٹوٹے پھوٹے مسلمانوں کے پیسے سے انجام دیا جا رہا ہے۔ جن کی بلند ہمتوں کی شہادت دارالعلوم کے احاطہ کی فلک نما، سپہر پیما عمارتیں ادا کر رہی ہیں۔ میں ان باتوں کو دیکھتا اور کبھی کبھی تنہائی میں سوچتا کہ جس قوم کی موت کا مجھے یقین دلایا گیا تھا۔ وہ دارالعلوم کے احاطہ میں اچانک کس طرح زندہ ہو گئی، دل واقعات کی منطقی توجیہ میں سرگرداں رہتا لیکن پچھلے سوالات ابھی ناحل شدہ نکل ہی رہے تھے کہ خود اپنی ذاتی ایک ضرورت کا خیال سامنے آ گیا۔

درسی کتابوں کا مسئلہ

حدیث کے دورے میں شرکت کی نیت کر کے آیا تھا، اب سوچنے لگا کہ اس کے لئے مجھے

کتنی کتابیں خریدنی پڑیں گی تو دماغ بوکھلا اٹھا۔ بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی نسائی، ابن ماجہ، صحاح ستہ کی ان کتابوں کے علاوہ مجھے بتایا گیا۔ اور نصاب کے تختہ میں بھی دیکھا کہ مؤطا امام مالک و محمد اور طحاوی کی شرح معانی الآثار بھی پڑھنی پڑے گی، ان ساری کتابوں کی مجموعی قیمت تین سو روپے سے زیادہ تھی۔ طالب العلمی کے ان ایام میں یہ مسئلہ میرے لئے کافی دشوار تھا۔ سینے پر بوجھ سا تھا، حکیم منظر حسن صاحب سے شاید پوچھا کہ ان کتابوں کے بندوبست کرنے کی کیا شکل ہو گی ٹونک میں تو ایک رسم بھی تھی کہ بعض قدیم علمی خانوادوں کے اراکین سے ملاقات تھی، ان سے پڑھنے کے لئے عاریۃً کبھی کبھی کتابیں مل جاتی تھیں، لیکن دیوبند تو میرے لئے ایک نئی جگہ تھی، یہاں اس عاریت کا بھی امکان نہیں، ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ کتابوں کے متعلق ایک جدید علم کی لہر بجلی کی طرح مجھ میں تڑپ اٹھی، معلوم یہ ہوا کہ ان سارے طالب العلموں کو نیچے سے اوپر تک ہر کلاس کے لئے مدرسہ ہی نصابی کتابوں کا بھی نظم کرتا ہے، کیسے کرتا ہے؟ میرے اس سوال کا جواب دیا گیا کہ ہر وہ کتاب جو مدرسہ میں پڑھائی جاتی ہے اس کا ایک مستقل الگ کتب خانہ ہے چھوٹی ہو یا بڑی، الغرض کافیہ سے لے کر بخاری و مسلم تک ہر کتاب کے بیشمار نسخے جمع کر لئے گئے ہیں، مدرسہ جب کھلتا ہے، تو نصابی کتابوں کے اسی کتب خانہ سے پڑھنے کے لئے طالب العلموں میں عاریۃً کتابیں تقسیم کر دی جاتی ہیں، اور اختتام سال پر پھر طلبہ ان کتابوں کو واپس کر دیتے ہیں۔ تین سو روپے کا سوال باقی نہ رہا، حکیم صاحب نے خود لیجا کر دکھایا، نصابی کتابوں کے اس پیچیدہ سوال کے حل کی اس آسان شکل کو دیکھ کر میں سناٹے میں آ گیا، معلوم ہوا کہ عموماً مسلمان یہ کرتے ہیں کہ مرنے والوں کے روح کو ثواب پہونچانے کے لئے حسب استطاعت ہر سال ان ہی نصابی کتابوں کے کچھ نسخے خرید کر دارالعلوم بھیجدیا کرتے ہیں، یا کتابوں سے جو

Toobaa-elibrary.blogspot.com

ناواقف ہیں وہ اس مد کے لئے روپئے بھیج دیتے ہیں۔ الغرض اسی دستور کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی جماعت میں سو سے زیادہ طلبہ کی تعداد بھی ہوتی ہے جب بھی ان کو کتاب خریدنے کی ضرورت نہیں ہوتی، اور دارالعلوم ہر ایک کے لئے مستقل نسخہ نصاب کی اس کتاب کا مہیا کر دیتا ہے، اس مد پر معلوم ہوا کہ ہر سال ہزارہا روپئے صرف ہوتے ہیں، کیونکہ جس حال میں طلبہ کتابوں کو لیتے ہیں، باوجود شدید تاکید کے، اسی حال میں واپس نہیں کرتے، جلدیں ٹوٹ جاتی ہیں، اوراق پھٹ جاتے ہیں، ان کی درستگی و اصلاح کے لئے ہر سال کافی رقم جلد بندی اور داغ دوزوں کو مدرسہ ادا کرتا ہے۔

موسمِ سرما کا انتظام

جس زمانہ میں فقیر حاضر ہوا تھا، شاید برسات کا موسم ختم ہو رہا تھا، چند ہی دنوں کے بعد موسم سرما بھی آگیا طالب العلموں کے بدن پر خاص قسم کی روئی بھری ہوئی اچکنیں نظر آنے لگیں، جن کی نوعیت ایک ہی جیسی تھی، یہ کیا ہے؟ معلوم ہوا کہ اس سے پہلے بھی طلبہ جو لباس پہنے ہوئے تھے، ان میں عموماً دارالعلوم کے ہی عطا کئے ہوئے جوڑے تھے، اور اب موسم سرما میں جو چاہتے ہیں انکو یہ روئی بھری اچکن اور ایک لحاف اور شاید توشک بھی مدرسہ عطا کرتا ہے(۱) میرے لئے

(۱) اس سلسلہ میں ایک بات اب بھی کبھی یاد آجاتی ہے، موسم سرما کے لباس کی تقسیم میں کچھ تاخیر طلبہ محسوس کر رہے تھے، خدا جانے واقعی تاخیر ہوئی بھی تھی یا نہیں، لیکن طلبہ کا احساس یہی تھا، طلبہ کی کسی مجلس میں اسی تاخیر کا ذکر ہو رہا تھا، فقیر نے عرض کیا کہ بھائی اس کا علاج آسان ہے، ایک اشتہار کا مضمون اسی وقت تیار کر کے طلبہ کے حوالے کیا گیا، جس کی پیشانی پر حافظ شیرازی کے مشہور شعر کو معمولی تصرف کے ساتھ درج کیا گیا تھا یعنی

شبِ سرما و بیمِ موت، و افلاسے چنیں طاری ۔۔۔ کجا دانند حالِ ما خداوندانِ توشکہا

مدرسہ کا یہ نظام ذہنی انقلاب کا پیغام بنتا چلا جا رہا تھا۔ کھانا بھی مفت، لباس بھی مفت، روشنی بھی مفت، کتابیں بھی مفت، ایک نہیں، دو نہیں آٹھ آٹھ، نو نو سو سے زائد طلباء کے لئے استوار، مستحکم انتظام میرے لئے باعثِ حیرت بنا ہوا تھا، یہی نہیں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے ساتھ نیا انکشاف مجھے مبہوت بنائے رکھتا تھا

مفت علاج

کسی بیمار طالب علم پر نظر پڑی معلوم ہوا کہ دوا بھی مدرسہ ہی کی طرف سے اس کو ملے گی جس کی کوئی قیمت اسکو ادا نہ کرنی پڑے گی۔ بغیر کسی فیس کے مدرسہ کے طبیب اس کا معائنہ بھی کرتے ہیں، نسخہ بھی لکھدیتے ہیں، اس زمانہ میں حضرت شیخ الہند کے بھائی حکیم محمد حسن(۲)

(صفحہ گذشتہ کا حاشیہ) (جاڑے کی رات، موت کا خوف اور ایسا افلاس مسلط ہے، ارباب توشک کو ہمارے حالِ زار کی کیا خبر) "خداوندانِ توشکہا" پر ایک نوٹ تھا تقسیم پارچہ کے داروغہ کا نام لکھا گیا تھا کہ ... فانہ یمشی فی القطن ویقعد فی القطن ویرقد فی القطن ویسقط فی القطن فیا لہ من کثرۃ القطن ویا لنا من البرد الشدید (فلاں صاحب کا کیا کہنا وہ تو روئی پر چلتے ہیں، کیا خوب، ان کے پاس روئی کی کثرت ہے اور کیا خوب ہمارے واسطے سخت سردی ہے) آگے لکھا تھا کہ جاء البرود والجبات مشہور عربی مثل تھی لیکن ہمارے لئے تو جاء البرد مع الاموات کی مثل صادق آرہی ہے" اشتہار گاہ کی جگہ پر اشتہار رات کی تاریکی میں چسپاں کر دیا گیا، صبح کو چرچا ہوا کہ کس نے لکھا؟ کس نے لکھا؟ دلچسپ لطیفہ یہ تھا کہ طالب العلموں میں متعدد حضرات چاہتے تھے کہ ان ہی کی طرف اس کو منسوب کر دیا جائے کہ قابلیت کا انکی ثبوت ملے، خود میں نے بعضوں سے پوچھا کہ آپ نے تو نہیں لکھا انھوں نے کچھ اس طرح گردن ہلائی کہ میں ان ہی کا لکھا ہوا تسلیم کر لوں۔

(۲) حکیم صاحب قبلہ ملازم تو مدرسہ میں طبیب ہونے کی حیثیت سے تھے (باقی بر صفحہ آئندہ)

Toobaa-elibrary.blogspot.com

تھے وہی مدرسہ کے متعلقین کا علاج کیا کرتے تھے، صرف علاج اور دوا ہی نہیں بلکہ مریض کو طبیب کی ہدایت کے مطابق، جس قسم کی پرہیزی کھانے کی ضرورت ہوتی ہے. وہ بھی مدرسہ ہی کی طرف سے مہیا کیا جاتا ہے، میں ان باتوں کو سنتا تھا اور جو بات سنائی جاتی مشاہدہ سے مسلسل اس کی تصدیق بھی ہوتی چلی جاتی تھی۔

کام میں برکت

مولویوں کا عام طبقہ انتظامی سلیقوں سے محروم ہوتا ہے، ابن خلدون کا مشہور فقرہ ہے العلماء ابعد الناس عن السیاسۃ یعنی سیاسی کاروبار سے عموماً مولویوں کو کوئی مناسبت نہیں ہوتی، سیاست کے معنی اگر جوڑ توڑ، مار دھاڑ اکھاڑ پچھاڑ کہیں تو خیر، یہ تو بات ہی دوسری ہوئی لیکن اگر جہاں بانی و حکمرانی کا سلیقہ مراد ہے، تو کوئی شبہ نہیں کہ دار العلوم کے احاطہ میں نظم و ضبط اور اس کی ہمہ گیریوں کا ایک دلچسپ نمونہ میری نگاہوں کے سامنے آگیا تھا۔ گوناگوں کاموں کے یہ سارے شعبے چل رہے تھے، اور اتنی ہمواری کے ساتھ کسی خرخشے کے بغیر چل رہے تھے کہ نہ کسی قسم کا ہنگامہ برپا تھا، نہ دار و گیر اور رستخیز کی کیفیت معلوم ہوتی تھی، سنجیدگی و متانت کے ساتھ سبک رفتار ندی کی چال کی طرح یہ نظم جاری تھا، طرفہ تماشا یہ تھا

(حاشیہ صفحۂ گذشتہ کا) مگر صرف طبی خدمات ہی نہیں، بلکہ فارغ التحصیل یا قریب بفراغ طلبہ میں سے جو طب کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے، ان کو طب کی کتابیں بھی پڑھایا کرتے تھے، اور مدرسہ کے اسباق میں سے بھی کوئی اہم سبق ان کے ذمہ رہا کرتا تھا، ان کے ہدایہ اخیرین کے درس میں خاکسار بھی کچھ دنوں شریک رہا تھا، بڑے ذہین اور صاف دل آدمی تھے، انکی زبان سے پہلی دفعہ "سیاہ سینہ" کا لفظ خاکسار نے سنا تھا، سیاہ دل کی جگہ ایک نئی ترکیب انکی زبان سے بھلی معلوم ہوئی، خود میری زبان پر بھی یہ لفظ چڑھ گیا، ان کو شکار کا بھی غیر معمولی ذوق تھا، شاید کوئی ہفتہ گزرتا ہوگا جس میں ایک دو ہرن ان کے فتراک میں بندھ کر جنگل سے نہ آتا ہو، بڑے قدر انداز تھے، مشکل ہی سے ان کا نشانہ خطا ہوتا تھا

کہ نظم کو چلانے والوں کی تعداد بمشکل انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی، شاید میں مبالغہ نہیں کر رہا ہوں کہ مطبخ، کتب خانہ، طبابت خانہ میں کام کرنیوالوں کو اس زمانہ میں جب میں نے گنا تھا، تو مجموعی طور پر ان کی میزان دس کے اندر ہی اندر غالباً تھی، انھیں میں تقریباً ایک ہزار کھانے والوں کے روزانہ دونوں وقت کھانے پکانے والے بھی تھے، اور پکوانے والے بھی، انھیں میں کتابوں کی تقسیم کرنیوالے اور ہر ہر کتاب کو اپنی اپنی جگہ سے نکال کر لانیوالے اور پہنچانیوالے بھی تھے، انھیں میں ٹوٹی پھوٹی جلدوں کو دوبارہ درست کرنے والے بھی تھے، الغرض سب کام ہو رہا تھا لیکن جتنا بڑا کام تھا، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کام کرنیوالوں کی مختصر سی یہ ٹولی اسکو انتہائی حسن و خوبی کے ساتھ بسہولت تمام کیسے انجام دے رہی ہے

مدرسہ کی عمارت

میری نظر پھر مدرسہ کی عمارتوں پر پڑتی، ایک احاطہ کے بعد دوسرا احاطہ۔ دوسرے کے بعد تیسرا احاطہ، شمال و جنوب میں پھیلا ہوا، ہر احاطہ کے بیچ میں وسیع۔ اور چاروں طرف برآمدے کے ساتھ کمرے اور حجرے، جن میں طلباء بھرے ہوئے تھے تعمیرات کا سلسلہ جاری تھا، اور یہ سارا تعمیری صیغہ اس زمانہ میں پھپھوند کے ایک صاحب مولوی رحمت علی صاحب کی نگرانی میں تھا، تعلیم مدرسہ ہی میں پائی تھی، طبعی مناسبت کی وجہ سے بجائے مولویوں کے، مہندسوں اور انجینیروں کا کام انجام دیرہے تھے شاید چالیس یا پچاس سے زیادہ تنخواہ نہ تھی، تن تنہا وہی سب راجوں اور مستریوں کے کاموں کی نگرانی کرتے تھے، بڑے یار باش اور بے تکلف آدمی تھے۔ بعد کو خاکسار سے خصوصی تعلق ان کا پیدا ہو گیا تھا۔ دلچسپ باتیں کیا کرتے تھے (۱)

---

(۱) یاد آتا ہے کہ ہمارے خاکسار کے وطن کی عام غذا چاول پر مولوی رحمت علی نے (باقی بر صفحہ آئندہ)

Toobaa-elibrary.blogspot.com

احاطہ مولسری کا ٹھنڈا پانی

اور میں کن کن باتوں کا ذکر کروں، میرے لئے دیوبند کا یہ پہلا ہفتہ اعاجیب اور نت نئے اچنبھے کی باتوں کا ہفتہ تھا۔ حکیم منظر حسن صاحب کے جس کمرے میں میں ٹھہرا ہوا تھا، وہاں مجھے پانی پینے کا کوئی سامان نظر نہ آیا، نہ کوئی صراحی، نہ کوئی مٹکا، لیکن جب کھانے پر لوگ بیٹھے تو دیکھا کوئی صاحب تازہ پانی کی ایک ٹھلیا اپنے ساتھ لائے، اور دستر خوان کے قریب اس کو رکھ دیا۔ تازہ پانی ابھی کنوئیں سے آیا تھا، اس خیال سے دل گھبرانے لگا کہ ٹھنڈا تو قطعاً نہ ہوگا، لیکن گلاس میں بھر کر جب دیا گیا تو ایسا معلوم ہوا کہ برف کا بجھا ہوا جلسے زیادہ خوشگوار ایسا پانی حلق کے نیچے اتر رہا ہے کہ آنکھوں میں سرخی کی لہر دوڑ گئی، دریافت کیا کہ برف ڈال کر آپ لوگ پانی پیتے ہیں؟ اس قصبہ میں برف کیا بہت ارزاں ہے؟ حکیم صاحب نے فرمایا جی نہیں، مدرسہ کے اندر مولسری والے احاطہ کے مشرقی سمت میں جو کنواں ہے اس کا پانی جس وقت بھی پیجئے معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے برف ڈال دی ہے، بولے کہ مدرسہ میں اسی لئے بجائے اپنے

(صفحہ گذشتہ کا باقی حاشیہ) اعتراض کیا کہ اس سے جسم میں قوت نہیں پیدا ہوتی، خاکسار نے عرض کیا کہ بھئی! گیہوں کھانے کا خمیازہ ایک دفعہ تو بھگت چکے کہ جنت سے نکالے گئے، اور مٹی کے کرے پر جلا وطن ہونا پڑا۔ مجھے تو خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ گیہوں کھانے کی عادت اب بھی نہ چھوٹی تو یہاں سے بھی ڈھکیل دیئے جائیں، اور جنت کے رہنے والوں کو یہی گیہوں جہنم میں پہنچا کر رہے، خوب ہنستے اور کہتے کہ ہر بات میں تو نکتہ نکال لیا کرتا ہے، شاید اسی کے ساتھ یہ بھی عرض کیا تھا کہ روزمرہ تو آپ یو۔ پی والے گیہوں کھاتے ہیں، لیکن جب کوئی معزز مہمان آپکے یہاں آجاتا ہے، یا تقریب ہوتی ہے تو آپ کی عزت اور آبرو کو بچانے والا گیہوں نہیں چاول ہی تو نظر آتا ہے۔

کمروں کے ہر شخص کے پینے کا پانی کنوئیں ہی میں محفوظ رہتا ہے، وقت پر اپنا اپنا حصہ ہر ایک نکال کر لے آتا ہے، گھرنی کنوئیں پر لگی ہوئی ہے، چمڑے کے ایک بڑے ڈول ہیں، ایک ٹھلیا جس سے بھر جائے، پانی چلا آتا ہے۔ یہی ہر وقت کا دستور ہے، اور میں کہہ سکتا ہوں کہ کنوئیں کی حد تک اتنا لذیذ، اتنا خوشگوار، اتنا شیریں صاف و پاک سبک و خنک پانی مشکل ہی سے کسی کنوئیں کا اب تک میں نے پیا تھا۔ اور بعد کو بھی برف کے بغیر ایسا پانی جسے پیتے ہی چلے جایئے لیکن نہ گرانی ہی اس سے پیدا ہو، اور نہ دل ہی بھرے، زندگی میں اس کا تجربہ مدینہ منورہ پہونچ کر بعد کو ہوا۔

یاد آگئی مسجد نبوی کی وہ سبیل! سپید سپید بڑی بڑی صراحیوں کے ساتھ مراد آبادی پیالوں میں کشیدہ قامت، گورے چٹے، حسین و خوبصورت، ترکی النسل، پلانے والے پانی پلاتے جاتے تھے، دینی عقیدت کے تحت نہیں، بلکہ عام انسانی احساس کے زیر اثر ہو کر یہ عرض کر رہا ہوں کہ حوض کوثر کا خیال، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سامنے اسی ناسوتی عالم میں مجسم ہو کر آگیا ہے، وہ ساری خوبیاں جو کسی پانی میں آدمی کی فطرت تلاش کرتی ہے یا کر سکتی ہے، ایک ایک کر کے مدینہ طیبہ کے اس پانی میں پائی جاتی تھیں (۱)۔ بہرحال مدینہ منورہ کا پانی تو مدینہ

---

(۱) مرحوم و مغفور نواب صدر یار جنگ نور اللہ مرقدہٗ کا بھی احساس یہی تھا، فرمایا کرتے تھے کہ دنیا کی سیر کرنیوالوں نے میرے سامنے اعتراف کیا ہے کہ جو لطف مدینہ منورہ کے پانی میں ان کو ملا کہیں نہیں ملا۔ نواب صاحب خود بڑے رئیس اور کم از کم ہندوستان کے اکثر صوبوں کی سیر کئے ہوئے تھے۔ کہتے تھے مجھے کہیں اس کی نظیر نظر نہ آئی۔

Toobaa-elibrary.blogspot.com

منورہ ہی کا تھا جو بات اس مقدس آبِ خنک گوارا میں پائی جاتی تھی، اس کو تو کسی دوسری جگہ تلاش کرنا فضول ہے، لیکن کہہ سکتا ہوں کہ ہلکی سی جھلک اس پانی کی مدرسہ والے کنویں کے پانی میں مجھے اس زمانہ میں میسر آئی تھی، حالانکہ اسی دیوبند میں سینکڑوں کنویں ہیں، خود مدرسہ میں مسجد کے مشرقی دروازے کے پاس ایک نیا کنواں، میرے داخلے سے پہلے تعمیر ہو چکا تھا، اور جس کمرے میں مقیم تھا۔ اس سے مسجد والا یہ کنواں زیادہ قریب تھا، لیکن اندرون مدرسہ کے کنویں کی بات نہ مدرسہ ہی کے اس نئے کنویں کے پانی میں پائی جاتی تھی اور نہ دیوبند کے کسی اور کنویں میں، اسی لئے پینے کی حد تک زیادہ تر اسی قدیم کنویں کے پانی کو جب تک مدرسہ میں رہا، استعمال کرتا رہا، بہرحال اس پہلے ہفتہ میں مدرسہ کی زندگی کی جو چیز بھی نظر سے گزر رہی تھی، اس سے انس ہی انس کا اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔

(حاشیہ پچھلے صفحہ کا) اب وہ آرام کے ساتھ ایک گوشے میں بیٹھ رہا۔ پوچھنے پر اس عقلمند نے بتایا کہ اس نے دریا کی مصیبت کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس لئے کشتی کی عافیت نہیں دیکھی تھی۔ اس لئے کشتی کی عافیت سے نابلد تھا۔ اب جب کہ دریا کی مصیبت دیکھ لی۔ تو کشتی کی عافیت اس کے سمجھ میں آگئی۔

باب ۴

امتحان داخلہ

الّا یہ کہ اسی ہفتہ میں ایک "دہشت ناک" خبر بھی کان میں گونجی، خیال یہ کئے ہوئے تھا کہ مدرسہ میں داخلہ کی جانب سے نائب مہتمم مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے مطمئن فرما دیا ہے، شک کی کوئی وجہ باقی نہ رہی تھی کہ اچانک مجھے یہ اطلاع دی گئی کہ قانون کی رُو سے داخلہ کا امتحان تجھے بھی دینا ہوگا "امتحان" کان کے پردے پر تو اس لفظ کی چوٹ پڑی لیکن اس چوٹ سے دماغ بوکھلا گیا، دل دھڑکنے لگا۔ اب تک میری تعلیم ٹونک میں اس طور پر ہوئی تھی کہ تحریری امتحان تو دور کی بات تھی، جہاں تک خیال آتا ہے کہ ایک یا دو مرتبہ تقریری امتحان کی حیثیت وہ بھی نام نہاد طور پر سر سے گزری تھی، استاد مرحوم نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ فلاں فلاں مقامات پر تجھ سے پوچھوں گا (۱)

(۱) عام طور پر یہ بات امتحان کے مفہوم کے مناسب نہ تھی، اس لئے خیال گزرا کہ ایسا امتحان امتحان ہی کیا ہوا، لیکن جب کتاب کھلی، بتایا ہوا سوال پوچھا گیا، تو جواب میں کیا دشواری تھی، دے دیا گیا، یہ فلسفہ کی ایک کتاب کا سوال تھا، لیکن استاذ مرحوم نے جب فرمایا کہ یہ نہیں دریافت کر رہا ہوں کہ تمہاری کتاب میں کیا لکھا ہوا ہے، بلکہ پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ تم خود بھی اس سوال کا کوئی جواب اپنی طرف سے دے سکتے ہو، تب معلوم ہوا کہ اب میرا امتحان ہو رہا ہے جواب دیا گیا، استاد مرحوم نے تعریف کی، کچھ توقعات اس ناکارہ کے ساتھ قائم کئے گئے جو افسوس کہ میری شوریدہ بختی کی وجہ سے پورے نہ ہو سکے۔

Toobaa-elibrary.blogspot.com

"دریا دیدہ نہ بود" والے گلستانِ سعدی کے غلام لڑکے، کی جو حالت تھی (۱) وہی حال دار العلوم کے احاطہ میں امتحان کے لفظ سے مجھ پر طاری ہوا، گو مدرسہ میں چند ہی دن گزرے تھے لیکن باتونی ہونے کی وجہ سے طلباء، خصوصاً جن کے ساتھ نشست و برخاست زیادہ تھی، ان پر ایک گونہ کچھ رنگ بھی قائم ہو گیا تھا، اب یہ رنگ پھٹ جائے گا۔ ہوا، جو دھوکے اور فریب سے باندھی گئی تھی، اکھڑ جائے گی۔ انہی وسوسوں کی دل و دماغ کے میدانوں میں تگ و دو، لکد کوب شروع ہو گئی، کیا رسوائی کے پیش آنے سے پہلے نکل بھاگوں کیا کروں؟ طرح طرح کے خیالات ستانے لگے، سب سے زیادہ اہم سوال یہ سامنے آیا کہ امتحان کون حضرت لیں گے، اِدھر اُدھر سے چاہا کہ سراغ لگالوں، مختلف بزرگوں کا نام لیا جاتا، جو عموماً داخلہ کا امتحان لیا کرتے تھے، خیال آتا ہے عموماً حضرت مولانا اعزاز علی صاحب کا نام اس سلسلہ میں زیادہ لیا جاتا تھا، اگرچہ مولانا اس زمانے میں بجائے استاذ العلماء کے ابھی استاذ الطلبہ ہی تھے لیکن پھر بھی دار العلوم کے اساتذہ میں ان کا شمار تھا، بعض طلباء نے اطمینان بھی دلایا کہ مولانا اعزاز علی صاحب زیادہ سختی سے داخلہ کے امتحان میں کام نہیں لیتے، اس سے کچھ امید بندھتی، الغرض چند دن اسی اُدھیڑ بُن میں گزرے، اور جب مدرسہ میں پڑھنے ہی کے ارادے سے داخل ہو چکا تھا تو آنے کے بعد واپس ہو جانے پر دل راضی نہ ہوا، خصوصاً دار العلوم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا دل و دماغ پر اتنا غیر معمولی تسلط ہو

---

(۱) حاشیہ شیخ سعدی نے گلستاں میں حکایت لکھی ہے کہ کسی سفر میں بادشاہ سلامت کشتی پر سوار ہوئے، ان کا ایک غلام تھا جس کا کبھی دریا، اور کشتی سے سابقہ نہ پڑا تھا، جب کشتی آگے بڑھی، تو وہ گھبرانے لگا، چیخ پکار شروع کی اور کچھ دیر کے بعد اس نے ایسا ہنگامہ مچایا کہ تمام کشتی سوار پریشان ہو گئے، کوئی عقلمند آدمی اس کشتی میں تھا، اس نے کچھ لوگوں کو حکم دیا کہ اسے پکڑ کر دریا میں ڈال دو، چنانچہ اسے دریا میں ڈال دیا گیا، چند غوطے اس نے کھائے پھر نکال لیا گیا۔

(باقی تیسرے صفحہ پر)

چکا تھا کہ اس ماحول میں پہونچ جانے کے بعد، اس کے منافع سے محض اپنی بزدلی کی وجہ سے محروم رہ جانا بڑا حسرت انگیز احساس بن جاتا، آخر جس دن کا ڈر تھا وہ سامنے آ ہی گیا، اور مجھے مطلع کیا گیا کہ داخلہ کے امتحان کے لئے کتب خانہ کے بالاخانہ پر حاضر ہو جاؤں، اب یاد نہیں رہا کہ پہلے ہی سے کچھ بھنک مل چکی تھی، یا اچانک یہ صورت پیش آئی کہ اب تک دور ہی دور سے، جس روح پرور، جاں افروز وجود کے جلوؤں سے اپنی آنکھوں کو سینکا کرتا تھا، ناگاہ میں نے پایا کہ وہی مقدس ہستی میرے سامنے ہے، یا میں اس کے سامنے پیش کر دیا گیا ہوں، یہ حضرت الاستاذ الامام العلامہ سیدنا مولانا سید انور شاہ کشمیری قدس سرہ کی ذات پاک تھی، فقیر کے داخلہ کا امتحان معلوم ہوا کہ حضرت ہی لیں گے، مجھے معلوم نہیں کہ شاہ صاحب ہی کے ذمہ اس سال اس امتحان کا معاملہ کر دیا گیا تھا، یا واللہ اعلم بالصواب، کوئی خاص اشارہ اس باب میں ان کو اربابِ حل و عقد کی طرف سے ملا تھا۔

بہر حال میری آنکھوں کے سامنے پہلی دفعہ ایسا معلوم ہوا کہ معنوی معصومیت کو دیدہ اور مرئی قالب میں ڈھال کر کسی نے رکھ دیا ہے۔ آنکھوں میں معصومیت چہرے پر معصومیت لبوں میں معصومیت، از سر تا پا ہمہ تن، حسن کردار کا مجسمہ، عفاف و استغناء، صفاء قلب اور تقویٰ کی ڈھلی ہوئی کوئی گڑیا، جو کچھ باہر میں ہے، وہی سب کچھ اندر بھی ہے۔ سنہرا دمکتا ہوا چہرہ، جس پر رونق و نضارت شادابی و ترو تازگی کھیل رہی تھی نثار ہو رہی تھی، داڑھی کے بال سیاہ حد سے زیادہ سیاہ زردی مائل سرخی کی جھلک کے ساتھ روئے انوری کے رنگ کا ایک جاں بخش، دل آویز نظارہ میری نگاہوں کے سامنے آیا، حضرت الاستاذ الامام کے شباب کا زمانہ تو شاید نہ تھا، غالباً چالیس سے اس وقت عمر مبارک متجاوز ہو چکی ہوگی، لیکن آب و رنگ کی تازگی و شادابی ایسی تھی کہ ہزارہا شبابی مظاہر

Toobaa-elibrary.blogspot.com

اس پر نثار تھے، غالباً چھوٹی سی دستی میز پر کتاب تھی، یہ میر زاہد رسالہ تھا، شاہ صاحبؒ نے کتاب کھولی، وہ کتاب کھول رہے تھے اور میرے جسم پر رعشہ طاری تھا، پیشانی پسینہ سے شرابور، کانپ رہا تھا، دیکھئے کہاں سے پوچھتے ہیں! کیا پوچھتے ہیں؟ شاید ابتدائی اوراق ہی میں، خیال آتا ہے "تحقق کل فرد منہ، بعد تحقق الموصوف" کے الفاظ سے "العلم المتجدد" کی تعریف میر زاہد نے جو کی ہے، دریافت فرمایا گیا کہ اس عبارت کا مطلب بیان کرو، یہ وہی مقام تھا جس کے مالہ و ماعلیہ کے پڑھنے میں تقریباً ایک مہینہ ٹونک کی درسگاہ میں صرف ہوچکا تھا، میر زاہد کا منہیہ[1]، غلام یحییٰ کے حواشی، عبد العلی بحر العلوم العلاء کے اضافے مولوی عبد الحق خیر آبادی نے اپنے حاشیہ میں جو کچھ ان سب پر لکھا تھا، اور خود استاذ محترم کا ذاتی حاشیہ، اس مقام پر جو تھا، سب ہی کو گھونٹے ہوئے اور پیے ہوئے تھا، لیکن جواب تو وہ دے، جو اپنے آپ میں موجود بھی ہو، تین چار دن، یا کم وبیش ایک ہفتہ کے اس عرصہ میں جو دار العلوم کے احاطہ میں داخلہ کے اس امتحان سے پہلے گزرا تھا، حضرت شاہ صاحبؒ کے فضائل وکمالات، علمی تبحر، اور غیر معمولی معلومات ومخزونات کے ذکر سے دل اس حد تک مرعوب ہوچکا تھا، کہ جسوقت پوچھا گیا، مطلب بیان کرو، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کبوتر شاہین کے پنجوں میں آگیا ہے، نہ ہوش ہی باقی تھا اور نہ حواس۔ مجھے یاد نہیں کہ بدحواسی کے اس عالم میں منہ سے کیا اول فول، بے تکی باتیں بے ساختہ نکلیں ایک دو سوال ہی کے بعد کتاب بند ہوگئی اور اجازت اٹھ جانے کی عطا فرمائی

---

[1] مصنف اپنی تصنیف پر توضیحی حواشی جو چڑھا دیتا ہے، اسے مدرسی اصطلاح میں منہیہ کہتے ہیں، حاشیہ کے ختم پر عموماً منہ لکھ دیا جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے منہیہ نام پڑگیا (اعجاز)

گئی، جسوقت اٹھا، اس یقین کے ساتھ اٹھا کہ دار العلوم سے روانگی کا نظم کرلینا چاہیئے، داخلہ کے لئے جس قابلیت کی ضرورت مدرسہ کے قانون کی رُو سے ہے اس معیار پر جس حد تک کوئی کھوٹا ثابت ہوسکتا ہے، میں نے محسوس کیا کہ قسمت نے آج مجھے وہی ثابت کردیا، اٹھا، اور سفر کے خیال کو دماغ میں لے کر اٹھا، منہ خشک تھا، لب پر پپڑیاں تھیں، واپس ہوتے ہوئے، دوسرے ہم چشم طلباء کے خیال سے مصنوعی اطمینان کی کیفیت کو دل سے چہرے پر منتقل کرنے کی کوشش اترتے ہوئے سیڑھی کے زینوں پر کرتا رہا، نیچے اترا، ساتھیوں میں پہونچا دل کے خیال کو دل ہی میں دبائے رکھا، واقعہ کا علم ان لوگوں کو خود ہوجائیگا کہ داخلہ کی اجازت اس منحوس طالب علم کو دورے میں شریک ہونے کی نہیں ملی۔

بات بہت پرانی ہوچکی ہے، ہلکا ہلکا سا خیال اس کا بھی آتا ہے کہ میر زاہد رسالہ کے ساتھ غالباً ہدایہ اولین میں بھی میرا امتحان لیا گیا، ہدایہ اولین کا کچھ حصہ ٹونک میں اپنے پنجابی استاد (سمینہ ملتان) کے رہنے والے مولانا محمد اشرف[1] مرحوم سے خصوصی طور پر فقیر نے پڑھا تھا، ورنہ عام طور پر ہدایہ کے اولین

---

(۱) یہ بڑے دلچسپ بزرگ تھے۔ لاہور میں شاہی مسجد کے مدرسہ میں ان کی تعلیم پوری ہوئی تھی، مولانا غلام محمد صاحب پنجاب کے مشہور مدرس اپنے زمانہ میں تھے۔ انھیں سے کتابیں پوری کی تھیں، پنجاب کا خصوصی علم اس زمانے میں نحو تھا مولانا کی دستگاہ اس علم میں کافی تھی، ادب عربی اور ریاضی سے بھی خاصی مناسبت رکھتے تھے، مدرس ہونے اور کافی معمر ہونے کے بعد فلسفہ اور منطق پڑھنے کا شوق پیدا ہوا، ٹونک مولانا برکات احمدؒ کی خدمت میں حاضر ہوکر پھر طالب العلمی شروع کی، لیکن ان کے علم نے فوراً ٹونک میں ہی ان کو مدرس بنا دیا، مدرسہ خلیلیہ میں باضابطہ مدرس ہوگئے، پڑھتے بھی رہتے اور پڑھاتے بھی تھے، خاکسار نے مولانا مرحوم سے بہت فائدہ اٹھایا، ادب عربی کی (باقی بر صفحہ آئندہ)

Toobaa-elibrary.blogspot.com

درس نظامیہ کے نصاب میں شریک نہیں ہیں، جو حشر میر زاہد رسالہ کے امتحان کا میری نظر میں ہوا تھا۔ شاید وہی کچھ انجام ہدایہ اولین کے امتحان کا ہوا ہو، میر زاہد والی بات تفصیلاً اب تک یاد ہے مگر ہدایہ کا خیال کچھ مٹ سا گیا ہے۔

بہر حال امتحان کے قصہ میں جو کچھ گزری تھی، اُسے دل ہی میں دبائے، اور دار العلوم سے بوریا بستر اٹھا لینے کی اندرونی فکروں ہی میں الجھا ہوا تھا، کہ اچانک حکیم منظر حسن صاحب ہی نے غالباً یہ خبر سنائی کہ آپ کے امتحان کی بڑی تعریف ہو رہی ہے، اور داخلہ آپ کا دورہ میں منظور کر لیا گیا ہے۔ اب حافظہ یہاں سے کچھ جواب دے رہا ہے، تفصیلات پر نسیان و ذہول کے بادل چھائے ہوئے ہیں بعض باتوں کا خیال بھی آتا ہے، تو چاندنی کی اس روشنی کی طرح جو گھنگھور گھٹا کے کسی پھٹے ہوئے حصے سے اچانک نمودار ہوتی ہے، اور پھر چھپ جاتی ہے اور کیا کیا صورتیں، اس سلسلہ میں پیش آئیں، یاد نہ رہیں۔ بس اب اتنا یاد

ذحاشیہ صفحہ گزشتہ کا، نصابی کتابیں، حریری، متنبی، حماسہ، معلقہ سب انھیں سے پڑھیں، اور ریاضی، ہیئت، ہندسہ کی کتابیں بھی انھیں سے پوری کیں، جن کے دوبارہ دیکھنے کا پھر موقعہ نہ ملا۔ ان کی بے نفسی کا یہ حال تھا کہ درس کے کمرے میں تو وہ استاذ بن جاتے۔ اور ان کے طلبہ، طلبہ، لیکن وہاں سے نکلنے کے بعد طالب العلموں سے بھی فروتر اپنے آپ کو خیال کرتے اور طلبہ کے ساتھ ملنے جلنے میں اسی خیال کا اثر نمایاں ہوتا، بعد کو جب کوئی ان سے کسی کتاب کے پڑھنے کی خواہش کرتا، تو ان کی غایت نیک نفسی تھی کہ فقیر کا نام لیتے اور کہتے بھائی! گو وہ میرا شاگرد ہے۔ لیکن اب مجھ سے زیادہ ان کتابوں کو سمجھتا بھی ہے اور سمجھاتا بھی ہے۔ اسی کو راضی کرو، خوب پڑھائے گا، اللّٰھم ارحمہ واغفر لہٗ اب ان پاک طینت پیداواروں کو مسلمانوں کے گھروں میں ہم کہاں ڈھونڈھیں

ے آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

رہ گیا ہے کہ جس امتحان کے متعلق اپنی ناکامی کا قطعی یقین مجھ میں پیدا ہو چکا تھا، ثابت ہوا کہ وہ یقین نہیں صرف وہم تھا، اور حضرت الاستاذ العلامہ الکشمیری نے خاکسار کے داخلہ کی سفارش اس امتحان کے بعد فرمائی۔

Toobaa-elibrary.blogspot.com

باب ۵

دورۂ حدیث میں باضابطہ شرکت

کتابیں مل گئیں، اور کچھ دن کے بعد غالباً شوال کی ۲۰ر۲ر سے باضابطہ درس، دورہ کا جاری ہو گیا، دیوبند میں تعلیم پانے والے تو دورہ کی اصطلاح سے واقف ہی ہیں، لیکن جن کے لئے مدرسہ کی یہ اصطلاح اجنبی ہو، انکے لئے اتنی بات کہہ دینی چاہیئے کہ صحاح ستہ، حدیث نبوی کی مشہور مسلمہ کتابوں کو ایک ہی سال میں بطریقہ سرد پڑھانے کا قاعدہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی مدینہ منورہ سے سیکھ کر ہندوستان تشریف لائے، اور اسی طریقہ درس کو۔ آپنے جاری کیا، طریقہ یہ تھا کہ حدیثوں کے معانی ومطالب مشکلات وغیرہ کے متعلق

جو کچھ پڑھانا ہوتا، وہ مشکوٰۃ شریف میں پڑھا دیا جاتا، شاہ ولی اللہؒ کا تو قاعدہ تھا کہ ایک دن مشکوٰۃ کی حدیثیں پڑھاتے، اور دوسرے دن، ان ہی حدیثوں کے متعلق علامہ طیبی کی شرح کا درس طلبہ کو دیتے، اس طرح سے مشکوٰۃ جب ختم ہو جاتی تھی، تب دوسرے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحاحِ ستہ کی حدیثوں کی سند کو متصل کرنے کے لئے مشکوٰہ ہی کی حدیثوں کو، جو اس میں بغیر سند کے پڑھائی گئی تھیں، اب سند کے ساتھ اس طور پر پڑھاتے تھے کہ طالب علم حدیثوں کو پڑھتا جاتا، اور استاد سنتا جاتا، بیچ بیچ میں خاص خاص اہم بات کا ذکر ضروری معلوم ہوا تو ذکر کر دیا گیا، یوں روزانہ پانچ ورق چھ ورق ہو جاتے حضرت شاہ صاحب نے حدیث کے درس کے اس طریقہ کا نام طریقۂ سرد رکھا ہے۔ لکھا ہے کہ مدینہ منورہ کے عام اساتذۂ حدیث کا یہی دستور اس زمانہ میں تھا جب وہ حدیث کا علم حاصل کرنے کیلئے ہندوستان سے سفر کر کے مدینہ منورہ پہونچے تھے، اسی سرد کے لفظ کا ترجمہ سمجھئے، یا زیادہ مانوس لفظ میں اسی کی تعبیر "دورہ" کے لفظ سے دارالعلوم دیوبند میں مشہور ہو گئی ہے

دارالعلوم میں تدریس حدیث کا انداز

شاہ ولی اللہؒ کے زمانے کے حساب سے دارالعلوم دیوبند والے دورہ یا طریقۂ سرد میں اتنی ترمیم اور کر دی گئی تھی کہ اہل حدیث کا نیا فرقہ ہندوستان میں جو اٹھ کھڑا ہوا تھا، اور حنفی مذہب کے متعلق یہ شہرت دینے لگا تھا کہ کلیۃً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے خلاف، امام ابوحنیفہ نے اپنے ذاتی قیاسات سے اسلامی شریعت کا ایک مستقل نظام قائم کر دیا تھا، اس مغالطہ کے ازالے کے لئے اکابر دیوبند میں سب سے پہلے حضرت مولانا گنگوہی نے حدیث کے درس میں اس التزام کا اضافہ کیا کہ حنفی مذہب کے جن مسائل کے متعلق فرقۂ

Toobaa-elibrary.blogspot.com

اہلحدیث نے مشہور کر رکھا تھا کہ صریح حدیثوں کے وہ مخالف ہیں ان کے اس الزام کا سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا جائے۔ دار العلوم دیوبند میں طریقۂ سرد کے ساتھ اس التزام کو باقی رکھا گیا۔ اور بحمد اللہ اب تک اس کا سلسلہ جاری ہے، اگرچہ وہ محاذ جو اہلحدیث طبقہ نے قائم کیا تھا، تقریباً ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو چکا ہے، لیکن مبادا پھر یہ فتنہ سر اٹھائے، دار العلوم میں اب تک تر و تازہ حالت میں درسِ حدیث کا یہ التزام زندہ و پائندہ ہے، اور جہاں تک میرا خیال ہے، اس کو اسی طرح جاری رکھنا چاہئیے کہ اس سے جامد تقلید کی تہمت کا ازالہ بھی ہوتا رہتا ہے اور ایک حنفی اپنے مسلک پر علمی بصیرت کے ساتھ قائم رہتا ہے۔

دین کے بنیادی سرچشموں کی طرف رُجوع

گذشتہ ادیان و مذاہب میں یہ حادثہ پیش آچکا ہے کہ بنیادی تعلیم سے ہٹتے ہوئے لوگ فروعی مباحث میں کچھ اس طرح منہمک اور مستغرق ہوگئے کہ بنیادی تعلیم کے سارے وثائق ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو کر رہ گئے، اسلام کی منجملہ دوسری خصوصیتوں کے ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ابتداء ہی سے کچھ ایسے قدرتی اسباب پیش آتے رہے، جن سے مذاہب و ادیان کے اس عام عارضہ کا ردِ عمل مسلسل ہوتا رہا، خدا خنک اور ٹھنڈی رکھے، امام شافعی کی قبر مبارک کو کہ دوسری صدی ہجری میں ہی سب سے پہلے وہی اس سلسلے میں چونکے، خطیب نے بغداد کی تاریخ میں نقل کیا ہے کہ امام مالکؒ اپنے استاذ کے حلقۂ درس سے فارغ ہو کر، امام شافعیؒ عباسیوں کے جدید دار السلطنت بغداد جب تشریف لائے، اور وہاں کی جامع مسجد میں اہل علم کی درسگاہوں کا جب آپ کو تجربہ ہوا، دیکھا کہ چالیس پچاس کے قریب حلقے قائم ہیں، لیکن جس حلقہ میں بھی پہونچتے وہاں نہ قال اللہ کا ذکر تھا اور نہ قال الرسول کا

بلکہ فرماتے تھے کہ

ھم یقولون قال اصحابنا (تاریخ بغداد ج ۲ ص ۶۱) ان میں ہر ایک یہی کہتا تھا کہ ہمارے اصحاب یعنی اساتذہ نے یہ کہا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام کی دینی حمیت کی رگ پھڑک اٹھی، اس طرزِ عمل کا جو انجام ہو سکتا تھا، وہ ان کے سامنے آگیا، اور ٹھیک جیسے اس زمانے میں ہر پارلیمانی مجلس میں ایک اپوزیشن پارٹی بھی قائم ہو جاتی ہے، اور نہیں ہوتی تو ایسی صورتیں نکالی جاتی ہیں کہ ارکان پارلیمان کی لگام کھینچنے کے لئے کسی نہ کسی طرح مخالفانہ تنقید کرنیوالوں کی ایک ٹولی پیدا ہو جائے، کچھ اسی نوعیت کی خدمت حضرت امام شافعی سے بن آئی، انھوں نے بھی اپنا حلقہ بغداد ہی کی جامع مسجد میں قائم فرمایا، اور بجائے اصحابنا کہنے کے قال اللہ و قال الرسول سننے کا عادی لوگوں کو آپ نے اس طرح بنا دیا کہ خطیب نے اسی موقع پر نقل کیا ہے حتیٰ ما بقی فی المسجد حلقۃ غیرہ (یہاں تک کہ مسجد میں امام شافعی کے حلقہ کے سوا کوئی دوسرا حلقہ باقی نہ رہا)

اس سلسلہ میں امام شافعی میں فرض کا احساس شدت پذیر ہوتے ہوتے اس حد تک پہونچ گیا تھا کہ اس راہ میں اپنے استاذ امام مالکؒ کے احترام کی بھی دیکھا گیا کہ ان کو پرواہ نہ ہوئی بیہقی کا بیان ہے کہ۔

> امام شافعی کو جب اس کی اطلاع ملی کہ امام مالکؒ کے تلامذہ بجائے یہ کہنے کے اللہ نے یہ فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے، عموماً اپنے حلقوں میں یہ کہتے ہیں کہ امام مالک کا قول یہ ہے، تو میں نے ایک سال تک استخارہ کیا، اسکے بعد میں نے اعلان کیا کہ امام مالک جو کچھ بھی ہوں، بہر حال آدمی تھے، اور آدمی سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔"

Toobaa-elibrary.blogspot.com

بیہقی نے اس قصہ کو نقل کر کے آخر میں لکھا ہے کہ

فدعاہ ذالک الی تصنیف الکتاب فی اختلافہ معہ (توالی التاسیس) صہ۷۲	اور اسی احساس نے امام شافعی کو آمادہ کیا کہ امام مالک کے مقابلہ میں کتاب تصنیف کریں

اس معاملہ میں امام شافعی کا جو حال تھا، اس کا اندازہ اس قسم کی روایتوں سے بھی ہوتا ہے، توالی التاسیس میں حافظ ابن حجر نے نقل کیا ہے کہ کسی نے امام شافعی سے کوئی مسئلہ دریافت کیا، جواب میں آپ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اس مسئلہ میں یہ ہے، لیکن پوچھنے والا لوگوں کا بگاڑا ہوا تھا۔ اُسنے کہا آپ فرمائیے کہ اس باب میں آپ کی کیا رائے ہے، اس کے منہ سے یہ الفاظ نکل رہے تھے، اور امام شافعیؒ کا خون کھول رہا تھا، اپنی بات پوچھنے والے نے جب ختم کی تو وہ سن رہا تھا کہ امام کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکل رہے ہیں۔

"بھلے آدمی! تو نے کیا میری کمر پر زنار دیکھا، یا کسی گرجے سے نکلتے ہوئے مجھے کبھی دیکھا ہے، میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ رسول اللہ ؐ نے یہ فرمایا، اور تو پھر پوچھتا ہے کہ میری رائے کیا ہے (توالی التاسیس صہ۶۳)

سچ تو یہ ہے کہ حضرت امام شافعی نے اسلام کی ابتدائی صدیوں میں مسلمانوں کو اسلام کے بنیادی وثائق "الکتاب والسنۃ" کی طرف واپس لے جانے کا رواج قائم فرمادیا، میرا تو خیال یہی ہے کہ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے انہی کی آواز بازگشت اسلامی ممالک میں گونجتی رہی، جب کبھی دین کے حقیقی سرچشموں (کتاب وسنت) سے مسلمان کسی ملک میں دور ہوئے، تو اپوزیشن پارٹی (حزب الاختلاف) کسی نہ کسی شکل اور نام سے عموماً نکل پڑی ہے، اور اپنے تنقیدی ہنگاموں سے مسلمانوں کو ہمیشہ مجبور کرتی رہی ہے کہ

"کتاب وسنت پر پیش کر کے پھر اس دستور کو جانچ لیں، جس کی پیروی وہ دین کے نام سے کر رہے ہیں"

اسلامی علماء کی اس اپوزیشن پارٹی کے مشہور سرگرم ممبر حافظ ابن حزم اندلسی جو ظاہریوں کے ممتاز پیشواؤں میں شمار ہوتے ہیں، انکے زمانے میں بھی یہی صورت پیش آئی تھی، ابوبکر ابن العربی صاحب احکام القرآن وشارح ترمذی نے اپنی کتاب العواصم والقواصم میں لکھا ہے کہ ایک ایسا وقت بھی اندلس کے مسلمانوں پر آ گیا تھا کہ جو مالکی مذہب کے پیرو تھے، قرآن وحدیث یعنی الکتاب والسنۃ تو دور کی بات تھی، ابن العربی کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے کہ

"لوگوں نے امام مالک اور ان کے جلیل القدر تلامذہ کا ذکر بھی ترک کر دیا تھا، بلکہ عام رواج یہ ہو گیا تھا کہ فتویٰ دیتے ہوئے لوگ کہتے "قرطبہ والے یہ کہتے ہیں"، "طلمنکہ کے مولویوں کا یہ خیال ہے"، "طلیطلہ کے علماء کا یہ قول ہے"

ابن العربی کے آخری الفاظ یہ ہیں۔

"فانتقلوا من المدینہ وفقھاءھا الی طلبیرہ وطریقھا	لوگ مدینہ اور مدینہ کے فقہاء کو چھوڑ کر طلبیرہ اور طلبیرہ کے راستے پر چل پڑے تھے

(العواصم والقواصم صہ۲۴۱)

قرطبہ، طلیطلہ، طلبیرہ، یہ اندلس کے ان شہروں کے نام ہیں، جو ابن حزم کے زمانے میں دینی علوم کی مرکزیت میں غیر معمولی شہرت حاصل کئے ہوئے تھے گویا اس زمانے میں ہندوستان کے اندر دیوبند، سہارنپور، فرنگی محل، بریلی، بدایوں، دہلی وغیرہ شہروں کا جو حال ہے، یا یوں سمجھئے کہ ہندوؤں میں کاشی متھرا، ہردوار، پریاگ جیسے مذہبی مقامات کی جو نوعیت ہے، یہی کچھ نوعیت

Toobaa-elibrary.blogspot.com

اندلس کے ان شہروں کی مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں تھی، حافظ ابن حزم اور ان کے ماننے والوں کو جہاں تک میرا خیال ہے، مذہب کی آزاد تنقید پر بغیر کسی رو رعایت کے اسی حال نے آمادہ کیا۔

اور دور کیوں جائیے، خود ہمارے ملک ہندوستان کو بھی، اس زمانہ میں جب مسلمانوں نے اس کو اپنا وطن بنایا تھا، اور ان وطن بنانے والوں میں زیادہ تعداد خراسان اور ماوراء النہر وغیرہ علاقوں کے مسلمانوں کی تھی، انکی دینی ذہنیت کا اندازہ اس مشہور تاریخی مناظرہ سے ہوتا ہے، جو غیاث الدین تغلق کے دربار میں مسئلہ سماع پر ہوا تھا، ایک طرف خراسان اور ماوراء النہر کے نووارد مولوی تھے، جو ہندوستان پہونچ کر شیخ الاسلامی اور قضاء و افتاء کے عہدوں پر سرفراز تھے، اور دوسری طرف صوفیوں کے سرخیل اور امام حضرت سلطان جی نظام الدین اولیاء تھے، مسئلہ جب چھڑا اور سلطان جی کی طرف سے بجائے فقہ کی کسی کتاب کے صحیح مسلم وغیرہ جیسی حدیث کی کتابوں کی روایتیں پیش ہونے لگیں، جن سے جوازِ سماع کا پہلو پیدا ہوتا تھا، تو خود سلطان جی کا مشہور بیان ہے، کتابوں میں یہ فقرے آپ کی زبانی نقل کیے گئے ہیں کہ مناظرہ کی مجلس سے اٹھ کر جب اپنے لوگوں میں سلطان جی تشریف لائے، تو فرمایا کہ

"درمعرضِ حجت احادیث صحیح حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نمی شنوند و ہمیں گویند کہ در شہر ما روایتِ فقہ مقدم ست بر حدیث	یعنی مقابلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیثوں کو یہ خراسانی مولوی نہیں سنتے تھے، اور یہی کہے چلے جاتے تھے کہ ہمارے شہر دہلی میں حدیث کے مقابلہ میں فقہ کی
(سفرنامہ ضیاء الدین برنی)	

روایتوں کو ترجیح دیجاتی ہے"

ایک نئی علمی ہلچل

خیر میں کہاں کی ہانکنے لگا، غرض یہ کہ رہا تھا کہ مغلوں کے زوال کے بعد جب سلطنت کا دباؤ اٹھ گیا اور براہِ راست اس کے بعد دلوں میں اس قسم کے خیالات پیدا ہوئے، یا پیدا کرنیوالوں نے مختلف ہتھکنڈوں سے کام لیکر مسلمانوں میں انتشار و افتراق کی وبا پھیلانے کیلئے ان خیالات کو پیدا کر دیا، جن میں ایک حادثہ یہ بھی تھا کہ ہندی مسلمانوں کی دینی زندگی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے مخالف ثابت کرنے کی کوشش ملک کے مختلف گوشوں میں جاری ہوئی، اور ان مسلمانوں کے پیشوا و امام حضرت امام ابوحنیفہ کو لعن و طعن کا نشانہ چاروں طرف سے بنا لیا گیا تھا، تو گو بذاتِ خود اس تحریک کو آپ جو کچھ بھی قرار دیں، لیکن خیر کا بہترین پہلو اس شر سے یہ نکل آیا کہ جس ملک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں سے زیادہ فقہاء کے اقوال اور فتووں کو اہمیت دینے کا دستور چلا آرہا تھا، اس میں ایک نئی علمی ہلچل پیدا ہو گئی، اور حنفی علماء کے ایک طبقہ نے سنجیدگی کے ساتھ واقعی حنفی مذہب کے مسائل کا کتاب و سنت سے بغیر کسی جانبداری کے مقابلہ کر کے جائزہ لینا شروع کیا، انکی سعی اس بارے میں مشکور ہوئی، اور امام ابوحنیفہ کے خلاف بہتان کا جو طوفان اٹھایا گیا تھا، انکی کوششوں سے خدا خدا کر کے بیٹھ گیا، انھوں نے حنفی مذہب کے ایک ایک جزئیہ کے متعلق احادیث و آثار کا ذخیرہ جمع کر کے رکھ دیا، کتابیں بھی لکھی گئیں، لیکن کتابوں سے زیادہ موثر اور کارگر مفید طریقہ اس راہ میں حدیثوں کے درس کا دیوبندی طریقہ ثابت ہوا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ بلاخوفِ تردید ہم کہہ سکتے ہیں کہ حنفی مذہب کا کوئی ایسا جزئیہ نہیں نکالا جا سکتا جس کے متعلق آپ کو دیوبندی درس کے پڑھے ہوئے مولوی حدیث"

Toobaa-elibrary.blogspot.com

اور آثارِ صحابہؓ سے تائیدی مواد نہ پیش کر سکتے ہوں، باتیں عام ہوگئیں، اور ہر ہر وجہ تک ان باتوں کو درس کے اس عام طریقہ نے پہونچا دیا، اب ایک حنفی، حنفی مذہب پر جو عمل کرتا ہے، وہ صرف امام ابوحنیفہ کا فتوی ہی اور ان کی رائے ہی نہیں، بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی جانتا ہے کہ یہی اقتضا فلاں فلاں حدیثوں کا بھی ہے، اور یہی طرزِ عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا تھا، یعنی یہ طریقہ ان بزرگوں کا ہے جن کا ذکر کرتے ہوئے قرآن میں فرمایا گیا تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ (سورۃ الفتح) تو دیکھتا ہے ان لوگوں کو رکوع کرتے ہوئے سجدے کرتے ہوئے، ڈھونڈھتے ہیں وہ اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کو، صلاح کے نشانات جھلکتے ہیں ان کے چہروں پر سجدوں کے اثر سے)

بھلا قرآن میں جن کی نمازوں اور جن کے رکوع، جن کے سجود کی تعریف کی گئی ہو، حرف گیری کی انھیں کے متعلق گنجائش ہی کیا باقی رہتی ہے۔

الغرض حدیث کے درس کے اس دیوبندی طریقے نے مسلمانانِ ہند کے دینی تعلقات کو دین کے اصل سرچشموں اور حقیقی بنیادوں (الکتاب و السنۃ) کے ساتھ وابستہ کر کے نئے سرے سے پھر ترو تازہ اور شگفتہ کر دیا اور انکی تقلید کے اسی تحقیقی پہلو نے اِتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ (بنالیا یہود و نصاریٰ نے اپنے علما و مشائخ کو اللہ کے سوا رب) کی قرآنی لعنت سے، ان کو ان کے دین کو بحمد اللہ محفوظ کر دیا، اور یہی میں کہنا چاہتا تھا، درس حدیث کی اس خصوصیت کو جب تک زندہ رکھا جائے گا، اور وہی اہمیت اس کو حاصل رہی۔ جو پچھلے دنوں تھی، اور اسوقت تک جہاں تک میں جانتا ہوں کسی قسم کی لاپروائی اس سے اختیار نہیں کی گئی ہے۔ تو مسلمانانِ ہند کی دینی زندگی، قرآنی لعنت کے اس زہر سے انشاء اللہ پاک ہے گی واللہ ولی التوفیق

دورۂ حدیث کا آغاز

میں قلم روک رہا ہوں، مگر رک نہیں رہا ہے، مفید خیالات سامنے آتے چلے گئے، میں بھی لکھتا ہی چلا گیا ورنہ ذکر تو اس کا ہو رہا تھا کہ ۱۳۳۱ھ کے ماہ شوال کی ۱۰ ہر یا ۲۲ تاریخ . یا اس کے قریب قریب کسی تاریخ میں جہاں تک مرا حافظہ مجھے یاد دلا رہا ہے، دورۂ حدیث کے اسباق کے آغاز کی خبر مجھ تک پہونچی، اب یہ یاد نہیں رہا کہ باضابطہ کسی نوٹس کے ذریعے یا اطلاع شائع ہوئی تھی یا افواہاً یہ خبر طلباء میں پھیل گئی۔ زیادہ احتمال دوسری صورت ہی کا ہے، فقیر بھی دورہ کے دوسرے طلباء جن کی تعداد صحیح طور پر تو محفوظ نہ رہی، مگر تیس اسی کے درمیان غالباً ہوگی (۱۳۳۱ھ کے داخلہ کی تعداد اس سال کی روداد میں مل سکتی ہے) بہر حال ابتک بمشکل دس پندرہ سے زیادہ ساتھیوں کے ساتھ پڑھنے کا موقع ساری زندگی میں جسے نہیں ملا تھا۔ اسی کے لئے طلباء کے اس جم غفیر کے گویا میلے جھمیلے میں پڑھنے کا بالکل نیا تماشہ اور نیا تجربہ تھا۔ اس میں تو یوپی، بہار کے سوا بنگال، پنجاب، سرحد، کشمیر، کابل، قندھار، بخارا اور غالباً چینی ترکستان، کاشغر وغیرہ کے طلباء تھے۔

Toobaa-elibrary.blogspot.com

باب ۶

امام العصر علامہ سیّد انور شاہ کشمیری کے درس میں

بہر حال یوں ہی اب صحیح طور پر یاد نہیں رہا کہ ہفتہ یا ہفتہ سے زیادہ دن گزرے کہ درس کا اعلان ہوا معلوم ہوا کہ کل سے دورہ کے اسباق شروع ہوں گے کتابیں جن کے اسباق شروع ہونیوالے تھے۔ کتب خانہ سے برآمد کرلی گئی تھیں، صبح کی نماز کے بعد ہی معلوم ہوا کہ سب سے پہلے حضرت سیدنا الامام الکشمیری کے یہاں صحیح مسلم کا سبق شروع ہوگا، طلباء کا ہجوم تھا۔ انہی کے جھمیلے میں خاکسار بھی نودرہ کی چھت کے شمالی سمت پر جو ایک کمرہ تھا، اس میں حاضر ہوگیا، اتنی بڑی تعداد والی جماعت میں شریک ہوکر بیٹھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا، خیال آتا ہے کہ صحیح مسلم کا اتفاقاً وہی نسخہ مجھے کتب خانہ سے ملا تھا، جو طول و عرض میں حدیث کی دوسری کتابوں کے مقابلہ میں غیر معمولی طور پر ممتاز تھا۔ لیکن کرتا کیا، اسی طویل و عریض کتاب کو لیکر کوٹھے پر چڑھ گیا، درس کے کمرے میں لکڑی کی چھوٹی چھوٹی تپائیاں رکھی ہوئی تھیں، طالب علموں نے انھیں تپائیوں پر قبضہ کرلیا، ایک تپائی میرے حصّہ میں بھی آگئی

خیال تھا کہ جیسے عام طور پر ہمارے مدارس کا دستور ہے، طلباء کتاب کی عبارت پڑھیں گے، اور حضرت شاہ صاحب پھر اس عبارت کا مطلب بتائیں گے

لیکن پہلی مرتبہ درس کے ایک نئے طریقے کے تجربہ کا موقع میرے لئے یہ تھا کہ بسم اللہ بھی کتاب کی شروع نہیں ہوئی تھی کہ علم کا ایک بحر بیکراں بلا مبالغہ عرض کر رہا ہوں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میرے دل و دماغ کے ساحلوں سے ٹکرانے لگا، ایسے اساتذہ (غفر اللہ لہم) سے پڑھنے کا موقع ملا تھا، جو کتاب کو شروع کراتے ہوئے غیر ضروری طور پر اس قسم کی عام باتوں کا تذکرہ عموماً کیا کرتے ہیں کہ مصنّف نے خدا کی حمد سے کتاب کیوں شروع کی، اور اسی عام سوال کو اٹھا کر، اس کا جو مقررہ جواب کتابوں میں لکھا ہے، لفظوں کے الٹ پھیر سے دہرانے کی عادی تھے۔ صلوٰۃ کی شرح، مختلف امور کیطرف اس لفظ کا انتساب اس کے معانی میں کن تبدیلیوں کو پیدا کرتا ہے، الغرض مسلمان مصنفوں کی کتابوں کے دیباچہ کے عمومی اجزاء کے متعلق سوال و جواب، رد و قدح کا موروثی سرمایہ، حواشی و شروح میں جو منتقل ہوتا چلا آرہا ہے، اسی کو غریب طالبعلموں پر پیش کر کے اپنی علمی وسعت کو ظاہر کرتے تھے لیکن الامام الکشمیری نے قبل اس کے کہ کتاب کا کوئی لفظ بھی شروع ہوا ہو، ایک خاص قسم کی دلکش ترنم آمیز آواز میں تقریر شروع کی، کس کس موضوع سے اس تقریر کا تعلق تھا، تقریباً چالیس سال کے بعد اس کا دہرانا آسان نہیں ہے، لیکن بعض انقلابی تاثرات کا نشان حافظہ پر جہاں تک خیال کرتا ہوں، اب بھی باقی ہے

شاہ صاحب کے درس کے انقلابی تاثرات

جاننے والے جانتے ہیں کہ صحیح مسلم کی خصوصیت یہ ہے کہ بطور مقدمہ کے شروع کتاب میں امام مسلم نے حدیث کے بعض بنیادی کلیات، اور اساسی اصول و نظریات کی طرف سیدھے سادے الفاظ میں ایسے بلیغ و عمیق اشارے کئے ہیں، جن کے صحیح وزن کو فن سے ناواقف آدمی محسوس نہیں کرسکتا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ امام مسلم کے بعد یوں تو اصول حدیث میں بڑی چھوٹی بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں،

Toobaa-elibrary.blogspot.com

لیکن باوجود اس کے امام مسلم کے مقدمہ میں اب بھی پانیوالے، اس علم کے ایسے اہم نکات اور حقائق کو پاتے ہیں، یا پا سکتے ہیں، جو شاید دوسری کتابوں میں نہیں مل سکتے۔ حق تعالیٰ کے افضال بے پایاں میں ایک بڑا فضل اس شوریدہ بخت سیاہ کار کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ حدیث ہی نہیں بلکہ اصولِ حدیث کے ان چند اوراق کے پڑھنے ہی کا نہیں، بلکہ ان اوراق پر ایک امام کے عالمانہ خطبات کے سننے کا شرف اس بے بضاعت کے لئے آسان کیا گیا، پہلے ہی سبق میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برسوں میں حاصل ہونیوالے معلومات یکایک میرے سامنے آگئے، اس وقت تک میرا تأثر یہ تھا کہ قرآن کے سوا بجز چند گنی چنی روایتوں کے صاحب شریعت کی طرف قطعی یقین اور کامل اطمینان کے ساتھ کسی امر کا انتساب نہیں کیا جاسکتا، گویا دین کا اکثر حصہ صرف ظنّی، اور یقین کی قوت سے محروم ہے، لیکن یہ پہلا دن تھا جب میرے کانوں نے اسناد والے تواتر کے سوا، تواتر طبقہ، تواترِ عمل، تواترِ قدرِ مشترک کی نئی قسموں کو سنا، سمجھایا گیا کہ چند روایتوں کے متعلق جس تواتر کا دعویٰ عام کتابوں میں کیا جاتا ہے، یہ دعویٰ صرف اسناد والے تواتر کی حد تک محدود ہے، ورنہ دین کا بڑا اہم حصہ تواتر طبقہ، تواترِ عمل اور تواترِ قدرِ مشترک کی راہ سے منتقل ہوکر مسلمانوں کی پچھلی نسلوں میں اگلی نسلوں سے پہونچا ہے، اور تواتر کی ان تمام قسموں میں یقین آفرینی کی وہی نفسیاتی اور منطقی قوت ہے جو قوت اسناد والے تواتر میں پائی جاتی ہے (۱)

---

(۱) واقعہ یہ ہے کہ سند کی کثرت اور راویوں کے تعدد کی ضرورت عموماً انہی باتوں میں ہوتی ہو جو روایات کی راہ سے منتقل ہوتی ہوں لیکن ایسی بات کہ شاہجہاں بادشاہ ہندوستان کا حکمراں تھا، سکندر نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا، اس قسم کے واقعات کے متعلق یہ تلاش کرنا کہ روایت کرنیوالے ان کے کون ہیں جنون کے سوا اور کچھ نہیں ہو (باقی برصفحہ آئندہ)

پہلا دن تھا، جس میں قرآن کے بعد دین کا سارا بنیادی نظام میرے لئے قطعی و یقینی ہوگیا، اور جیسے جیسے تمیز و شعور میں سن کے لحاظ سے اضافہ ہوا، بجائے گھٹنے کے میرا یہ تأثر گہرا ہی ہوتا چلا گیا، خاکسار نے اپنی مختلف کتابوں اور مقالات میں، امام کشمیری کی عطا کی ہوئی اس روشنی سے استفادہ کیا، مسلمانوں کے دینی اختلافات کی نوعیتوں میں تمیز کا سلیقہ اسی انوری تحقیق سے پیدا ہوا۔

نئی تعبیرات، نئے الفاظ

حضرت شاہ صاحب یوں تو فطرۃً ادیب تھے، اسی لئے اردو زبان جو ان کی مادری زبان نہ تھی، چاہتے تو اس زبان کے بہترین ادیب و خطیب کی شکل میں اپنے آپ کو نمایاں فرما سکتے تھے، لیکن مسلسل عربی کتابوں کے مطالعہ اور ادب عربی کی دوامی مزاولت کا اثر تھا کہ زبان مبارک پر عربی زبان کے الفاظ ہی زیادہ تر چڑھ گئے تھے، بلکہ طریقہ بیان بھی آپ کا عربی طرز بیان سے زیادہ متاثر

(حاشیہ صفحہ گذشتہ کا بقیہ) اسی طرح اس قسم کی باتیں کہ مسلمانوں پر مثلاً پانچ وقتوں کی نمازیں فرض ہیں، عرب میں الکعبہ نامی عمارت کا حج فرض ہے، سال میں رمضان کا مہینہ جب آئے، تو روزہ مسلمانوں کو رکھنا پڑتا ہے۔ یہ ایسی باتیں ہیں جنھیں مسلمان ہی نہیں، جو مسلمان نہیں ہیں، انکے نزدیک بھی اسلام کے یہ یقینی عناصر ہیں۔ یہی تواترِ عمل کی مثالیں ہیں، اسی طرح حاتم کی سخاوت، رستم کی شجاعت کے جو قصے مشہور ہیں، ان قصّوں کا یقینی ہونا تو ضروری نہیں ہے، لیکن ان قصّوں کے قدرِ مشترک کے ہونے میں کون شبہ کرسکتا ہے حضرۃ الاستاذ العثمانی مولانا شبیر احمد صاحب نے بھی صحیح مسلم میں تواتر کی ان قسموں کا ذکر کرکے اعتراف کیا ہے کہ پہلی دفعہ مولانا انور شاہ سے یہ بات سننے میں آئی۔

★

Toobaa-elibrary.blogspot.com

تھا، اسی کا نتیجہ تھا کہ گو تعلیمی و تدریسی زبان آپ کی اردو تھی، لیکن عربی زبان کے ایسے الفاظ جو اردو میں عموماً مستعمل نہیں ہیں، اضطراراً آپ کی زبان مبارک سے مسلسل نکلتے رہتے تھے تواتر کے مذکورہ بالا اقسام چہارگانہ کو بیان کرتے ہوئے شاہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی زبان مبارک سے پہلی دفعہ میں نے طبقۃً بعد طبقۃٍ کے عام الفاظ کے ساتھ جیلاً بعد جیلٍ کے الفاظ سنے تھے، اس کی غرابت کا احساس اب بھی میرے حافظہ میں زندہ ہے، شاید اسی موقع پر "الکافۃ عن الکافۃ" یا الکواف عن الکواف" ابن حزم کی مخصوص اصطلاح بھی سننے میں آئی۔

اسی قسم کے غیر مشہور، یا اُردو زبان میں جو الفاظ عربی کے مروج نہ تھے، انکے استعمال کرنے کی غرض ممکن ہے کہ یہ بھی ہو کہ عام مسلمانوں کو نہ سہی لیکن عربی مدارس کے طلباء کا ان الفاظ سے مانوس ہونا، ان کی شان کے مناسب تھا، اور شاہ صاحب شاید اس طریقہ سے طلباء کو ان عالمانہ اصطلاحات و تعبیرات سے مانوس بنانا بھی چاہتے تھے

مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک دفعہ شاہ صاحب نے ان غریب اصطلاحات کے استعمال کی توجیہ کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا تھا کہ بعض چیزیں دنیا میں ایسی ہیں جنکا ذکر کنائے اور اشارے ہی میں کرنا، عام انسانی تہذیب کا اقتضاء ہے، پھر یہ نکتہ بھی ان ہی سے سننے میں آیا، اور بالکل صحیح بات تھی کہ تراشنے والے ان چیزوں کی تعبیر کے لئے اچھے اچھے الفاظ تراش لیتے ہیں "پائین خانہ" مکان کے پچھلے حصے کو کہتے ہیں، پھر اس سے بیت الخلا، مراد لینے لگے، لیکن رفتہ رفتہ یہ لفظ پائخانہ کی شکل اختیار کر کے خود گندہ ہو گیا، فرماتے تھے کہ معانی کی گندگی رفتہ رفتہ الفاظ تک منتقل ہو کر پہونچ جاتی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ تھوڑے تھوڑے دن بعد اس قسم کے الفاظ پر نظر ثانی کی جائے، اپنے اسی خیال کے مطابق عورتوں کے ایام کی تعبیر وہ ہمیشہ "ایام طمث" استعمال کرنے کے عادی تھے، کیونکہ "حیض"

کا لفظ حالانکہ خود کنائی تعبیر ہے، لیکن کثرت استعمال نے اس کو بھی اس قابل نہیں رکھا کہ مہذب مجلسوں میں اس کے استعمال کو آئندہ جاری رکھا جائے۔

بہر حال پہلے دن کے درس میں علاوہ معانی کے نئے نئے عربی الفاظ کا ایک بڑا ذخیرہ بھی میرے دماغ میں شاہ صاحب کے درس کے اندر جمع ہو گیا۔

زبانِ عربی میں ضبطِ تقریر

ان کے بیان کی خصوصیت کا ایک غیر شعوری اثر مجھ میں یہ پیدا ہو رہا تھا کہ عربی زبان میں اب تک کسی مطلب کے ادا کرنے کی ہمت مجھے نہ ہوئی تھی لیکن سبق پڑھ کر جب قیام گاہ پر آیا، اور شاہ صاحب کے عطا کئے ہوئے گوناگوں معلومات کا جائزہ لینے لگا، تو یہ محسوس ہوا کہ اپنے کمزور حافظہ سے امید نہیں کہ ان بتائی ہوئی باتوں کو وہ یاد رکھے، اس لئے فیصلہ کیا کہ کل سے کاغذ پنسل ساتھ لیتا جاؤں گا اور ان کی تقریر کو قلم بند کروں گا، اور آج جو کچھ سن کر آیا ہوں قبل اس کے کہ وہ میرے حافظہ سے نکل جائے، اسے لکھ لینا چاہیئے۔ شاہ صاحب کی تقریر جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، اس کا اسلوب ہی ایسا تھا کہ بجائے اردو کے ان کے معلومات کا مجھے محسوس ہوا کہ عربی میں قلم بند کرنا شاید زیادہ آسان ہے، یہی سوچ کر جو کچھ آج سن کر آیا تھا، پنسل سے انکو عربی عبارت میں نوٹ کرنے لگا، اور پہلی دفعہ مجھے یہ اندازہ ہوا کہ غلط سلط سہی، لیکن ٹوٹی پھوٹی عربی میں مطالب کی تعبیر کی گویا صلاحیت مجھ میں بھی ہے، دار العلوم میں حدیث کی تقریروں کے قلم بند کرنے کا رواج نیا رواج نہ تھا، حضرت مولانا گنگوہی کی تقریر بعض لوگوں کے پاس مکتوبہ شکل میں پائی جاتی تھی، اسی طرح حضرت شیخ الہند کی بھی ترمذی والی تقریر متعدد بزرگوں کی مرتب کی ہوئی، طلباء میں پھیلی ہوئی تھی، لیکن میں جہانتک جانتا ہوں، حضرۃ الامام الکشمیری کی تقریروں کے قلمبند کرنیکا ارادہ شاید فقیر سے پہلے کسی صاحب نے نہ کیا تھا، یوں ہی عربی زبان میں حدیث کی تقریروں کی تعبیر

Toobaa-elibrary.blogspot.com

کی روایت مجھ تک نہیں پہونچی تھی، خدا کا شکر ہے کہ اس فقیر کے بعد، اس سے کہیں زیادہ لائق وفائق، قابل وفاضل، مستعد اور جفاکش محنتی طلبہ حضرت شاہ صاحب کے ارد گرد جمع ہو گئے، جنھوں نے اپنی زندگی کا نصب العین ہی یہ قرار دیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو، معارف الانوریہ کے اس بحرِ بیکراں کو قید تحریر میں لانے کی کوشش کیجائے، مولانا بدر عالم میرٹھی، اور مولانا محمد یوسف البنوری دمتعنا اللہ بطول بقائہما[1] کے سوا پنجاب کے ایک بزرگ مولانا محمد چراغ جامع تقریر ترمذی، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے سوا سنن ابی داؤد اور ابن ماجہ کے متعلق بھی حضرت شاہ صاحب کے درسی افادات کے جمع کرنے کی توفیق خاکسار کے بعد مختلف افراد کو بخشی گئی، جہاں تک میں جانتا ہوں، ان صاحبوں نے بھی بجائے اردو کے عربی زبان ہی کو تعبیر کے لئے اختیار فرمایا، جیسا کہ میں نے عرض کیا حضرت شاہ صاحب کے طرز بیان اور طریقہ تدریس کی نوعیت کچھ ایسی تھی، کہ اردو سے زیادہ عربی زبان ہی میں ان کی تقریروں کا قلم بند کرنا آسان معلوم ہوتا تھا، نہیے رہتیں ہو، یا از قبیل اردو کے عام افعال کے سوا الفاظ کا بڑا ذخیرہ ان کی تقریروں میں عربی کا ہی ہوتا تھا، کم از کم فقیر کا احساس تو یہی ہے، اور اسی چیز نے خود مجھ میں یہ جسارت پیدا کی کہ پہلے عربی عبارت کے لکھنے کی مشق وعادت کا موقع حالانکہ اپنی تعلیمی زندگی میں نہ ملا تھا، لیکن الامام الکشمیری کے صف نعال میں شریک ہو جانے کا اثر تھا کہ روزانہ تین تین چار چار ورق بلکہ کبھی اس سے بھی زیادہ برجستہ قلم عربی میں انکی تقریروں کو لکھ لیا کرتا تھا

نوشتہ درس کی گمشدگی

اس کا افسوس ہے کہ ظلم کرنے والوں نے

(۱) دونوں بزرگ وفات پا چکے ہیں۔ رحمہا اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

مجھ پر ظلم کیا، اور زندگی کے اس مسودہ کو، جو جان سے زیادہ عزیز تھا، کسی صاحب نے اس سے مجھے محروم کر دیا، جب اس کا خیال آتا ہے تو بے ساختہ حضرت مجددؒ کے مکتوبات شریفہ کا مشہور شعر ؎

آنچہ از من گم شدہ گر از سلیماں گم شدے
ہم سلیماں، ہم پری، ہم اہرمن بگریستے

(جو کچھ مجھ سے گم ہوا ہے، اگر وہ سلیمان سے گم ہوا ہوتا، تو سلیمان بھی، پری بھی، اور دیو بھی سب رو پڑتے)

یاد آتا ہے۔

میرے پاس زمانے تک کئی سو صفحات کی یہ تقریر موجود تھی، جلد بندھوائی گئی تھی، حضر سفر میں ساتھ رہتی تھی، اچانک ایک دن تلاش کرنے پر معلوم ہوا کہ کسی نے اڑا لی۔ فقیر کے رفقاء درس میں سے دو صاحب ایک تو بخارا کے ملا عبد الحکیم اور دوسرے دربھنگہ کے مولانا عبد الرحیم دونوں التزاماً میری مرتبہ تقریر کو روزانہ نقل کر لیا کرتے تھے، اور ان دونوں کے پاس بھی مجلد شکل میں یہ تقریر موجود تھی، بخاری صاحب بیچارے کے متعلق تو یہ بھی معلوم نہیں کہ کہاں ہیں، اس دنیا میں ہیں بھی، یا عالم آخرت کی طرف منتقل ہو گئے، اکثر فرمایا کرتے تھے کہ جب بخارا جاؤں گا تو یہی تقریر تیری یاد کو تازہ رکھے گی، بڑے نیک شریف بزرگ تھے یہ گذر پلاؤ" کبھی کبھی خوش ہو کر خاص فقیر کے لئے پکاتے تھے، بڑا لذیذ پلاؤ ہوتا تھا، اور یہ بھی معلوم نہیں کہ مولانا عبد الرحیم صاحب کے پاس بھی وہ تقریر محفوظ ہے یا نہیں شاید ستار العیوب کا لطفِ خفی بھی اس تقریر کے گم ہونے میں کارفرما ہو کیوں کہ لکھنے کی حد تک فقیر نے لکھ ضرور لیا تھا، لیکن معنوی اور لفظی غلطیوں کے انبار کے سوا جہاں تک میرا اندازہ ہے شاید وہ نوشتہ اور کچھ نہ تھا، اور نہ اس کے سوا کچھ اور ہو سکتا تھا، کون کہہ سکتا ہے کہ اپنی رسوائی اس کے باقی رہ جانے کی

Toobaa-elibrary.blogspot.com

صورت میں کیسی اور کہاں تک پہونچتی)

سچ تو یہ ہے کہ فقیر کے بعد ترمذی اور بخاری شریف کی املائی شرح فیض الباری مرتبہ مولانا بدر عالم میرٹھی اور اس کے ساتھ مجلس علمی ڈابھیل حضرت شاہ صاحب کے دوسرے افادات کو شائع کر کے محفوظ نہ کر دیتی، تو خدا ہی جانتا ہے کہ اپنی اس ٹوٹی پھوٹی شکستہ اور پراگندہ تقریر کے گم ہو جانے کا اثر مجھ پر کیا مرتب ہوتا، لیکن حق تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ مشہور قرآنی قانون

فَاَمَّا الزَّبَدُ فَیَذْهَبُ جُفَاءً ۚ — لیکن جھاگ، سو سوکھ کر ختم ہو گیا،
وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْكُثُ — اور لوگوں کو جس سے نفع پہونچتا ہے وہ ٹھہر گیا
فِی الْاَرْضِ (الرعد) — زمین میں۔

کی عملی تفسیر اس باب میں میرے سامنے آگئی، جو چیز مٹنے اور گم ہونے کی مستحق تھی وہ گم ہو گئی لیکن وا قعی منافع الناس کی جن چیزوں میں ضمانت تھی، قدرت کی طرف سے اس کے باقی رکھنے کا ایک استوار و محکم نظم کر دیا گیا، جس وقت خاکسار نے اپنی املائی تقریر کو قلم بند کرنا شروع کیا تھا، اس زمانے میں اس کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، حق تعالیٰ نے اپنے بعض خاص مخلص بندوں[1] کے دل میں معارفِ انوریہ کی صحیح قدر و قیمت کا احساس پیدا کیا، بخاری کی املائی شرح فیض الباری

---

(۱) یہ فقیر کے کرم فرما میزبان کریم مولانا محمد موسیٰ الجوہانسبرغی الافریقی ثم الباکستانی ہیں، شاید اپنے نام کا اظہار ان پر اب بھی گراں گزرے، لیکن وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ کے لاہوتی قانون کا وہ کیسے مقابلہ کر سکتے ہیں، حدیث بھی تو ہے لَوْ اَنَّ رَجُلًا عَمِلَ عَمَلًا فِی صَخْرَةٍ صَمَّاءَ لَا بَابَ فِیْهَا وَلَا كُوَّةَ خَرَجَ عَمَلُهٗ اِلَی النَّاسِ كَائِنًا مَا كَانَ (رواہ احمد والحاکم وصححہ) پھر یہ تو عمل مخلها و مجلیها کا عمل ہے۔ راز نہاں بن کر کیسے رہ سکتا ہے (باقی برصفحہ آئندہ)

کے مسودے کو لیکر ایک صاحب مصر بھیجے گئے، اور مصر میں قیام کر کے اس عزیز الوجود گرامی منزلت کتاب کو بہترین کاغذ پر روشن اور جلی ٹائپ کے حروف میں طبع کرا کے واپس آئے، شاہ صاحبؒ کے وہی افادات قیمہ جن کے متعلق اندیشہ تھا کہ دار العلوم دیوبند کے احاطہ ہی میں خدانخواستہ گم ہو کر ختم ہو جائیں گے، چاہنے والے نے جب چاہا تو اسلامی دنیا کے مشارق الارض ومغاربہا کے آخری حدود تک ان کو پہونچا دیا، اور کون کہہ سکتا ہے کہ مسلمانوں کی آئندہ کتنی نسلیں سرزمین ہند کے ان علمی انکشافات سے مستفید اور تمتع پذیر ہوتی رہیں گی۔ قابلِ رشک ہیں وہ لوگ جنھیں اس علمی مہم کی مختلف منزلوں میں حصہ لینے کی توفیق بخشی گئی، تاہم میرا یہ مظنہ اگر صحیح ہے کہ اپنی ساری کوتاہ نصیبیوں کے ساتھ حضرت شاہ صاحب کی درسی تقریروں کی قلمبندی کے سلسلے میں تقدم اور سبقت کی نعمت سے ابتداءً وہی دیوانہ سرفراز ہوا تھا، جس کا جنون اس علمی امانت کے بار کا متحمل نہ ہو سکا تو ارادی نہ سہی اضطراری سعادت سے چاہیئے تو یہی کہ اسے بھی محروم نہ ٹھہرایا جائے، جب وہ قاحیض

(صفحہ گذشتہ کا حاشیہ) حقیقت تو یہ ہے کہ امام الکشمیری کا حلقۂ تلامذہ اگرچہ کافی وسیع وعریض ہے، لیکن سمتاً وہدیاً ودلاً بلکہ شکلاً وصورۃً یا زیاً ورئیاً اتنے قریب مولانا محمد بن موسیٰ کو میں نے پایا، فنائیت کی یہ کیفیت دوسروں میں کم از کم مجھے تو نہ ملی نعم المال الصالح للعبد الصالح کی شرح بھی جوہانسبرگ کے التاجر الامین ہی کے قالب میں میرے سامنے پہلی دفعہ پیش ہوئی، ان کی ذرہ نوازیوں کو کیا بھلا ہیں سکتا۔ بہانی کا شرف چند دنوں کے لئے اس فقیر کو جب حاصل ہوا تھا تو انہیں کو نہیں، ان کے گھر کے ارکان بلکہ نوکروں اور ملازموں میں بھی اکرامِ ضیف کے بہترین سلیقہ کا تجربہ ہوا تھا فیض الباری، بخاری کی شرح کشمیری اور اس کے طفیل میں امام زیلعی کی تخریج ہدایہ دونوں کتابیں فقیر تک مولانائے موصوف کے بذل ونوال کے توسط سے پہونچیں۔ فجزاہ اللہ عنا خیر الجزاء

★

Toobaa-elibrary.blogspot.com

ایکہ دیکائن کی شاخ پر کوکو کرنیوالی فاختہ، کے فضل تقدم کا اعتراف کرتے ہوئے عرب کے شاعر نے کہا تھا، اور چڑیا تک کے متعلق انسانوں نے اقرار کیا ؎

ولکن بکت قبلی فھیج لی البکاء　　بکاھا فقلت الفضل للمتقدم

لیکن فاختہ مجھ سے پہلے رو پڑی، اس کے رونے سے مجھ پر گریہ طاری ہوا، اس لئے میں نے مان لیا کہ برتری اسی کو حاصل ہوئی جس نے سبقت کی شاید کہنے والا کہہ سکتا ہے ؎

میں جو رویا تو رو پڑی دنیا　　شور سے اپنے شور ہے برپا

بہرحال بقولِ شخصے ؎

عشق سے ہوں گے جن کے دل آباد
قیسِ مرحوم کو کریں گے یاد!

اور میں ممنون ہوں کہ بخاری کی املائی شرح فیض الباری کے مقدمہ میں صحیح مسلم کی گمشدہ میری املائی تقریر کا ذکر کر دیا گیا ہے جزاہم اللہ عنی خیر الجزاء

★

باب

معارفِ انوریہ

خیر قصہ تو حضرت شاہ صاحب کے درسی خصوصیات کا تھا، واقعہ یہ ہے کہ باتوں باتوں میں صرف حدیث ہی نہیں بلکہ دوسرے علوم کے ایسے اہم اہم کلیات، ہاتھ ان کے درس میں آجاتے تھے کہ اپنے ذاتی مطالعہ سے شاید ساری عمر ان تک رسائی ہم جیسے نارساؤں کی آسان نہ تھی۔

حدیث کے متعلق تواتر کے اقسام چہارگانہ کے سوا اصولِ حدیث کے الاعتبار کے اصطلاح کی شرح کرتے ہوئے شاہ صاحب نے جو تقریر فرمائی تھی حالانکہ تقریباً نصف صدی کے قریب زمانہ گزر چکا ہے، لیکن وساوس و شبہات، شکوک و اوہام کی جو تاریکیاں، اچانک میرے سامنے سے چھٹ گئی تھیں، اور سکینت و طمانینت کی جو لذت اسوقت میسر آئی تھی، دل میں اس کی خنکی اور حلاوت اسوقت تک موجود ہے ایک ہی حدیث کے متعلق اعتبار کے قاعدے سے اعتماد اور بھروسہ کی جو منطقی قوت فراہم ہوتی ہے۔ صحیح طور پر اس قوت سے واقف ہو جانے کے بعد اپنی جبلت سے آدمی اس اعتماد کی کیفیت کے نکالنے سے عاجز ہو جاتا ہے، جو قدرۃً اس عمل کے بعد دلوں میں حدیث کے متعلق پیدا ہو جاتا ہے۔

اعتبار کی تشریح

ایک ہی حدیث کے مختلف اِسناد کا مقابلہ کر کے دیکھا جاتا ہے کہ قدرِ مشترک سب کی روایتوں کا کیا ہے، اور اختلافی عناصر اس میں کتنے پائے جاتے ہیں، جستجو کے بعد قدرِ مشترک

Toobaa-elibrary.blogspot.com

کے متعلق یقین کرنا پڑتا ہے کہ راویوں کے ارادی یا اضطراری تصرف سے وہ پاک ہے، آخر خود سوچئے، کسی کا پیغام دس آدمیوں کے ذریعے سے آپ تک پہونچے، پہنچانے والوں کے بیان میں جو حصہ سب میں مشترک ہوگا، ظاہر ہے کہ اس کے متعلق ماننا پڑے گا کہ کم از کم پیغام کا یہ مشترک حصہ ضرور اسی پیغام کا جز ہے، جسے پیغام بھیجنے والے نے ہم تک روانہ کیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں پر اعتبار کے اس عمل سے قدرِ مشترک کا کافی ذخیرہ دستیاب ہوجاتا ہے، عوام کو اندازہ ہو نہ ہو، لیکن فن کے ماہرین وحذاق جانتے ہیں کہ اس معیار پر حدیثوں کا کتنا بڑا ذخیرہ شکوک وشبہات سے پاک بلکہ لفظی روایت کی شکل اختیار کرلیتا ہے، اور صرف یہی نہیں، بلکہ جیسے تواتر کی تقسیم کی روشنی میں حدیثوں کا معتد بہ معقول حصہ، خبر آحاد کی مظنونیت کے دائرے سے نکل کر یقین واذعان کی قوت کا حامل بن جاتا ہے، اسی طرح عموماً جو یہ سمجھا جاتا ہے کہ روایت کرنیوالوں نے بجائے الفاظ کے حدیثوں کے سلسلے میں زیادہ حاصل مطلب، یعنی روایت بالمعنی کو ادائے غرض کے لئے کافی قرار دیا ہے کافی ہونے میں جیسا کہ میں نے خود یہ ثابت کیا ہے، روایت بالمعنی کے طریقہ پر اعتراض کرنیکی کوئی وجہ نہیں ہے، قطعِ نظر تفصیلات کے اور کچھ نہیں۔ صرف ترجمہ کی حقیقت اگر آدمی کے سامنے ہو، تو روایت بالمعنی کی احادیث کے اعتراف پر وہ مجبور ہوجائیگا، آخر روایت بالمعنی کا مطلب اسکے سوا اور کیا ہے کہ ایک ہی مطلب کو اسی زبان کے دوسرے الفاظ اور تعبیروں میں راوی ادا کرے، جس زبان میں اس سے بات کہی گئی تھی، پھر ترجمہ میں تو دوسری زبان کے الفاظ میں مطلب کو ادا کرنا پڑتا ہے، پس لفظوں، صرف لفظوں کے بدل جانے سے اگر یہ کلیّہ ٹھہرا لیا جائے کہ مطلب بھی ہمیشہ بدل جاتا ہے، تو چاہیئے کہ ترجمہ اور اس کے ذریعے سے علوم وفنون کی جو اشاعت دنیا میں ہوتی ہے، سب کو لغو اور مہمل قرار دیدیا جائے جنون کے سوا، خود سوچئے کہ اور بھی کچھ ہے۔

لیکن قطعِ نظر اس سے حضرت شاہ صاحب نے الاعتبار کے جس طریقہ عمل سے روشناس فرمایا تھا، اس کی روشنی میں جیسا کہ شاہ صاحب نے بھی فرمایا تھا کہ حدیثوں کا بڑا ذخیرہ بجائے روایت بالمعنی کے روایت باللفظ کی مد میں داخل ہوجاتا ہے، غور کرنیکی بات ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے ہم پاتے ہیں کہ مثلاً دس صحابی کسی روایت کو بیان کرتے ہیں، ان صحابیوں کی روایت میں مشترک الفاظ کے متعلق اگر یہ سمجھا جائے کہ براہِ راست خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمائے ہوئے ہیں، تو عقل کا تقاضا ظاہر ہے کہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے، عام حالات میں کسی مطلب کو اپنے الفاظ میں ادا کرنیوالوں کے الفاظ میں وحدت مشکل ہے، اعتبار کے طریقہ سے تائیدی روایتوں کو اصطلاحاً متابعات وشواہد کہتے ہیں، خاص خاص کتابیں اس عمل میں امداد دینے کے لئے لکھی گئی ہیں، صحیح مسلم میں امام مسلم کے کام کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے، الاطراف کی کتابوں سے بھی کافی مدد اس راہ میں ملتی ہے۔

بہر حال یہ تو ایک علمی مسئلہ ہے، میں عرض کرنا چاہتا تھا کہ جیسے حدیث کے متعلق شاہ صاحب کے درس میں گُر کی باتیں معلوم ہوتی رہتی تھیں، ایسی باتیں جن سے تاثرات میں غیر معمولی انقلاب پیدا ہوجاتا تھا، یہی حال دوسرے علوم وفنون کے متعلق تھا درس تو ہوتا تھا حدیث کا لیکن شاہ صاحب کی ہمہ گیر طبیعت نے معلومات کا جو گرانمایہ قیمتی سرمایہ ان کے اندر جمع کردیا تھا، وہ ان کے اندر سے بے ساختہ چھلکتا رہتا تھا

منصبِ قضا اور اجتہاد

میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ قانون اور شریعت کے متعلق جو دو مختلف قدرتی فرائض ہیں، یعنی واقعات اور حوادث پر قانون کو منطبق کرنا، ایک قاضی اور جج کا سب سے بڑا فریضہ ہے، اسی طرح قانون کے محدود کلّیات سے ہر نئے پیش آنیوالے حادثے کے متعلق حکم لگانا یہ فرض مجلسِ وضعِ قوانین اور اربابِ اجتہاد کا ہے۔

Toobaa-elibrary.blogspot.com

حضرت شاہ صاحب قانون کے مناط کی تقسیم کرتے ہوئے تنقیح مناط، تخریج مناط، تحقیق مناط کے اقسام کو بیان کر کے جو سیر حاصل بحث ان اقسام پر کیا کرتے تھے، میرا تو خیال یہی ہے کہ قضا ذجی، اور اجتہاد یعنی قانون سازی، دونوں راہوں کی ایسی روشنی ان کی تقریر سے مہیا ہوتی ہے کہ دونوں پر چلنے والے انشاءاللہ اسکی روشنی میں بھٹک نہیں سکتے۔ تفصیلات کے لئے ان کی مطبوعہ تقریروں کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

ائمہ اجتہاد کی تعظیم

اس کے ساتھ مجھے اس کا بھی اعتراف کرنا چاہیئے کہ شاہ صاحب کو حالانکہ اپنی حنفیت پر اصرار بلیغ تھا اور ائمہ اجتہاد میں ابو حنیفہ الامام کے مقابلے میں دوسروں کا اجتہاد ان کو بہت کم متاثر کرتا تھا۔ مگر بایں ہمہ یہ ان ہی کے درسی افادات کا شعوری اور کچھ غیر شعوری اثر ہے کہ اپنے دل کو اہل سنت والجماعت کے تمام ائمہ اجتہاد امام مالک، امام شافعی امام احمد کی عظمت سے معمور پاتا ہوں، اور ان ہی کے سمجھانے سے یہ سمجھ میں آیا کہ سارے اجتہادی مسائل جن میں بظاہر اختلاف نظر آتا ہے، سب ہی حق ہیں، اور سب حق تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہیں۔ خیال آتا ہے کہ ائمہ اجتہاد میں حق دائر ہے، یعنی ان میں سے لاعلی التعیین کوئی ایک حق پر ہے۔ بجائے اس کے شاہ صاحب نے طلبہ کو سمجھایا کہ سب ہی کو حق پر سمجھنا چاہیئے، تو سرحد کے بعض خشک مزاج ملاؤں پر یہ بات گراں گزری۔ اور مختلف قسم کے اراجیف کی اشاعت ان کی طرف سے طلبہ میں ہونے لگی لیکن ان بے چاروں کو کون سمجھاتا کہ ؎

اشفق علی الرأس و لا تشفق علی الجبل

ایک کوہی بکرا پہاڑ پر سینگ مار رہا تھا تو شاعر نے کہا کہ اپنے سر پر رحم کر، پہاڑ پر نہیں۔

★

شاہ صاحب اور معارفِ صوفیہ

بظاہر تصوف اور صوفیاء کے متعلق خیال ہوتا تھا کہ اس طبقہ اور ان کے علوم و معارف سے شاہ صاحب کو شاید چنداں دلچسپی نہیں، لیکن وہی بھولے بسرے خیالات جو دماغ میں رہ گئے ہیں، ان ہی میں سے دو باتیں میرے اندر اس طرح جاگزیں ہو گئی ہیں کہ تصوف کے نظری و عملی دونوں حصّوں کے متعلق بعد کو جو کچھ بھی اس فقیر نے سوچا یا سمجھا، زیادہ تر ان ہی دونوں کی روشنی میں سمجھا اور سوچا۔

وَحدتُ الوجودُ

حادث (یعنی کائنات و مخلوقات) کا قدیم (یعنی خالق جل مجدہ) سے کیا تعلق ہے، شاہ صاحب کے الفاظ میں ربط الحادث بالقدیم، یہی عنوان قائم کر کے اس سلسلے میں کچھ فرماتے تھے، یہی تصوف کے نظری حصہ کا بنیادی و اساسی مسئلہ تھا پہلی دفعہ شاہ صاحب نے، اس مغالطہ کا ازالہ فرمایا کہ عوام الناس خالق و مخلوق کے تعلقات کو صانع و مصنوع یا معمار و مکان کی مثال سے سمجھنا چاہتے ہیں مصنوع اپنے باقی رہنے میں چونکہ صانع کا محتاج نہیں رہتا۔ یعنی مکان کو مثلاً بن جانے کے بعد معمار کی ضرورت باقی نہیں رہتی، عوام کی سمجھ میں صحیح طور پر اس لئے نہیں آتا کہ پیدائش میں تو عالم خدا کا محتاج ہے، لیکن پیدا ہو جانے کے بعد عالم کو اپنی بقاء میں خدا کی کیا ضرورت ہے؟ صوفیہ اسی وسوسہ کا ازالہ اپنے اس نظریہ سے کرتے ہیں، جو وحدت الوجود وغیرہ ناموں سے مشہور ہے، اور نہ جاننے والوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ صوفیہ وحدت الوجود کے جو قائل ہیں، تو اس کا مطلب ہے کہ ان کا ایمان وحدت الموجود پر ہے یعنی سارے موجودات ایک ہیں۔ حالانکہ "الوجود" کی وحدت کو "الموجود" کی وحدت سے کیا تعلق؟

خاکسار نے اپنی کتاب الدین القیم میں اس وحدتُ الوجود کے مسئلہ کی جو تشریح و تفصیل کی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ بنیادی امور اس کے شاہ صاحب کی تقریر ہی ہے

Toobaa-elibrary.blogspot.com

ماخوذ ہیں۔

مسئلہ احسان

اسی طرح مشہور حدیث جبرئیل جس میں ہے کہ ایمان و اسلام اور احسان کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسافر کے بھیس میں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے سوالات کئے تھے، اس حدیث میں "الاحسان" کے لفظ کا ترجمہ ہی شاہ صاحب نے ایسا کیا کہ تصوف کے عملی حصہ کی اصل خصوصیت سامنے آگئی، فرمایا تھا، کہ احسان کا صلہ جب الیٰ کے ساتھ آتا ہے تو کسی کے ساتھ حسن سلوک کرنا اس کا مطلب ہوتا ہے، لیکن صلہ کے بغیر صرف احسان کا ترجمہ "حسن پیدا کردن" کرنا چاہیئے، یہی یا قریب قریب اسی کے فارسی زبان میں احسان کا ترجمہ کرکے فرمایا کرتے تھے کہ عقائد و اعمال اور زندگی کے تمام شعبوں میں، جو مذہب کے دائرے میں داخل ہیں، ان کو بار ٹھہراتے ہوئے سر سے ٹالنا، ایک حال تو یہ ہوتا ہے، لیکن ان میں حسن آفرینی کی کوشش بس یہی احسان ہے اور تصوف کا مطلب یہی ہے کہ بجائے تکلیف کے دین ہی گویا زندگی کا اقتضاء بن جائے، اور یوں دین کے ہر شعبہ میں حسن کے اندر حسن کا اور جمال کے اندر جمال کا اضافہ کرتے چلا جانا چاہیئے، یہی الاحسان کے مقام کا اقتضاء ہے۔ خیال آتا ہے کہ قرآن مجید میں جہاں "یحب المحسنین" کا لفظ آیا ہے، اس کا صحیح مصداق شاہ صاحب کے نزدیک مسلمانوں کا وہی طبقہ ہے، جو دینی مطالبات کی تعمیل میں اپنے پیش نظر احسانی نقطہ نگاہ رکھتا ہے (۱)

(۱) بخاری وغیرہ کی مشہور حدیث اِنَّ اللہَ کَتَبَ الاحسانَ علیٰ کُلِّ شیءٍ (اللہ نے ہر چیز پر احسان کو فرض کیا ہے) سے بھی شاہ صاحب کے نقطۂ نظر کی تائید ہوتی ہے پس جبرئیل امین سے جواب میں جو یہ فرمایا گیا یعنی خدا ہمیں دیکھ رہا ہے، اس جامع الادیانی غیر مشتبہ یقین کی روشنی میں چاہیئے کہ عبادت کرتے ہوئے اپنے معبود، خالق کائنات (اگلے صفحہ پر)

ان تقریروں کو سنے ہوئے عرض کر چکا ہوں کہ چالیس سال کے قریب زمانہ گزر چکا ہے، ٹوٹا پھوٹا، تحریری نوٹ جو میرے پاس تھا مدت ہوئی کہ وہ بھی غائب ہو چکا ہے، لیکن تصوف کے عملی حصہ کے متعلق زمانہ کی اس طویل مدت میں جو کچھ فقیر نے بعد کو پڑھا یا سمجھا یا لکھا زیادہ تر جوہری اثر سب میں شاہ صاحب کی اس تقریر کا تھا، اگرچہ افسوس کے ساتھ اس کا بھی اقرار کرنا پڑتا ہے کہ پڑھنے سمجھنے سمجھانے، اور لکھنے لکھانے ہی کی حد تک میرا کام محدود رہا، اور کرنے کی توفیق میسر نہ آئی، لے دے کے اپنا سرمایہ ناز و احساس صرف وہی ہے کہ

احبّ الصالحین ولست منھم

لعل اللہ یرزقنی صلاحًا

لیکن آہ کہ میرا لعلّ اب لیتَ کی حدود میں داخل ہو چکا ہے، اور نہیں کہہ سکتا کہ جس چیز کو عمر بھر اچھا سمجھتا رہا، اسی کو اپنی عملی زندگی میں داخل کرنے سے کیوں قاصر رہا قسمت کی تہی دستی کے سوا اس کی اور کیا توجیہ کی جائے

شاہ صاحب اور معقولات

شاہ صاحب کی بعض باتیں عجیب و غریب تھیں، بظاہر ان کے مطالعہ کا موضوع دینیات ہی کی کتابیں تھیں، لیکن جب عقلی مسائل پر اتفاقاً کچھ فرمانے کا موقعہ آجاتا، تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نادان بچوں سے زیادہ ان کے سامنے بڑے سے بڑا معقولی نہیں ہے۔

(حاشیہ صفحہ گذشتہ کا) کے ساتھ ایسا ربط پیدا کیا جائے کہ عبادت کرنیوالا گویا اس کو دیکھ رہا ہے ساری کائنات اس کے لئے آیات اللہ اور خدا کی نشانی بن جائے، گویا الاحسان کے سمجھانے کی ایک مثال "ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک" کے جواب کو خیال کرنا چاہیئے۔

Toobaa-elibrary.blogspot.com

عمل بھی ایمان کا جزء ہے یا نہیں، علم کلام کا مشہور خلافیہ ہے، اس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے کہ مناطقہ (منطقی کے لفظ کی جمع، عموماً معقولیوں کے متعلق اسی لفظ کو استعمال کرنے کے عادی تھے اور اسی کیساتھ علیہم ما علیہم[1] بھی فرماتے) بہرحال فرماتے کہ ان مناطقہ کی طرف سے ان لوگوں پر جو ایمان کی حقیقت میں سارے دینی اعمال کو شریک سمجھتے ہیں، ان پر اعتراض کرتے ہوئے جو یہ کہا جاتا ہے کہ جزء کے ارتفاع سے قاعدہ ہے کہ کل بھی مرتفع ہو جاتا ہے، یعنی کل کا کوئی جز اگر غائب ہو جائے تو منطقی نقطۂ نظر سے کل، کل باقی نہ رہا، اور اس بنیاد پر ایمان کو مرکب حقیقت قرار دینے والوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ کسی مسلمان کی زندگی میں کوئی اسلامی عمل، اگر نہ پایا جائے، تو مطلب اس کا یہ ہوا کہ ایمان ہی کا اس سے ازالہ ہو گیا، اور وہ مومن باقی نہ رہا، حالانکہ ایمان کو مرکب قرار دینے والے بھی اس کے قائل نہیں۔

قطع نظر اس سے کہ ایمان مرکب ہے یا بسیط، دلچسپ بات اس موقعہ پر شاہ صاحب جو فرمایا کرتے تھے، وہ یہ تھی کہ ذرا ان منطقیوں کی حماقت ملاحظہ کیجئے، درخت ایک مرکب حقیقت ہے، جڑ، تنہ، شاخیں، برگ و بار سب ہی اس کے اجزاء ہیں، فرض کیجئے کوئی ہلکا سا پتہ درخت سے گر گیا، تو منطقی کہدے گا کہ درخت باقی نہ رہا، اس لئے کہ جز کا ارتفاع، کل کے ارتفاع کو مستلزم ہے لیکن منطقیوں کے سوا کوئی انسان جب تک پاگل نہ ہو جائے، اس کا قائل ہو سکتا ہے کہ کسی ایک پتے کے جھڑ جانے سے درخت ہی ناپید ہو گیا؟ اور اجزاء کے صحیح تعلق کو بتاتے ہوئے فرماتے کہ در اصل ہر کل میں دو قسم کے اجزاء ہوتے ہیں، بعض اجزاء کے نکل جانے سے

---

(۱) کبر و نخوت کے بے جا جذبات معقولیوں میں جو ابھر آتے ہیں، یہ ان کا ہی ردعمل تھا کہ علیہم ما علیہم کے توبیخی الفاظ بھی اس موقعہ پر ان کی زبان مبارک سے خلاف دستور نکل آتے تھے

٭

تو کل یقیناً غائب ہو جاتا ہے، مثلاً گردن آدمی کی کٹ جائے، سر اڑ جائے، دل نکل جائے، ان کے مقابلہ میں کل ہی کے بعض اجزاء ایسے بھی ہوتے ہیں، جو جز ہونے کے باوجود کل سے اگر غائب ہو جائیں تو کل باقی رہتا ہے، جیسے آدمی کا بال گر جائے انگلی کٹ جائے، تو کیا کسی کے بال گر جانے سے زید اس لئے زندہ باقی نہ رہا کہ زید کے کل کا، بال بھی ایک جز تھا، یا کسی قلعہ کی دیوار کی کوئی اینٹ نکل جائے تو سمجھنا چاہیئے کہ قلعہ ہی غائب ہو گیا، فرمایا کرتے تھے کہ اکثریتوں کو واحد تعبیر کے قالب میں لا کر کلی بنا لیا۔ مناطقہ اس کو اپنا کمال سمجھتے ہیں، حالانکہ اصل حقیقت سے اپنے آپ کو اندھا بنانے کی یہ بدترین شکل ہے۔

عقلمند ترین گروہ انسانی

فرماتے تھے کہ میرے نزدیک اعقل الناس فی الناس اہل لغت یا زبانوں کے بنانے والے ہیں، جو کائنات کے ایک ایک ذرہ کی خصوصیات پر نظر جما کر الگ الگ الفاظ بناتے ہیں، زبان اور لغت والوں کے بعد فقہاء کی تعریف کرتے، اور ان کے عقلی رسوخ کی داد دیتے کہ مشتبہ مسائل کے مختلف پہلوؤں کو متعین کر کے ہر ایک پہلو کے متعلقہ احکام کا سراغ لگانا چاہتے ہیں، الغرض ہر چیز کے امتیازی اوصاف کا جاننا ان کے نزدیک کمال تھا، اور امتیازی اوصاف سے قطع نظر کر کے کلی کی لاٹھی جزئیات پر چلانا اندھے کی لاٹھی کے سوا ان کے نزدیک اور کچھ نہ تھی۔

Toobaa-elibrary.blogspot.com

باب ۸

حضرت شاہ صاحب کی چند خصوصیات اور امتیازات

بہرحال خاکسار کو دوسرے علماء اور شاہ صاحب میں جو کھلا ہوا فرق محسوس ہوتا تھا۔ وہ یہ تھا کہ عموماً لوگوں میں استعداد ذی علم پایا جاتا ہے، یعنی اس پر قناعت کرلیا جاتا ہے کہ جب اپنے متعلقہ علوم کی کتابوں کا مطالعہ کریں گے، تو مسائل کے مالہا وما علیہا سے واقف ہو جائیں گے، لیکن شاہ صاحب کو عموماً ہر اس علم سے حضوری تعلق تھا، جس سے وہ دلچسپی رکھتے تھے۔ اور ان علوم کے کلیات وجزئیات کا ذخیرہ فعلیت کے رنگ میں ان کے حافظہ کے محافظ خانہ میں اس طرح محفوظ رہتا تھا کہ جس مسئلہ کو چاہتے آسانی کے ساتھ اپنے حسِ مشترک کے سامنے لے آتے طلبہ (اسی) لئے ان کے دماغ کو کتابوں کی الماری سے تشبیہ دیتے تھے۔ فقیر بجائے الماری کے اسے ایک مستقل کتبخانہ ہی خیال کرتا تھا۔

بہرحال وہ اپنے عہد کے طلبہ کی علمی بے بضاعتیوں کا اندازہ کر کے تکلیف اٹھا کر علاوہ موضوعِ درس کے چند خاص امور کا تذکرہ التزاماً اپنے درس میں ضرور فرمایا کرتے تھے۔ مثلاً جن مصنفین کی کتابوں کا حوالہ دیتے۔ ان کی ولادت، وفات کے سنین کے ساتھ

ساتھ مختصر حالات اور ان کی علمی خصوصیت، علم میں ان کا خاص مقام کیا ہے؟ ان امور پر ضرور تنبیہ کرتے چلے جاتے، یہ ان کا ایسا اچھا طریقہ تھا، جس کی بدولت شوقین اور محنتی طلبہ ان کے حلقہ درس میں شریک ہو کر علم کے ذیلی ساز وسامان سے مسلح ہو جاتے تھے یا کم از کم مسلح ہونے کا ڈھنگ ان کو آجاتا تھا، لیکن سچ یہ ہے کہ ہر غریب مدرس اور استاذ کے بس کی یہ بات نہیں کہ متعلقہ مذکورہ بالا تفصیلات سے طلبہ کو آگاہ کرنے پر قادر ہو، یہ تو ان کے خصوصی حافظہ کا کمال تھا

افراد ورجال کے باب میں شاہ صاحب کا رویہ

ایک دلچسپ تجربہ شاہ صاحب کے متعلق میرا یہ بھی تھا کہ اشخاص ورجال جن کا تذکرہ وہ حلقۂ درس میں فرمایا کرتے تھے، ان میں زیادہ تر ایسی ہستیاں تھیں جو اب دنیا میں موجود نہیں ہیں زندہ علماء کا ذکر مشکل ہی سے ان کے درس میں ہوتا، اور زندہ کیا سچ پوچھئے تو حافظ ابن حجر نویں صدی ہجری کے عالم ومحدث کے بعد والوں کے نام بھی ان کی زبان مبارک پر اتفاقاً ہی کبھی آتے ہوں گے، ان کے حلقۂ درس میں پہونچ کر کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ درمیان کی چند صدیاں گویا حذف ہو گئی ہیں، اور ہم نویں، آٹھویں اور ان سے پہلے کی صدیوں میں گویا زندگی بسر کر رہے ہیں، پچھلوں کا نہ وہ نام ہی عموماً لیتے تھے اور نہ ان کے کام ہی کا مدحاً یا قدحاً ذکر کرتے۔ ان کا معاملہ بس ان ہی گزرے ہوئے اگلے بزرگوں کی حد تک محدود رہتا تھا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ اپنے معاصر اور ہم چشم علماء کے متعلق ان کے تأثرات کا دریافت کرنا مشکل تھا، اور میرا خیال کچھ ایسا ہے کہ کسی قسم کا تأثر اس باب میں وہ رکھتے ہی نہ تھے، اس ذریعے سے حق تعالیٰ نے علماء کے ایک بڑے مہلک اخلاقی رذیلے سے ان کو محفوظ فرمادیا تھا۔

اس سلسلہ میں معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ علماء کی علمی وفنی تنقید کی طرف ان کے جذبہ کا رخ پھیر دیا گیا تھا۔ انکی علمی چشمک اگر کچھ تھی بھی تو ان ہی وفات یافتہ بزرگوں سے تھی

Toobaa-elibrary.blogspot.com

حافظ ابن حجرؒ کے ساتھ ایک طرف غیر معمولی عقیدت کا یہ حال تھا کہ جبل العلم حافظ الدنیا کے الفاظ سے انکی مراد حافظ ہی ہوتے، لیکن شافعی ہونے کی وجہ سے اختلافی مسائل میں حنفی مذہب کے متعلق جہاں شاہ صاحب کو محسوس ہوتا کہ جان بوجھ کر حافظ سرد مہری اور لاپرواہی سے کام لے رہے ہیں، تو اسوقت مسکراتے ہوئے فرماتے حافظ الدنیا نے اس موقع پر کھٹ لسانی سے کام لیا ہے، کبھی کبھی ان کے طرزِ عمل کو طوطے کی چال سے تشبیہ دیتے، جو آنکھوں کو گردش دیتے ہوئے، آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے نکل جاتا ہے

شافعیہؒ کے ایک خاص طرزِ عمل پر ظریفانہ تبصرہ

اختلافی حدیثوں کے باب میں اصح مافی الباب(۱) کا ترجیحی طریقہ شوافع میں عموماً جو مروج ہے، جب ان کے اس اصول کو ذکر کرتے، تو فرماتے، لیجئے علماء شافعیہ نے پٹھے ٹٹولنے کا کام شروع کردیا (۲)

عموماً وہ اس کا بھی موقع تلاش کیا کرتے کہ علاوہ حدیث کے اسلامی علوم کے طلبہ و علماء کے لئے دوسرے متعلقہ علوم و فنون کے جن اصول و کلیات کا جاننا ضروری

---

(۱) ایک مسئلہ میں جب کئی روایتیں متعارض ہوتی ہیں، تو علماء ان میں ترجیح، تطبیق یا نسخ کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ اس باب میں حضرات شوافع کا ایک اصول یہ ہے کہ ان روایتوں کا ان کے راویوں کے قوت وضعف کے لحاظ سے درجہ متعین کرتے ہیں جو روایت ان میں صحیح تر پاتے ہیں اسی کو اختیار کرکے باقی کو نظر انداز کردیتے ہیں اسی کا نام اصطلاح میں اصح مافی الباب ہے (یعنی اس مسئلہ میں صحیح تر روایت کی ترجیح) اعجاز

(۲) مطلب یہ تھا کہ اسماء الرجال کی کتابوں کو اٹھا کر، راوی پر جرح کرکے مخالف کی حدیثوں کو ناقابلِ لحاظ بنادینا اور صرف رجالی رجسٹروں کی مدد سے کسی روایت کو (باقی بر صفحہ آئندہ)

ہے ان کی بادنیٰ مناسبت ذکر فرماتے، اور مسئلہ کی ایسی تاریخ بیان کرتے، جس کے سننے کے بعد معلوم ہوجاتا تھا کہ اس مسئلہ کی ابتدا کس شکل میں ہوئی، اور کن کن نقاطِ نظر سے گزرتے ہوئے اپنے موجودہ حال تک پہونچا ہے۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کا تاثر

یاد آتا ہے کہ ایک دفعہ مرحوم صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، جو کسی زمانہ میں علی گڑھ یونیورسٹی کالج کے روحِ رواں، جزو و کل یا کم از کم غیر معمولی موثر عنصر تھے، پچھلے دنوں جب علیگڑھ اور دیوبند کی درمیانی خلیج کی وسعت کم ہو رہی تھی (۱)

(صفحہ گذشتہ کا باقی حاشیہ) ترجیح دینا، لیکن آثارِ صحابہ، قرآنی آیات کے اقتضاء اور اسلام کے کلی قوانین و اصول سے چشم پوشی کرلینا، حضرت شاہ صاحب شافعیوں کے اس طرزِ عمل کو روایتوں کی ترجیح میں پسند نہیں فرماتے، اور جرح کرنے کے لئے رجالی رجسٹروں میں راوی کی کمزوریوں کو ٹٹولنا، اس کا نام انھوں نے پٹھا ٹٹولنا رکھا ہوا تھا، فرماتے تھے کہ یہ تو قصابوں کا کام ہوا، جو جانور کمزور معلوم ہوا، اسی کو پٹک کر ذبح کردیا

(۱) ۱۳۲۸ھ میں دستار بندی کا مشہور تاریخی جلسۂ کبیرہ دار العلوم دیوبند کے احاطہ میں جب خاص شان، آن بان سے منعقد ہوا تھا، تو پہلی دفعہ علی گڑھ کالج کے نمائندے بنکر صاحب زادہ مرحوم اس تقریب میں شریک ہونے کے لئے دیوبند پہونچے تھے، انگریزی خواں طبقہ کی طرف سے علماء دیوبند کی طرف رجحان کا اظہار گویا پہلی دفعہ عملی شکل میں پیدا ہوا تھا۔ علی گڑھ کی گرم پارٹی پر صاحب زادہ مرحوم کا یہ اقدام کافی گراں ثابت ہوا تھا۔ اٹاوہ کے اخبار البشیر کے ایڈیٹر مولوی بشیر نے تو علانیہ صاحبزادے صاحب پر لعنت و ملامت کی تھی، لکھا تھا کہ اس قسم کی لولی پوٹو باتوں سے کچھ فائدہ نہیں، ان مولویوں سے مصالحت کی امید فضول ہے، لیکن تاریخ کے اوراق سیاست کی آندھی میں اچانک الٹ پلٹ گئے اور جس کا تصور بھی ناممکن تھا، وہی سب کچھ دیکھا گیا اور دیکھا جارہا ہے۔

★

Toobaa-elibrary.blogspot.com

توصاحبزادے صاحب مرحوم کبھی کبھی دیوبند تشریف لایا کرتے تھے، ایک دفعہ صحیح مسلم کے درس میں آکر وہ بھی شریک ہوئے، واپس ہو کر میں نے خود ان سے سنا ہے، کہتے تھے کہ آج تو آکسفورڈ اور کیمبرج کے لکچر ہال کا منظر میرے سامنے آگیا تھا، یورپ کی ان یونیورسٹیوں میں پروفیسروں کو جیسے پڑھاتے ہوئے میں نے دیکھا ہے، آج ہندوستان میں میری آنکھوں نے اسی تماشے کو دیکھا۔

دفاع ہوگیا

یادداشت اور حافظہ کی غیر معمولی قوت کا نتیجہ یہ تھا کہ معلومات کا طوفان شاہ صاحب کے اندر تلاطم پذیر رہتا تھا، خیال آتا ہے کہ کسی مسئلہ پر تقریر فرماتے ہوئے، اسی کی مناسبت سے، ان کا ذہن کسی دوسرے مسئلہ کی طرف منتقل ہو جاتا، تو عموماً فرماتے "مجھے دفاع ہوگیا اس مسئلہ کی طرف" ان دفاعی مسائل میں صرف، نحو، معانی، بیان، بدیع وغیرہ فنون تک کے مسائل شریک تھے۔

عربیت سے تعلق رکھنے والے ان علوم سے شاہ صاحب کو غیر معمولی دلچسپی تھی، ان علوم کی اعلیٰ بنیادی کتابوں کا غیر معمولی فکر و نظر کے ساتھ انھوں نے مطالعہ کیا تھا، میرا خیال ہے کہ کافیہ اور شرح جامی کے ساتھ مدارس کے عام مولویوں کا جو تعلق ہوتا ہے، یہی تعلق شاہ صاحب کو سیبویہ کی الکتاب سے تھا، ابن عصفور جس کے کچھ نوٹ اور کچھ حواشی سیبویہ کی کتاب پر ہیں، اس نام کو بھی پہلی دفعہ خاکسار نے شاہ صاحب ہی سے سنا تھا اور کہہ سکتا ہوں کہ ان کے بعد پھر کسی مولوی کی زبان سے یہ الفاظ سننے میں نہ آئے۔ دوسروں کی کیا کہوں، سیبویہ کی الکتاب کے مطبوعہ نسخے پر میری نظر تو ضرور پڑی ہے، شاید ادھر ادھر سے کچھ اس کو دیکھا اور پڑھا بھی ہوگا، لیکن ابن عصفور کے حاشیہ کے دیکھنے کا بھی شرف حاصل نہ ہوا، معانی و بیان و بدیع کے مسائل میں الجرجانی کی دلائل الاعجاز، اسرار البلاغت، یا زمخشری کی مفصل کے سوا تفتازانی وغیرہ مصنفوں کی کتابوں کا حوالہ دیتے ہوئے شاہ صاحب کو فقیر نے کبھی نہیں دیکھا، اصولِ فقہ

میں وہ ابن ہمام کی تحریر کے گویا حافظ تھے، فقہ میں ابوبکر کاسانی صاحب بدائع، شمس الائمہ سرخسی، اور ابن نجیم صاحب بحرالرائق سے ان کو بہت متاثر پاتا تھا، شامی کے تحفہ پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چنداں بھروسہ نہیں فرماتے تھے، صاحب ہدایہ کے بڑے مدّاح تھے، عموماً فرماتے کہ ابن ہمام کی فتح القدیر جیسی کتاب لکھنے کا ارادہ چاہوں تو کرسکتا ہوں لیکن ہدایہ جیسی کتاب کے لکھنے سے اپنے آپ کو قطعاً عاجز پاتا ہوں۔

اشعار کا خزانہ

ان کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ عربی زبان کے کسی مشکل لفظ کی تشریح کرتے ہوئے، یا کسی اور ضرورت سے، عربی شعر پیش کرنا چاہتے تو گو شہادت کے لئے ایک مصرعہ یا ایک شعر ہی کافی ہوتا، لیکن یادداشت کی بے پناہ قوت کا نتیجہ تھا، ایک مصرعہ کے لئے بیس بیس تیس تیس بلکہ اس سے بھی زیادہ اشعار کی نظموں کو مسلسل سناتے چلے جاتے تھے، ظاہر ہے کہ اس وقت ہم طالبعلموں کی حیثیت ٹھیک ان بھینسوں کی ہوتی تھی، جن کے سامنے بجانے والے بین باجہ بجا رہے ہوں، اور غریب بھینس ٹکٹکی اس کو دیکھ رہی ہو، دوسروں کے متعلق تو مجھے کہنے کا حق نہیں، لیکن فقیر کی حیثیت تو اس وقت اخفش کے "بز" ہی کی ہوتی تھی اپنی یافت اور سمجھ کے مطابق، جیسا کہ عرض کرچکا ہوں شاہ صاحب کی تقریروں کو میں مسلسل نوٹ کرتا چلا جاتا تھا۔ لیکن انشاد شعر کا یہ جذبہ شاہ صاحب پر طاری ہوتا تو میرے قلم اور انگلیوں کو آرام کرنے کا قدرتی موقع مل جاتا، اسی لئے میری مرتبہ تقریر شاہ صاحب کے ان سنائے ہوئے اشعار سے خالی تھی، شاید چند ضروری مصرعے یا شعر مشکل ہی سے اس سلسلہ میں قلم بند ہوئے ہوں، میرا اندازہ تھا کہ مجموعی طور پر نصف لاکھ یعنی چالیس پچاس ہزار سے کم تعداد ان عربی اشعار کی نہ ہوگی، جو شاہ صاحب کو زبانی یاد تھے، جنھیں جس وقت بھی چاہتا وہ سنا سکتے تھے۔

کیفیت باطنی کی جھلک

فارسی ادب کا مذاق بھی کافی رکھتے تھے، کبھی کبھی درسی تقریروں میں فارسی کے

Toobaa-elibrary.blogspot.com

موزوں اشعار کو ترنم کے خاص لہجے میں استعمال فرماتے۔

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چین بستہ اند (۱)

(مشک افشانی کرنا تو تیری زلفوں کا کام ہے۔ مگر عاشقوں نے کسی مصلحت سے اس کی تہمت چین کے ہرن پر رکھدی ہے۔)

جب توحیدی کیفیت کا غلبہ ہوتا تو مسکرا کر حافظ کا یہ شعر دہراتے، یا انھیں کے اس مشہور شعر ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(مصلحت نہیں ہے کہ راز پر سے پردہ اٹھے، ورنہ رندوں کی مجلس میں کوئی ایسی خبر نہیں ہے جو نہ ہو)

کو خاص اندازۂ مستانہ سے سناتے تھے،

فرماتے کہ جی ہاں! یہ سب بڑے میاں کی کارروائی ہے، اس وقت ایک خاص قسم کی سرمستی، ان کے جبینِ مبارک کے اساریر میں جھلکنے لگتی، یہی وقت ہوتا جب بٹوا کھولتے چھالیا اور زردہ نکال کر پان کے ساتھ استعمال فرماتے۔

اپنے باطنی حال کے اخفاء میں ان کی کوشش حد سے گزری ہوئی تھی، کھلنے کا

---

(۱) تقدیر و تدبیر کے فرق کو بتاتے ہوئے عموماً اس شعر کو ضرور دہراتے، فرماتے تھے کہ خلیفہ بنانے کا فیصلہ تو بڑے صاحب نے پہلے ہی کر لیا تھا لیکن فیصلہ کا ظہور اِس شکل میں ہوا کہ آدم سے غلطی صادر ہوئی اور زمین پر جانے کا حکم دیا گیا کہتے ہیں کہ خلافت کا فیصلہ یہی تقدیر کی مثال ہے اور جس شکل میں اس فیصلہ کا ظہور ہوا، اسی کو تدبیر کہتے ہیں۔

★

موقعہ اتفاقاً کہیں پیش آجاتا، تو اس وقت ظرافت اور طیبت کا لہجہ اختیار فرما لیتے بظاہر عام مجلسوں اور صحبتوں میں، ان پر سکینت و وقار کی خاموشی طاری رہتی لیکن حلقہ درس میں طیبت و مزاح کا جبلی رجحان ان کا نمایاں ہو جاتا، اس وقت انکی زبان مبارک پر معصومانہ انداز میں بڑے پر کیف فقرے جاری ہوتے۔

اسی سلسلہ میں فرمایا کرتے کہ جی ہاں ظرافت کی یہ مد وہاں بھی کافی وسیع ہے بڑے صاحب کے یہاں بھی اس کا تماشہ پیش ہو گا پھر مثلاً ان حدیثوں کو ذکر فرماتے، جن میں آیا ہے کہ قیامت کے دن بعض گنہگاروں کے ساتھ یہ معاملہ کیا جائے گا کہ انھیں سے ان کے گناہوں کا اعتراف کرا کے حق سبحانہٗ و تعالیٰ کی طرف سے حکم ہو گا کہ وہ ہر گناہ جس کا اس نے اقرار کیا ہے، اس کے مقابلے میں اسے نیکی کا اجر دیا جائے، اقرار کرنیوالا گنہ گار اس حکم کو سن کر فرشتوں سے کہے گا کہ ٹھہرو ابھی کے گناہوں کی فہرست تو بہت طویل ہے، جب ہر گناہ کے بدلے میں نیکی کا اجر ملیگا، تو ان گناہوں کو بھی گن لو۔ (او کما قال)

صحیح مسلم ہی کی مشہور حدیث میں جنت کے داخل ہونے والے سب سے کمتر درجے کے آدمی کا ذکر کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جہنم سے نکلنے کے بعد اپنے سامنے ایک درخت کو پائے گا، عرض کریگا اے اللہ اس درخت کی چھاؤں کے نیچے پناہ لینے کی اجازت دیجائے، حق تعالیٰ سبحانہٗ اس سے اقرار لیں گے کہ اس سے زیادہ تو اپنے مطالبہ کو آگے نہیں بڑھائے گا، قسم کھا کر وہ اقرار کریگا کہ بس اس سے زیادہ میں کبھی بھی اور کچھ نہ چاہوں گا، اجازت دیدی جائیگی، یوں ہی ایک درخت کے بعد اس سے زیادہ گھنا اور بہتر درخت اس کے سامنے آئے گا، اور اپنے معاہدہ کو توڑ کر اس کے نیچے جانے کی اجازت چاہے گا۔ تا آنکہ بالآخر وہ سرکتے ہوئے جنت کے دروازے پر پہونچ کر جنت میں داخل ہو جانے کی اجازت چاہے گا۔ اس وقت حق تعالیٰ سبحانہٗ اس سے فرمائیں گے کہ ما یصریني منك، تجھ سے میرا پیچھا آخر کون چیز

Toobaa-elibrary.blogspot.com

چھڑائے گی، ایک فرمائش کے بعد اس سے بہتر فرمائش کرتا ہی چلا جاتا ہے، اور اسی کے ساتھ ارشاد ہوگا۔

"کیا تو اس پر راضی ہو جائے گا کہ تجھے ساری دنیا اور اس دنیا کے مانند دوسری دنیا دیدی جائے"

تب وہ غریب گنہگار عرض کرے گا کہ یَا رَبِّ اَتَسْتَهْزِئُ مِنِّیْ وَاَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ آپ مجھ سے مذاق کرتے ہیں، حالانکہ آپ سارے جہانوں کے مالک ہیں۔

حدیث کے راوی صحابی، ابن مسعود جب اس روایت کو بیان کرتے تو ہنسنے لگتے، اور کہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی یونہی اس حدیث شریف کو بیان کرتے ہوئے ہنستے تھے جب آپ سے ہنسنے کی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے سے یہ سن کر کہ سارے جہانوں کے مالک ہو کر مجھ غریب سے مذاق کرتے ہیں، گنہگار کے اس فقرے پر اللہ تعالیٰ کو ہنسی آجائے گی، اور اس کے بعد اس غریب بندے سے ارحم الراحمین فرمائیں گے کہ میرے بندے میں تجھ سے مذاق نہیں کرتا لیکن جو میرے جی میں آتا ہے وہ کرتا ہوں۔

اس حدیث پر پہونچنے کے بعد شاہ صاحب کے جذبات چھپانے کے باوجود چھلک کر باہر آجاتے تھے اور اس قسم کی عام حدیثوں کو "مظرافت" میں شریک فرما کر آگے بڑھ جاتے تھے۔

اسی سلسلہ میں کبھی کبھی ان پر خاص جذبہ طاری ہوتا، تو طلبہ کی طرف مخاطب ہو کر فرماتے کہ تم سمجھتے ہو کہ میں کوئی بڑا کام کر رہا ہوں حالانکہ جانتے ہو، میری حیثیت وہی ہے، جو مدرسہ کے منیر خاں (۱) کی ہے

---

(۱) مدرسہ کے ایک بوڑھے ان پڑھ ملازم، یہ منیر خاں تھے۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

منیر خاں بھی چکی پیستے ہیں، اور میں بھی مدقق ہوں، دقیق (آٹا) پیستا ہوں، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں

دل کی حسرت

اس موقع پر خیال آتا ہے کہ بسا اوقات ان کی زبانِ مبارک سے فقیر ان الفاظ کو سنا کرتا تھا، فرماتے کہ

"مجھے کچھ نہیں چاہئیے، صرف دو پیالیاں کشمیری چائے کی، دو بسکٹ، ایک نیزہ، ایک گھوڑا" (۱)

بظاہر مطلب مولانا کا یہ ہوتا کہ اصلی اور صحیح زندگی ایک مومن مسلم کی یہ ہے کہ میدانِ جہاد میں اپنا وقت صرف کرے، ان کے دل کی یہی حسرت حقیقی حسرت تھی، اس کے مقابلے میں درس و تدریس، تعلیم و تعلم کے جذبات کی ان کی نظروں میں کوئی قدر و قیمت نہ تھی لیکن جیسے اللہ اور اس کے رسول علیہ السلام کے ساتھ اپنے صحیح

(صفحہ گذشتہ کا بقیہ) اور مسجد کے احاطہ کی طرف دروازے کے پاس ایک جھونپڑے میں مقیم تھے عموماً مدرسہ کے تعمیری کاموں کے لئے چکی میں چونا پیسا کرتے تھے، معلوم نہیں کہ ان کا انتقال کب ہوا، شاہ صاحب کے درس میں ان کا اکثر تذکرہ اس سلسلہ میں آتا رہتا تھا

(۱) مشروبات میں یہی ایک مرغوب مشروب ان کا تھا۔ تو درے کی چھت کے جنوبی سمت میں ٹھیک شمالی سمت کے اس کمرے کے مقابلے میں جس میں شاہ صاحب اور شیخ الہند درسِ حدیث دیتے تھے، ایک کمرہ، کافی وسیع و عریض و طویل، میرے زمانے میں شاہ صاحب کی قیامگاہ یہی کمرہ تھا۔ اس کے ایک گوشے میں لوہے کے چولھے پر کشمیری چائے کی دیگچی چڑھی رہتی تھی، دودھ جل جانے کی وجہ سے اس کا رنگ گلابی ہو جاتا تھا جب کبھی حاضر ہوتا، اس دیگچی کو گرم ہی پاتا، اس ساغر گرم سے استفادہ کا موقع کبھی کبھی اس فقیر کو بھی میسر آجاتا تھا نیز اس چائے خانے کے مولانا ادریس صاحب تھے، شاہ صاحب کی مخلصانہ خدمت کی سعادت مدتوں مولانا کو میسر آئی فہنیئاً لہم ہنیئاً کر۔

Toobaa-elibrary.blogspot.com

تعلقات کو کوشش کر کے چھپانے کے عادی تھے، اسی طرح وہ اپنے دل کی اس آرزو کے متعلق بجائے لمبی چوڑی تقریروں کے صرف مزاحی کنایوں اور اشاروں میں کبھی کبھی کچھ فرما کر

باہم نگرستیم وگریستیم وگذشتیم

کے نفسیاتی اثر کے ساتھ گزر جاتے۔

دورۂ حدیث کے اختتامی کلمات

دورۂ اختتام کی حد پر جب پہونچتا، تو اس وقت اپنے خاص انداز میں فرماتے کہ اب زیادہ دیر نہیں ہے کہ ان مرغوں کے ڈربہ کو کھول دونگا یہ مرغے جو ہمارے ارد گرد جمع ہیں۔ ڈربے سے نکلیں گے دیکھتا ہوں کہ بلندیوں پر چڑھ چڑھ کر بازوؤں کو پھڑپھڑاتے ہوئے کون بانگ دیتا ہے، کس کی آواز کتنی اونچی ہوتی ہے، اس قسم کے لطیفوں میں، وہ سب کچھ کہہ دیا کرتے تھے جو کہنا چاہتے تھے۔

زندگی کا نصب العین

خاکسار کو شاہ صاحب کے حلقۂ درس میں شرکت کی سعادت جن دنوں حاصل ہوئی تھی، اسوقت تک ازدواجی تعلقات سے آزاد تھے، عمر بھی ان کی اس زمانے میں بمشکل چالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی۔ اس زمانے میں ستر حال کی غیر معمولی کوششوں کا ان کے یہی رنگ تھا لیکن پچھلے دنوں جب خاکسار حیدر آباد سے دار العلوم کی مجلس شوریٰ میں شریک ہونے کے لئے آیا کرتا تھا، تو اچانک دیکھا کہ شاہ صاحب کے سیاہ بال سفید ہو چکے ہیں، ایک دفعہ خیال آتا ہے کہ دورہ ختم ہو چکا تھا۔ عصر کی نماز کے بعد طلباء کو داعی خطاب سے سرفراز کرنے کے لئے کھڑے ہو گئے، تو اب ان کا رنگ ہی دوسرا تھا۔ رسالتماٰب صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر پر وہ اپنے آنسوؤں کو ضبط کرنے کی قدرت کھو چکے تھے، ذکر مبارک آتا تو آواز بھرا جاتی اور خاص حال میں طلبہ سے کہتے!

"جاؤ ان ہی کے دین کی خدمت کو زندگی کا نصب العین بنا لینا"

نور اللہ ضریحہٗ وطاب ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ اللھم اغفر لہٗ وارحمہٗ کما ربیانی صغیرا

درسِ انوری کی ایک اور خصوصیت

حضرت شاہ صاحب کے حلقۂ درس کی ایک خصوصیت کا خیال ہی نہ آیا۔ حالانکہ درسِ انوری کا وہ لازمی جز تھا۔ شدتِ ظہور۔ کہتے ہیں کہ۔ کبھی خفاء کا سبب بن جاتی ہے، جسے سب سے زیادہ یاد رہنا چاہیئے وہی یاد نہ آیا، خیر قصہ یہ ہے کہ مجھ سے پہلے، اور میرے بعد والوں کا مشاہدہ اس باب میں کیا ہے؟ لیکن میں نے تو یہی دیکھا کہ صحیح مسلم کا درس ایک گھنٹہ یا اس سے کچھ زیادہ روزانہ ہوا کرتا تھا۔ اور پورا وقت علمی مباحث ومسائل ہی کی شرح وتفسیر، تطبیق وترجیح میں صرف ہوتا تھا، نہیں کہہ سکتا کہ اپنی اور طلباء کی طبیعت کے ملال وتکان کا خیال کر کے یہ طرزِ عمل شاہ صاحب نے اختیار کر رکھا تھا، یا فطرت میں ان کی ظرافت ومزاح کا جو فطری جذبہ تھا پوشیدہ تھا یہ اسکا اقتضا تھا کچھ بھی ہو درس کے پہلے دن سے دیکھنا شروع کیا کہ ہمارے ایک رفیقِ درس، جنکا نام مولوی محمد عیسیٰ تھا شاید بجھو نامی قصبہ کے رہنے والے تھے، بیچارے بڑے متین اور سنجیدہ اور نیک آدمی معلوم ہوتے تھے، شدتِ نیکی کی وجہ سے تعلق ان کا علم کے ساتھ بھی کچھ نیک ہی نیک سا تھا، شاہ صاحب کے متصل، دستِ چپ کی طرف شروع ہی سے انھوں نے اپنی جگہ بنالی تھی۔ وقت پر ٹھیک اپنی مقررہ جگہ پر آکر بیٹھ جاتے، شاید کسی دوسرے طالب علم کی ہمت بھی نہ ہوتی تھی کہ ان کی جگہ پر قبضہ کرے، ہوتا یہ تھا کہ کسی بلند وبالا مسئلہ پر شاہ صاحب کے معلومات کا بحرِ زخار موجیں مارتا ہوا چلا جاتا ہے، حافظ الدنیا، شیخ ابن ہمام، شمس الائمہ سرخسی، ابن نجیم کا ذکر ہو رہا ہے کہ اچانک شاہ صاحب مولوی محمد عیسیٰ کی جانب تبسمانہ لہجہ میں مخاطب

Toobaa-elibrary.blogspot.com

ہو جاتے، اور ان کی طرف خطاب کر کے کچھ فرماتے، صحیح الفاظ تو اس وقت یاد نہ رہے، اور الفاظ کی نوعیت ایک رہتی کب تھی، تاہم حاصل یہی ہوتا تھا کہ جو کچھ بیان کیا گیا گویا مولوی عیسٰی صاحب سے اس کی تصدیق چاہی جاتی تھی، بیچارے مولوی محمد عیسٰی خاموش مسکرانے لگتے، سارا حلقہ اسوقت صرف مسکراہٹ ہی مسکراہٹ اور تبسم ہی تبسم بن جاتا تھا "ہاں مولوی محمد عیسٰی صاحب تو اب آپ کی رائے اس مسئلہ میں کیا ہے" یہ یا قریب قریب اسی کے عموماً ان سے سوال کیا جاتا۔ بظاہر مولوی محمد عیسٰی صاحب کے وجود سے استرواح اور ازالۂ ملال وکلال کا کام لیا جاتا تھا۔ شاید ہی کوئی دن ایام درس کے طویل عہد میں، ایسا گزرا ہو جس میں دلوں کے انبساط وانشراح کا یہ موقعہ اوّل یا آخر یا وسط میں نہ نکل آتا ہو، معلوم نہیں ہمارے یہ رفیقِ درس آج کل کہاں ہیں؟ کس مشغلہ میں ہیں؟ اسی دنیا میں ہیں، یا اپنے محبوب استاذ اور سلفِ صالحین کے ساتھ لاحق ہو گئے، اگر اسی دنیا میں موجود ہیں تو ان سے معافی کا خواستگار ہوں۔ درسِ انوری کی اس خصوصیت سے سکوت پر دل راضی نہ ہوا۔

اللهم ارحمنی بعبادك العزالكرماء

★

باب ۹

شاہ صاحب اور علومِ قرآنی

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، اسلامی علوم وفنون کے دائرے کا شاید ہی کوئی علم وفن ہوگا، جس سے شاہ صاحب کو دلچسپی نہ تھی، اور ہر ایک علم وفن کے اصولی مسائل کے متعلق وہ خاص نظریہ نہ رکھتے ہوں، بلکہ عہدِ حاضر کے جدید کار آمد علوم کے صحیح معلومات کا بھی کافی ذخیرہ ان کے پاس موجود تھا، خصوصاً ہیئت (اسٹرانومی) کے جدید تمام شعبوں کا انھوں نے تفصیلی مطالعہ کیا تھا۔ انگریزی زبان سے تو ناواقف تھے، کبھی کبھی اگرچہ حلقۂ درس میں، ابتدائً جیسا کہ مجھے خیال آتا ہے، فرماتے تھے کہ کشمیر کے کسی عصری اسکول میں کچھ دن شریک ہونیکا موقع بھی ان کو ملا تھا، فرماتے کہ انگریزی زبان کے دو لفظ غالباً ایک (pig) اور دوسرا (FISH) یہی دو لفظ مجھے یاد رہ گئے ہیں۔ لیکن باایں ہمہ اسلامی عبادات کے متعلق کچھ دنوں سے "فیلاسوفی" نکالنے کا رواج جو چل پڑا ہے، وضو باعثِ نشاط ہے، اور ورزشِ جسمانی کا فائدہ نماز کے قیام وقعود سے حاصل ہوتا ہے اس قبیل مصالح وحکم ان شرعی امور کے جو بیان کئے جاتے ہیں، شاہ صاحب ان کی تعبیر "حکمت" سے کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ ارباب قانون وتفقہ کی نظر حکمت پر نہیں بلکہ حکم کی علت پر ہوتی ہے، مثلاً کہتے کہ سفر میں روزے کی تاخیر

Toobaa-elibrary.blogspot.com

کی حکمت تو یہ ہے کہ مشقت سے بچانا مقصود ہے، لیکن سفر میں تاخیر صوم کی یہ علت نہیں ہے، اسی لئے ایسا مسافر جسے سفر میں روزہ رکھنے کی سہولت ہی کیوں نہ میسر ہو، وہ تاخیر صوم کے اس قانون سے مستفید ہو سکتا ہے، قانون کا فیصلہ یہی ہوگا بہر حال شرائع کے متعلق حکمت نوازیوں کے اس مذاق کی شاہ صاحب حوصلہ افزائی نہ فرماتے تھے، اس سلسلہ میں عموماً حضرت گنگوہی کی طرف منسوب کر کے سنایا کرتے تھے کہ کسی نے تشہد میں انگلیوں کے اٹھانے کی مصلحت یا حکمت آپ سے دریافت کی، تو سوال کو بے پروائی سے سنتے ہوئے شاید یہ فرمایا کہ ان باتوں میں کیا رکھا ہے" جی میں آئے تو یہ کہدیا جا سکتا ہے انگلی تشہد کی اٹھا کر اقرار توحید کیا گیا، اور دوسری انگلیوں کو بند کرنے کا یہ مطلب لیا جائے کہ اسی توحید کے ساتھ اپنے دل کے اعتقاد کو نمازی وابستہ کرتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ نماز روزہ کے فلسفہ سے شاہ صاحب کو کوئی دلچسپی نہ تھی، اور جیسے کہتے ہیں کہ سور حرام ہے تو اپنی نجاست کی وجہ سے ہے۔ اور آدمی کا گوشت بھی حرام ہی ہے، لیکن کرامت کی وجہ سے۔

اسی طرح شاہ صاحب کتابوں میں اگر کسی کتاب سے مرعوب اور حد سے زیادہ مرعوب تھے تو وہ اللہ کی کتاب، قرآن تھی قرآنی آیات کی تشریح و تفسیر میں آج جن بے جا جسارتوں کا مشاہدہ ہم کر رہے ہیں، اسکو دیکھ کر اب سمجھ میں آتا ہے کہ قرآن اور قرآنیات کے ساتھ حضرت شاہ صاحب کے سکوت کا راز کیا تھا، کبھی کبھی اس باب میں کچھ سنا بھی تو یہ سنا کہ بعض غالی عقیدت مندوں نے یہ جو مشہور کر رکھا ہے کہ دین اور دنیا کا کوئی کلی و جزئی مسئلہ ایسا نہیں ہے، جو قرآن میں موجود نہ ہو، یا قرآن سے نکالا نہ جا سکتا ہو، اس خیال کی شدت سے تردید فرماتے تھے، فرماتے کہ کسی بڑے غبی کا یہ شعر ہے۔

جمیع العلم فی القرآن لٰکن   تقاصر عنہ افہام الرجال

یعنی سارے علوم قرآن میں موجود ہیں لیکن لوگوں کی سمجھ اس کو پانے سے قاصر ہے، مگر اپنی تقریر کو بس اسی غلط خیال کی تردید تک محدود رکھتے، لیکن یہ سوال کہ پھر قرآن میں کیا ہے؟ یا اس کی بحث کا حقیقی موضوع کیا ہے؟ کم از کم مجھے تو اس باب میں ان کا کوئی خاص خیال معلوم نہ ہو سکا، بعض خانگی صحبتوں میں ڈرتے ڈرتے فقیر نے ایک دفعہ اس پہلو کے متعلق کچھ دریافت بھی کرنا چاہا، لیکن کچھ تو انکے علم و تقویٰ اور شخصیت سے غیر معمولی مرعوبیت کیوجہ سے اپنی دلی بات کو واضح لفظوں میں پیش نہ کر سکا، اور انھوں نے میرے اس سوال کو جس توجہ سے چاہیئے تھا سنا بھی نہیں، بعد کو مشکلات القرآن کے نام سے ان کے بعض ارشد تلامذہ نے ایک مجموعہ شائع بھی کیا ہے، لیکن میرا احساس اس کے بعد بھی یہی ہے کہ قرآن کی غیر معمولی عظمت اور جلال، ان کو اس کتاب کی طرف اس طریقہ سے متوجہ ہونے کی اجازت ہی نہیں دیتا تھا، جیسے وہ انسانوں کی بنائی ہوئی کتابوں کا مطالعہ فرمایا کرتے تھے۔

بہر حال سیدنا الامام الکشمیری سے براہ راست قرآن پڑھنے کا موقع تو مجھے نہ مل سکا، لیکن حدیث ہی کے درس میں، جہاں دوسرے علوم و فنون کے مسائل کی طرف شاہ صاحب کا ذہن منتقل ہوتا رہتا تھا، اور اپنے اس ذہنی انتقال کا حضرت والا نے اپنی خاص اصطلاح میں "دفاع" نام رکھ لیا تھا، درس کی تقریر کرتے ہوئے قاعدہ تھا کہ بیچ بیچ میں فرماتے کہ دفاع ہو گیا اس وقت مجھے اصول فقہ کے فلاں مسئلہ کی طرف، یا معانی و بیان و بدیع کے نکات کیطرف۔

پچھلے تینوں علوم یعنی معانی بیان، بدیع جن میں عربی زبان کی نثر و نظم کے محاسن اور خوبیوں کے سمجھنے کا سلیقہ ہی قاعدوں کی مدد سے اس لئے پیدا کرنے کی کوشش کیجاتی ہے کہ قرآنی تعبیروں کے اعجازی پہلوؤں کی یافت کی صلاحیت طلبہ میں نشو و نما پائے، لیکن بجز حضرت شاہ صاحب کے کم از کم میں نے تو کسی مولوی کو

Toobaa-elibrary.blogspot.com

ہا نہیں دیکھا۔

جسے صرف یہی نہیں کہ ان علوم کے مسائل مستحضر ہوں، بلکہ ان کے کلیات کو جزئیات پر منطبق کرنے کی مہارت رکھتا ہو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاہ صاحب نے ان علوم کا مطالعہ غیر معمولی شوق اور دلچسپی کے ساتھ کیا تھا، قرآنی آیات حدیث کے فقروں، عربی زبان کے اشعار کے ساتھ کبھی کبھی فارسی بلکہ کبھی اردو تک اشعار کے ان پہلوؤں کو نمایاں کر کے طلبہ کے ادبی مذاق کو بلند کرنا چاہتے تھے، کیونکہ سخن طرازی اور عبارت آرائی کے لئے، گو فطری مناسبت کی ضرورت ہے، لیکن سخن سنجی اور سخن فہمی کا سلیقہ مصنوعی کد و کاوش سے بھی پیدا ہو سکتا ہے مگر سچی بات یہی ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے درس کا یہ پہلو بھی عموماً طلبہ کے لئے کچھ غیر مفید ہی سا بن کر رہ جاتا تھا، محروموں میں دوسروں کے ساتھ خود یہ فقیر بھی تھا تاہم اسی ذریعے سے کبھی کبھی قرآن و قرآنیات کے متعلق شاہ صاحب کے خصوصی نقاط نظر کے سننے کا موقع مل گیا، اور نہیں کہہ سکتا ان ہی گنی چنی باتوں سے کتنے بیشمار فوائد مجھے حاصل ہوئے۔

قرآن سہل ہونیکا مطلب

مثلاً ایک خیال ان کا یہ تھا ولقد یسرنا القرآن للذکر، ہم نے آسان کیا ہے قرآن کو چونک پیدا کرنے کیلئے، یا اسی قسم کی دوسری آیتوں میں سہولت اور آسانی، اپنی خصوصیت قرآن نے جو قرار دی ہے، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قرآنی معارف و حقائق کی گہرائیوں تک ہر کہہ و مہہ کی رسائی آسان ہے بلکہ حق تعالیٰ کی مرضی مبارک کے مطابق زندگی بسر کرنے کا جو طریقہ قرآن میں پیش کیا گیا، اس کا ذکر کچھ ایسے انداز میں قرآن کے اندر کیا گیا ہے کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ میری سمجھ میں نہیں آیا، اس بارے میں قرآن کا طریقہ خطاب اتنا واضح صاف و شستہ اور روشن ہے کہ کوئی سمجھنا ہی نہ چاہے تو یہ دوسری بات ہے۔ ورنہ قرآن

اپنی حجت پوری کر چکا ہے۔ مثلاً توحید و شرک کے مسئلہ میں قرآن پڑھنے اور سمجھنے کے بعد بھی مشرکانہ کاروبار میں کوئی الجھا ہوا نظر آئے، تو یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ قصداً وارادۃً قرآنی مطالبات سے کترا رہا ہے، بلکہ کہا جائے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ ٹکرا رہا ہے اور بغاوت کی راہ اختیار کر رہا ہے۔

حضرت شاہ صاحب کے اس نکتہ کو فقیر کبھی کبھی اس تمثیل کے رنگ میں اپنے طلبہ کے سامنے پیش کرتا تھا کہ، جمادات نباتات، آب و آتش، خاک و باد وغیرہ کی شکلوں میں مادّے کا جو ذخیرہ تمہارے سامنے پھیلا ہوا ہے، یہ خدا کا کام ہے۔ اسکا ایک پہلو تو یہ ہے کہ ہر عامی و خاصی، جاہل و عالم کی ضرورت اس سے پوری ہوتی ہے۔ بلکہ انسانوں سے آگے بڑھ کر دیکھنا چاہتے ہو تو جو عقل سے محروم ہیں، یعنی حیوانات وہ بھی مادّے کے اس ذخیرے سے مستفید ہو رہے ہیں، ان میں ہر ایک کی شخصی ونوعی بقاء کی ضمانت استفادے کے اس عام پہلو کے ساتھ وابستہ ہے، اپنے اپنے ظرف اور اپنی اپنی ضرورت کے مطابق سب ہی اسی سے اپنا حصہ تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے حاصل کرتے چلے آ رہے ہیں، اور اس وقت بھی حاصل کر رہے ہیں۔ اور آئندہ رہتی دنیا تک عام افادہ اور استفادہ کا یہ قصہ یوں ہی جاری رہیگا۔

لیکن اسی کے مقابلے میں مادّے کے اسی ذخیرے اور اسی کے مختلف مظاہر کے ساتھ تعلق ہی کی دوسری نوعیت وہ ہے، جو سائنس اور حکمت والے، اس سے رکھتے ہیں، یہی مٹی، یہی پانی، یہی لوہا، یہی ہوا، یہی لکڑی، یہی معدنیات اور جمادات ان کے سامنے بھی ہیں، جیسے ہر دیکھنے والے کے سامنے ہیں، مگر حکمت و سائنس والے ان ہی پیش پا افتادہ چیزوں کے اندر غور کرتے ہیں، ٹٹولتے ہیں، ڈھونڈھتے ہیں تجربات کرتے ہیں، اور آئے دن ان سے نت نئے نوامیس و اسرار کا انکشاف ہوتا رہتا ہے، اور کیسے کیسے انکشافات کہ ہم جن باتوں کو سوچ بھی نہیں سکتے تھے، آج ان ہی مادی انکشافات کی بدولت وہی ہمارے سامنے ہیں، سائنس والوں کے

Toobaa-elibrary.blogspot.com

طفیل سے ہم ان کو برت رہے ہیں، موٹروں پر چلتے ہیں، ہوائی جہازوں پر اُڑ رہے ہیں، گھر بیٹھے سارے جہاں کی خبریں سنتے ہیں۔

عرض کیا کرتا تھا کہ قدرت کے کام کا یہ رنگ جو نظر آرہا ہے کچھ یہی حال اس قدرتی کلام کا بھی ہے جسے ہم "القرآن" کہتے ہیں ضرورت کی حد تک تو اس کتاب پر ایمان لانے والوں میں ہر ایک اس سے مستفید ہو رہا ہے۔ اپنی اپنی حاجت کے مطابق اپنا اپنا حصہ ہر ایک اس قدرتی کلام سے حاصل کر سکتا ہے، اور کر رہا ہے لیکن اس قدرتی کلام کے ساتھ دوسرا تعلق ان لوگوں کا ہے، جو تدبّر وتذکر دولت سے سرفراز کئے گئے ہیں، یہی لوگ قدرتی کلام کے حکماء (سائنٹسٹ) ہیں، ان کی انھیں آیتوں میں جنھیں پڑھنے والے پانچوں وقتوں کی نمازوں میں دہراتے رہتے ہیں۔ اسرار ورموز کا سمندر موجیں مارتا نظر آتا ہے بعض روایتوں میں قرآن کی خصوصیتوں کو بتاتے ہوئے اسی کی شان کا ایک اظہار لا تنقضی عجائبہٗ ولا یخلق علیٰ کثرۃ الرّد (اس کے یعنی قرآن کے عجائب (یعنی ایسے انکشافات جو لوگوں کو حیرت میں ڈالدیں ختم نہ ہوں گے، اور بار بار دہرائے جانے کیوجہ سے یہ کلام کبھی پرانا نہ ہوگا) کے الفاظ میں جو کہا گیا ہے، سمجھنے والوں کے نزدیک ان الفاظ کا یہی مطلب ہے۔ (۱)

---

(۱) تقریباً تیس اکتیس سال پہلے رسالہ القاسم میں خاکسار نے کائناتِ روحانی کے عنوان سے ایک مقالہ شائع کرایا تھا جس میں قدرت کے کام اور قدرت کے کلام کی باہمی مشابہتوں کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرنیکی کوشش کی گئی ہے، بعد کو رسالے کی شکل میں بعض قدر فرماؤں نے اس مضمون کو چھاپ دیا اب بھی بعض تجارتی کتب خانوں میں یہ رسالہ مل جاتا ہے۔ غالباً مکتبہ الفرقان لکھنؤ میں اس کے کچھ نسخے ابھی محفوظ ہیں۔ کوئی صاحب دیکھنا چاہیں تو وہاں سے منگوا سکتے ہیں

میں نے مراجعت کی تو حسن اتفاق سے بخاری شریف کی املائی شرح فیض الباری میں قرآن کے متعلق حضرت شاہ صاحب کے اس نقطۂ نظر کا بھی دیکھا کہ ذکر کر دیا گیا ہے، جامع تقریر نے حضرت شاہ صاحب کے مقصد کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے، یعنی فرماتے ہیں۔

لیس معنی قولہ تعالیٰ ولقد یسّرنا القرآن الخ، ان کنہ یحصل لکلّ من جبل وقیل بل معنی یسرہ انّہٗ لیغترف منہ کل علیل ویشتفی منہ کل علیل فیھتدی منہ کل احد الیٰ ما یرضی ربّہٗ و الیٰ ما یسخط عنہ ولا یحتاج فی ذالک الیٰ کبیر تنقیر و تفکیر اما معانیہ الغامضۃ مزایاہ الرائقۃ ومرامیہ الناعمۃ فقد انقصمت ظھور الفحول عن اِدراکھا وعجزت الافکار عن الطواف حول حریمھا۔ فیض الباری ص ۸۷ ج ۴

حق تعالیٰ کے ارشاد ولقد یسرنا القرآن (یعنی ہم نے قرآن کو آسان کر دیا) کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر کہہ ومہہ کی رسائی قرآن کے کنہ اور تہ تک آسان کی گئی ہے، بلکہ اس آسانی سے مراد یہ ہے کہ ہر پیاسے کو موقع دیا گیا ہے کہ اس سرچشمہ سے پانی پی سکتا ہے، اور ہر بیمار اس سے اچھی شفا حاصل کر سکتا ہے۔ یعنی جن باتوں سے اللہ خوش ہوتے ہیں، اور جن باتوں کو ناپسند کرتے ہیں، ان کو وہ پا سکتا ہے اس کیلئے مزید کِدوکاوش سوچ بچار کی ضرورت نہیں۔ باقی قرآن کے گہرے معانی، اس کے عمیق وشاداب پہلوؤں اور جن دلآویز حقائق کی نشاندہی اس کتاب میں کی گئی ہے، تو ان کی یافت کچھ آسان نہیں ہے مردانِ راہ کی پیٹھیں، اس نے توڑ دیں، اور ان لطائف ورموز کے احاطہ تک پہونچنا، ان کے گرد چکر کاٹنا، اس نے بڑے بڑے سوچنے والوں کو تھکا مارا ہے۔

Toobaa-elibrary.blogspot.com

کیا قرآن میں سب کچھ ہے

اسی کے ساتھ حضرت شاہ صاحب وقتاً فوقتاً طلبہ کو اس پر بھی متنبہ فرماتے تھے کہ قرآن کے نادان دوستوں میں یہ عامیانہ خوش اعتقادی جو پھیلی ہوئی ہے کہ قرآن میں سب کچھ ہے، گویا کچھ یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ خدا سب کچھ چونکہ جانتا ہے، اس لئے چاہیے کہ اس کتاب میں سب کچھ ہو۔

وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِي كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ۔ / نہیں ہے کوئی تر یا خشک بات مگر کتاب مبین میں سب کچھ ہے

یہ یا اسی کے ہم معنی وہم مفہوم آیتوں کو تائید میں پیش کر دیا جاتا ہے، اس میں شک نہیں کہ اہل علم کے سنجیدہ طبقات میں اس قسم کی خوش اعتقادیوں کی کبھی ہمت افزائی نہیں کی گئی لیکن کھلے کھلے صاف الفاظ میں اس عامیانہ احساس کا ازالہ شاہ صاحب کے حلقۂ درس میں بار بار مختلف پیرایوں سے جس زور و قوت کے ساتھ کیا جاتا تھا، اس کے تأثرات ابتک اپنے اندر پاتا ہوں۔ ان ہی کی زبان مبارک سے غالباً پہلی مرتبہ یہ عربی شعر سنا تھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ کسی غبی کا شعر ہے ؎

جميع العلم في القرآن لكن / تقاصر عنه افهام الرجال

یعنی سارے علوم قرآن میں موجود ہیں لیکن لوگوں کی سمجھ ان کے پانے سے کوتاہ ہو کر رہ گئی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اپنے معلومات کو ظاہر کرنے کے لئے قرآن کو خدا نے نازل کیا ہے، اگر یہ مانا جائے، تو ساری کائنات بھی کاغذ کی شکل اگر اختیار کر لیتی جب بھی خدائی معلومات کے لئے وہ قطعاً کافی نہ ہوتے، میں تو کہتا ہوں کہ غریب جاہل آدمی اپنے معلومات کو قلمبند کرنا چاہے، تو ان کے لئے مجلدات کی ضرورت ہوگی، پھر خدائی معلومات تو خدائی معلومات ہیں، اور معلومات کا اظہار مقصود اگر نہیں ہے، بلکہ نسلِ انسانی اپنے صحیح انجام تک علم و عمل کے جس نظام کی پابندی کر کے پہونچ سکتی ہے۔ فقط نظام کے بنیادی کلیات سے آگاہ کرنے کیلئے قرآن

نازل ہوا ہے، اور یہی اس کتاب کی بحث کا اساسی و جوہری موضوع ہے بھی، تو تو اس کے سوا قرآن میں خارج از موضوع معلومات کا تلاش کرنا، نہ صرف ان تلاش کرنیوالوں کی غباوت و بلادت ہی کی دلیل ہے، بلکہ قرآن کے نازل کرنے والے کی طرف ایک ایسے نقص کو منسوب کرنے کی یہ جرأت ہوگی، جسے بہ ثبات عقل و ہوش کوئی صاحب تمیز و خرد آدمی بھی اپنی کسی تصنیف کے متعلق شاید یہ برداشت نہیں کر سکتا، آخر طب کی کسی کتاب میں شرحِ وقایہ کے فقہی مسائل، یا شرحِ وقایہ میں امیر اور داغ کے کلام کے تنقیدی مضامین کو جو ڈھونڈھے گا، اس کے جنون میں کیا کوئی شبہ کر سکتا ہے۔

یاد آتا ہے کہ مذکورہ بالا شعر کو شاہ صاحب اکثر دہراتے، کبھی تو کہنے والے کو صرف غبی ہی کہدینے پر اکتفا کرتے، اور جب زیادہ جلال آتا تو کہتے کہ کس غبی الاغبیاء کا یہ شعر ہے ؎

دافسوس ہوتا ہے کہ افواہی قصول ہتک بات محدود رہتی تو غنیمت تھا، صاحب نورالانوار ملا جیون رحمۃ اللہ علیہ نے جو علماء ہند میں واقعی غیر معمولی فضل و کمال کے حامل ہیں، اپنے عنفوان شباب میں قرآن کی ایک مختصر سی تفسیر لکھی ہے، جو تفسیراتِ احمدیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس عمر میں ملا صاحب کی یہ کتاب واقعہ یہ ہے کہ ان کے اس شاندار علمی مستقبل کی دلیل ہے، جس کا مشاہدہ بعد کو لوگوں نے کیا، لیکن پھر بھی کم عمری کی وجہ سے تفسیر کے دیباچہ میں ان کے قلم سے یہ فقرہ نکل گیا ہے فما من شيئ الا يمكن استخراجه من القرآن، کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کا نکالنا قرآن سے ممکن نہ ہو، اسی سلسلے میں مثالاً لکھتے ہیں کہ بعضوں نے قرآن سے علم ہیئت، ہندسہ اور نجوم کے مسائل نکالے ہیں، ملا صاحب کے اس قول پر بمبئی کے کوئی مولوی جن کا نام المولوی رحیم بخش بتایا گیا ہے، اور لوحِ کتاب میں ان کے نام کے ساتھ آیۃ من آیات اللہ کے الفاظ بھی لکھے ہوئے ہیں، ان مولوی رحیم بخش صاحب نے حاشیہ میں یہ اضافہ فرمایا

Toobaa-elibrary.blogspot.com

ہے کہ ہندسہ، علم ہیئت، نجوم ہی نہیں، قرآن سے تو جبر و مقابلہ، حجامت، حدادت نسج و غزل یعنی سوت بنانے تاگہ بٹنے، فلاحت زراعت، صباغت و زرگری) طباخی وغیرہ وغیرہ فنون کے مسائل نکالنے میں کامیابی حاصل کی ہے، دعویٰ کرکے دلائل میں جن آیتوں کی یہ لوگ تلاوت کرتے ہیں، تو وہی لطیفہ جاہل پیر کا آجاتا ہے، پیر صاحب اپنے مریدوں کو باور کرا رہے تھے کہ قرآن میں سب کچھ ہے، اتنے میں کسی نے آکر دریافت کیا کہ ایک شخص مرگیا ہے، دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ ماں بھی اس نے چھوڑی ہے پھر اس کا ترکہ کس کس کو دیا جائے۔ پیر صاحب نے فرمایا کہ تو نے سورۂ تبت یدا ابی لہب نہیں پڑھی ہے، اس میں تو صاف لکھا ہے کہ "ما کسب" یعنی سب کچھ ماں کا ہے، ماقدروا اللہ حق قدرہ کے سوا ایسے موقعوں پر اور کیا پڑھا جائے۔

تفسیرات احمدیہ کے دیباچہ میں ہی ملّا صاحب نے لکھا ہے کہ طالب علمی سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے، اور انکی عمر اکیس سال سے متجاوز نہیں ہوئی تھی، عالمگیر کے ایام حکومت میں یہ تفسیر لکھی گئی ہے دیکھو ص۳ مطبوعہ مطبع کریمیہ بمبئی "ولا رطب ولا یابس" وغیرہ جیسی آیتوں کا مطلب یہی ہے کہ اپنے خاص موضوع بحث کے لحاظ سے قرآن میں کوئی بات چھوٹ نہیں گئی ہے، بشرطیکہ کتاب مبین سے مراد قرآن ہی ہو "تبیانا لکل شیئ" وغیرہ کے متعلق یہ سمجھنا چاہیے کہ جیسے تدمر کل شیئ (عاد کی آندھی) ہر چیز کو ڈھاتی چلی جاتی تھی، اس میں کل کا لفظ ظاہر ہے کہ منطقیوں کے موجبہ کلیہ کا سور نہیں ہے، جس میں ہر شیئ داخل ہو۔ بلکہ ڈھے جانے کی صلاحیت جن چیزوں میں تھی انکو آندھی برباد کر رہی تھی۔

قرآنی تعبیروں کے متعلق ایک عالمانہ نکتہ

بلکہ اس باب میں قرآن کے پیرایہ بیان اور طریقہ تعبیر کے ایک خاص پہلو کی طرف بھی شاہ صاحب اشارہ فرمایا کرتے تھے، اس کو

اگر سمجھ لیا جائے تو بہت سی غلط فہمیوں کا خودبخود ازالہ ہو جاتا ہے اور بیسیوں بے معنی الجھنوں سے نجات مل جاتی ہے، مطلب یہ ہے کہ قرآن میں مثلاً حکم دیا گیا ہے کہ کیا تم اونٹ کو نہیں دیکھتے، یا آسمانوں یا زمین کو یا پہاڑوں کو نہیں دیکھتے، الغرض دیکھنا (نظر و بصر) ایک انسانی فعل ہے، جس کو قرآن عموماً گردوپیش کی طرف منسوب کرتا ہے، اب کوئی یہ کہنے لگے کہ آدمی درحقیقت رنگ کو دیکھتا ہے، رنگ کو بھی نہیں، بلکہ روشنی سے حقیقی تعلق آدمی کی قوت بینائی کا قائم ہوتا ہے، اور روشنی کے توسط سے رنگوں (ہرے، پیلے، سبز وغیرہ) کو دیکھتا ہے، لیکن جو چیز نہ روشنی ہے، نہ رنگ اس کے ساتھ بینائی کا تعلق ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ بینائی کی گرفت میں ہوا، مثلاً اسی لئے تو نہیں آتی کہ وہ بے رنگ ہے، اس میں شک نہیں کہ قدیم و جدید حکیمانہ تحقیق کا نتیجہ یہی ہے بھی اب سائنس کی اس تحقیق کو بنیاد بنا کر قرآن پر کوئی معترض ہو کہ جو چیزیں نہ رنگ ہوں، نہ روشنی، انکی طرف بصر یا نظر (یعنی بینائی اور دیکھنے) کو منسوب کرکے قرآن نے ایک ایسی بات کہی ہے، جو واقعہ کے مطابق نہیں ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ اعتراض قرآن پر اعتراض کرنیوالے کے مخبوط ہونے کی دلیل ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ اپنے احساسات و تاثرات کی تعبیر کا جو عام طریقہ انسانوں میں مروج ہے، اسی طریقہ تعبیر کو اختیار کرکے قرآن باتیں سمجھاتا ہے، اور قرآن ہی کیا، یوں بھی سائنس اور فلسفہ کے مسائل کا کوئی خبطی اپنی بیوی سے کہہ بیٹھے کہ تم کو اگر میں دیکھوں تو تم پر طلاق پڑ جائے۔ اس کے بعد بیوی کے دیکھنے کے بعد دعویٰ کرے کہ میں نے بیوی کو کب دیکھا ہے۔ میں نے تو صرف اس رنگ کو دیکھا ہے، جو اسکے چہرہ کی کھال پر چڑھا ہوا ہے، اور اس لئے کہتا پھرے کہ طلاق نہیں پڑی۔ پاگلخانوں کے سوا ایسوں کے لئے کوئی اور بھی کہیں جگہ ہو سکتی ہے، اس مثال کو سمجھانے کے بعد فرمایا کرتے کہ قرآن میں اس قسم کی آیتیں جو پائی جاتی ہیں جن میں حرکت اور جاری ہونے کے تعلق کو آفتاب و ماہتاب کیطرف منسوب کیا گیا ہے، مثلاً والشمس تجری لمستقر لہا۔

Toobaa-elibrary.blogspot.com

آفتاب اپنے ٹھکانے کیلئے جاری ہے وغیرہ جیسی آیتوں میں یہی کہا گیا ہے تو اس کا مطلب بھی ظاہر ہے کہ یہی ہو سکتا ہے بلکہ یہی ہے کہ اپنے مشاہدات و احساسات کی جو تعبیر لوگوں میں عموماً مروج ہے، اسی طریقہ تعبیر اور پیرایۂ بیان کو قرآن نے اختیار کیا ہے، جیسے نظر اور بصر (بینائی) کو ان ہی چیزوں کی طرف قرآن نے منسوب کر دیا ہے جس کی طرف منسوب کرنے کا رواج ہے لیکن نظر و بصر کے متعلق جیسے یہ سمجھا جاتا ہے کہ واقعی بینائی کا حقیقی تعلق جن چیزوں سے ہوتا ہے اس حقیقت کا اظہار یہ قرآن کا مقصود نہیں ہے، اسی طرح آفتاب و ماہتاب کی طرف جاری ہونے کے فعل کے انتساب کو یہ سمجھ لینا کہ رات اور دن کا جو چکر ہمارے سامنے جاری ہے، اس کی اصل حقیقت کو قرآن واشگاف کرنا چاہتا ہے، اس کا مطلب تو پھر وہی ہوا کہ اپنی معلومات کو ظاہر کرنے کے لئے قرآن کو حق تعالیٰ نے نازل فرمایا لیکن جب معلوم ہو چکا کہ قرآن کے موضوع بحث سے جو جاہل ہے وہی اس قسم کے مالیخولیا میں مبتلا ہو سکتا ہے، تو حوادث کائنات کی توجیہ و تاویل کے قصوں کو قرآن میں ڈھونڈھنا، یا اس سلسلہ میں قرآن کی طرف کسی قطعی فیصلہ کی جرائت خود اپنی عقل کی بھی اہانت ہے، اور ایسے عیب و نقص کو قرآن کی طرف منسوب کرنا ہے جسے غرض کر چکا ہوں کہ کوئی صحیح العقل آدمی بھی اپنی تصنیف میں پسند نہیں کر سکتا، دیوانہ ہی ہوگا جو تاریخ کی کتاب میں ڈاکٹری نسخوں کا ذکر چھیڑ دے، یا طب کی کتاب میں شعر و ادب کی تنقید ڈھونڈھنے لگے۔ بہرحال رات اور دن کے الٹ پھیر کے واقعی اسباب خواہ کچھ بھی ہوں زمین گھومتی ہو، یا آفتاب چکر کھا رہا ہو، یا آسمان گردش میں ہو، قرآنی مباحث کے دائرے سے یہ سوالات خارج ہیں۔

شاہ صاحب ہی فرمایا کرتے تھے کہ اس سلسلہ میں اپنی تعبیروں کو عام انسانی احساسات کے مطابق اگر قرآن رہنے نہ دیتا مثلاً رات دن کے اسی قصہ میں اعلان کر دیتا کہ زمین کی گردش کا یہ نتیجہ ہے، تو اس کا مطلب یہی ہوتا کہ جب تک زمین کی گردش کا مسئلہ طے نہ ہوتا قرآن پر ایمان لانے سے لوگ محروم رہتے۔ کہا کرتے

تھے کہ لوگ دن رات ہی کے ایک قصہ میں الجھے ہوئے ہیں لیکن حقیقت کی پیشگاہ میں انسانیت جب داخل ہو گی السرائر (پوشیدہ حقائق) ابل کر اپنی اصلی شکلوں میں جب سامنے آجائیں گے، تو اسوقت پتہ چلے گا کہ دن اور رات کے الٹ پھیر ہی کی صرف یہی ایک بات نہیں، بلکہ جو کچھ دیکھا سنا جا رہا ہے چکھا اور چھوا جا رہا ہے (۱) الغرض ہمارے احساسات کا بڑا حصہ معلوم ہوگا کہ ان کی نوعیت ان حالات سے مختلف ہے جنھیں اسوقت ہم پا رہے ہیں، گویا وبدا لھم من اللہ ما لم یکونوا یحتسبون کی قرآنی خبر چہرے سے نقاب الٹ کر سامنے آجائے گی، تب پتہ چلے گا کہ ہم کیا سوچتے تھے، اور اب کیا ہو رہا ہے۔

---

(۱) چھونے یعنی قوت لامسہ کی بوالعجبیوں کو دیکھئے کہ موسم سرما میں عموماً سمجھا جاتا ہے کہ کنوؤں کا پانی گرم ہو جاتا ہے، اور کتنا گرم کہ تازہ پانی ڈول میں جب نکالا جاتا ہے، تو تھوڑی دیر تک اس سے بھاپ بھی نکلتی رہتی ہے، لیکن تحقیق نے ثابت کر دیا کہ کنوئیں کے پانی کا ٹمپریچر (درجہ حرارت) جو گرمی کے موسم میں رہتا ہے، سردیوں کے موسم میں اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوتی ہے، البتہ پانی کے چھونے والوں کی قوت لامسہ سردیوں میں ٹھنڈک سے متأثر ہو جاتی ہے یعنی ہاتھ آدمی کا زیادہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے، اس لئے کنوئیں کے پانی کے درجۂ حرارت کے احساس میں فرق پیدا ہو جاتا ہے، اور وہی پانی جو گرمی میں ٹھنڈا محسوس ہو رہا تھا، سردیوں کے موسم میں معلوم ہوتا ہے کہ گرم ہے، شدت برودت (ٹھنڈک کے بڑھ جانے) کی وجہ سے بخارات جو گرمی سردی ہر زمانے میں پانی سے اٹھتے رہتے ہیں۔ ان بخارات میں فضا کے ٹھنڈے ہونے کی وجہ سے تکاثف کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، اور ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پانی سے بھاپ نکل رہی ہو، دیکھا آپ نے واقعہ کیا ہے، لیکن اسی واقعہ کے متعلق ہمارے احساسات کی نوعیت کیا ہے، اس کی بیسیوں مثالیں آپ کو سائنس کی کتابوں میں مل سکتی ہیں

★

Toobaa-elibrary.blogspot.com

یہ بھی کہا کرتے کہ لیل ونہار کا انقلاب، زمین کی گردش کا نتیجہ ہے، حالانکہ علم کے عصری حلقوں میں اس کو ایک ثابت شدہ، غیر مشتبہ فیصلہ قرار دیا جا چکا ہے۔ لیکن با ایں ہمہ بولنے والے اب بھی جب بولتے ہیں تو یہی کہتے ہیں کہ آفتاب غروب ہو رہا ہے، طلوع ہو رہا ہے، سورج سمت الراس پر آ گیا۔ یہ کیا ہے؟ وہی بات ہے کہ افہام و تفہیم میں عام قاعدہ یہی ہے کہ عام احساسات کے مطابق تعبیریں اختیار کی جاتی ہیں۔ بجائے اس کے کوئی طلوع کی اطلاع دیتے ہوئے کہنے لگے کہ گھومتے ہوئے زمین اس نقطہ تک پہونچ چکی ہے کہ جہاں سے آفتاب کا کنارہ دکھائی دیتا ہے، اور خیال کر لے کہ واقعہ کی صحیح نوعیت یہی ہے، ممکن ہے کہ واقعہ یہی ہو[1] لیکن یہ طریقۂ تعبیر غلط ہے، آپ نے

---

(۱) مطلب یہ ہے کہ انقلاب لیل ونہار یعنی رات دن کے الٹ پھیر کا مشاہدہ تو ایک عام مشاہدہ ہے۔ مگر ایسا کیوں ہو رہا ہے، کیا چراغ ہی گھوم رہا ہے، یا چراغ سے جو چیز روشن ہو رہی ہے، اسکی گردش سے الٹ پھیر کی یہ صورت سامنے آتی ہے، حقائق کائنات پر غور کرنے والوں کے حلقہ کا یہ پرانا سوال ہے۔ حکیم فیثاغورس کا دعویٰ تھا کہ چراغ یعنی آفتاب نہیں، بلکہ زمین ہی آفتاب کے گرد چکر لگا رہی ہے، مگر بطلیموسی نظام میں فیثاغورس کے اس نظریہ کو رد کر دیا گیا، اور شب و روز، نیز موسموں کی تبدیلیوں کی توجیہ یہ تسلیم کی جاتی رہی کہ آسمان گھوم رہا ہے جیسا کہ معلوم ہے، پچھلے دنوں یورپ کے بعض ارباب نظر نے مختلف آلاتی تجربات سے فیثاغورس کے پرانے خیال کو زیادہ قرین قیاس پایا، اور ہمارے زمانے کی جدید ہیئت کے سارے نتائج اسی مسئلہ پر مبنی کر کے پیدا کئے جاتے ہیں لیکن زمین کی حرکت کی نوعیت اسوقت تک غیر منفصل ہے، حال میں ایک روسی ریاضی داں الگزنڈر ازوٹاف کی طرف سے یہ دعویٰ پیش ہوا ہے کہ ایک ہی محور پر زمین گردش نہیں کر رہی ہے جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے، بلکہ ازوٹاف کے نزدیک تین تین محوروں پر زمین گھوم رہی ہے، جن میں ایک محور قطبی ہے، اور دو استوائی۔ استوائی گردش دو محوروں پر ہو رہی ہے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ملازم کو حکم دیا کہ بالاخانہ پر چڑھ کر دیکھے کہ آفتاب نکلا یا نہیں۔ دیکھنے کے باوجود آپ کا فلسفی ملازم یہ فلسفہ اگر بگھارنے لگے کہ آفتاب مجھے نظر نہیں آیا، اور مطلب یہ لے کہ میں نے جس چیز کو دیکھا، یعنی روشنی وہ آفتاب نہ تھی، اور واقع میں جو آفتاب ہے، وہ مجھے نظر نہ آیا، تو خود ہی بتائیے کہ اپنے اس فلسفی ملازم پر آپ کا غصہ ختم ہو سکتا ہے[1] یا وضو کیلئے کسی ملازم سے کہا جائے کہ کنوئیں کا گرم تازہ پانی نکال کر لاؤ

(صفحہ گذشتہ کا بقیہ حاشیہ) اس کی دلیل پروفیسر موصوف یہ پیش کرتے ہیں کہ قطبین کا ارتعاش دائرے میں نہیں بلکہ اہلیلج میں ہوتا ہے، ان کا خیال یہ بھی ہے کہ خط استوا کو دائرے کی شکل میں جو تصور کیا جاتا ہے، یہ صحیح نہیں ہے، بلکہ اہلیلج نما یا بیضوی ہے، صدق جدید ۱۰ مارچ ۱۹۵۲ء بی بی سی کے حوالے سے نقل کر کے مولانا عبدالماجد صاحب نے لکھا ہے، اور بالکل صحیح ارشاد ہوا ہے کہ ریاضیات جیسے علوم، جن کے مسائل سمجھے جاتے ہیں کہ فیصلہ کن قطعی ہوتے ہیں، جب ان کا یہ حال ہے، تو تخمین وظن پر جن علوم و نظریات کی بنیاد قائم ہے، مثلاً معاشیات، اکانومی، عمرانیات سوشیالوجی وغیرہ کو اسی پر قیاس کر لینا چاہیئے۔

(۱) قرآن میں بعض مقامات پر اس قسم کی آیتیں بھی ملتی ہیں، مثلاً ذوالقرنین کے قصہ میں ہے کہ آفتاب کو سیاہ کیچڑ کے چشمے میں ڈوبتے ہوئے اس نے پایا (وجدہا تغرب فی عین حمئۃ) اس میں تصریح بھی کر دی گئی ہے کہ آفتاب کے غروب کی حقیقت بیان نہیں ہو رہی ہے۔ بلکہ ذوالقرنین کے وجدان اور دریافت کی یہ تعبیر ہے، مطلب یہ ہے کہ ذوالقرنین یہ پا رہا تھا کہ سیاہ کیچڑ کے چشمے میں آفتاب ڈوب رہا ہے، اس سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اس قسم کی تعبیروں میں قرآن کے سامنے، بجائے واقعہ کے پانیوالوں کے وجدانات اور احساسات ہوتے ہیں، یہاں پر تو الفاظ بھی ایسے استعمال کئے گئے ہیں، جن سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ دیکھنے والے کے احساس کے مطابق تعبیر اختیار کی گئی ہے، لیکن اس کو اب کیا کہیے کہ بعض لوگوں نے اسی آیت کی بنیاد پر یہ دعویٰ کر دیا تھا کہ مغرب کے وقت آفتاب (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

Toobaa-elibrary.blogspot.com

ملازم یہ سوچکر کہ پانی کا درجۂ حرارت تو گرما دسرما دونوں موسموں میں ایک ہی رہتا ہے، نہ جائے اور بجھنے لگے کہ پانی کنویں کا گرم کب ہوتا ہے، جو لاتا، تو اس کی ملازمت کے سلسلے کو اس کا فلسفہ آئندہ کیا جاری رہنے دیگا۔

محکمات و متشابہات

شاہ صاحب کے اسی خیال نے میرے ذہن کو ادھر منتقل کیا کہ قرآنی آیات کو محکمات و متشابہات دو حصوں میں تقسیم کر کے قرآن ہی میں جو یہ اطلاع دی گئی ہے کہ جن کے دلوں میں کجی اور ٹیڑھ ہے، وہی فتنہ انگیزیوں کے لئے متشابہ آیتوں کی تاویل و توجیہ کے پیچھے پڑ جاتے ہیں، فرمایا گیا ہے کہ

فاما الذین فی قلوبھم زیغ	جن کے دلوں میں کجی ہے، وہ متشابہات
فیتبعون ما تشابہ منہ ابتغاء	کے درپے ہوتے ہیں فتنہ کی غرض سے
الفتنۃ وابتغاء تاویلہ ۔	اور ان کی تاویل کی تلاش میں ۔

کچھ ادھر دھیان جاتا ہے کہ قدرت کے کلام کی یہی خصوصیت قدرت کے کام میں بھی نظر آتی ہے، یعنی جیسے کلامی آیات کی ایک قسم وہ ہے، جس کا نام قرآن نے متشابہات رکھا ہے، اسی طرح کائناتی آیات اور نشانیاں جنھیں صحیفۂ قدرت پر حق تعالیٰ نے

(صفحہ گزشتہ کا حاشیہ) جیسا طویل و عریض جسم جس کے مقابلے میں زمین کا ہمارا کرہ رائی کے دانے سے زیادہ وسیع نہیں، اسی زمین کے کسی چشمہ میں سما جاتا ہے۔ اور ڈوب جاتا ہے، اگرچہ ابتداہی سے مفسرین، اس قسم کی غلط اندیشیوں کی تصحیح کرتے چلے آئے ہیں۔ مگر اتنی بات تو بہرحال ثابت ہوتی ہے کہ تصریح کے باوجود جب طریقۂ تعبیر کو بعض لوگ نہیں سمجھ سکے، تو جہاں اس قسم کی تصریحات نہیں ہیں وہاں قرآن کے موضوع بحث سے ناواقف لوگوں کو کچھ غلط فہمی ہو جائے، تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیئے، جہاں تک میں جانتا ہوں کھلے کھلے صاف الفاظ میں قرآن کے طریقۂ تعبیر کے اس پہلو کو شاہ صاحب سے پہلے شاید کسی نے اتنی قوت کیساتھ واضح کیا ہو۔

نمایاں فرمایا ہے۔ ان آیات کے بھی بعض مظاہر کی نوعیت تقریباً متشابہات ہی جیسی نظر آتی ہے، بجائے خود کائناتی آیات کے متشابہات کی تاویل و توجیہ انکے اسباب و علل کا سراغ اور ٹوہ لگانا، یہ دوسری بات ہے لیکن بعض لوگ جنھیں درحقیقت نہ حکمت اور سائنس ہی کا ذوق ہوتا ہے، اور نہ دین اور مذہب کی قدر و قیمت کا انھیں صحیح اندازہ ہوتا ہے لیکن یہ اپنے قلبی زیغ اور ذہنی کجی کی وجہ سے خواہ مخواہ ان کو اس کا شوق ہوتا ہے کہ کائناتی آیات کے متشابہات یعنی جن کی توجیہ و تاویل میں مختلف پہلو پیدا ہو سکتے ہیں، ان ہی کے درپے ہو جاتے ہیں، اور دینیات و عقلیات کے تصادم و تناقض کا ہنگامہ برپا کرتے ہیں۔

مگر آپ دیکھ رہے ہیں کہ الراسخون فی العلم کا مذاق متشابہات کی دونوں قسموں کے متعلق کتنا صاف و پاک ستھرا اور اُجلا ہے ہر ایک کے متعلق اپنے اندر

اٰمنا بہ کل من عند ربنا	ہم سبھی کو مانتے ہیں، سب ہمارے
وما یذکر الا اولوا الالباب	پروردگار کے پاس کی چیزیں ہیں
	اور نہیں چونکتے۔ مگر وہی لوگ جو مغز
	والے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ متشابہات خواہ قدرت کے کلام سے ان کا تعلق ہو، یا قدرت کے کام سے، دل میں زیغ اور ٹیڑھ ہو تو دونوں ہی سے فتنہ انگیزی اور فساد پردازی کا کام لیا جا سکتا ہے، لیکن جن کا علم راسخ ہے اور قلب سلیم ہے، وہ جانتے ہیں کہ قدرت ہی نے جن آیات اور نشانیوں میں تشابہ کا رنگ بھرا ہے، ان میں بہرحال یہ رنگ باقی ہی رہتا ہے، اس رنگ کو دور کر کے متشابہات کو بھی محکمات کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش سچ پوچھئے تو قدرت اور اس کے قوانین سے کشمکش کی یا ایک گستاخانہ کوشش ہوگی۔

واقعہ یہ ہے کہ مادی کائنات اور قرآنی آیات جنھیں اپنی خاص اصطلاح میں

Toobaa-elibrary.blogspot.com

فقیر روحانی کائنات بھی کہتا ہے۔ ان دونوں قدرتی آیات اور نشانیوں میں تشابہ، ومجانست کے جہاں بیسیوں وجوہ خاکسار پر واضح ہوئے ہیں، جن میں بعضوں کا تفصیلی ذکر آپ کو میرے رسالہ "کائنات روحانی" میں ملے گا

مناسبت ومشابہت کے انھیں پہلوؤں میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ قدرتی آیات کے ان دونوں ہی شعبوں میں محکمات کے ساتھ ساتھ ایسی آیتیں اور نشانیاں بھی پائی جاتی ہیں، جن کو متشابہات کے سوا ہم اور کچھ کہہ نہیں سکتے، دونوں ہی کی توجیہ وتاویل میں مختلف شکوک اور احتمالات پیدا ہوتے ہیں، یہی رات دن کے الٹ پھیر کے قصہ میں دیکھئے، مادی کائنات کے بیشمار مشاہدات میں سے ایک مشاہدہ یہ بھی ہے۔ لیکن یہ کیوں ہو رہا ہے؟ کیسے ہو رہا ہے؟ سن چکے کہ مادی کائنات کی اس آیت اور نشانی کی توجیہ میں سوچنے والوں کا دھیان کن کن باتوں کی طرف گیا۔ ہزار ہا ہزار سال گزر چکے ہیں۔ بیسویں صدی عیسوی کا بھی نصف حصہ گزر چکا ہے لیکن قطعی اور محکم فیصلہ، جس میں آئندہ کسی ترمیم کی گنجائش باقی نہ رہے، اسوقت تک طے نہ ہو سکا، زمین ہی کی گردش کا نتیجہ اس کو مان لیا جائے، جیسا کہ اس زمانہ میں مان لیا گیا ہے، لیکن خود اس زمین کی حرکت اور گردش کی نوعیت کے متعلق مولانا عبدالماجد دریابادی کی یہ خبر آپ تک پہنچا چکا ہوں کہ صحیح معنوں میں ابتک متعین نہیں ہوا ہے، یورپ اور امریکہ کے حکماء اس باب میں جو کچھ مان چکے تھے، پھر بحث طلب مسئلہ بن گیا ہے، اور خدا ہی جانتا ہے کہ آئندہ سوچنے والے اس راہ میں کن کن خیالات اور تجویزوں کو پیش کرنیوالے ہیں، اور اسی کو میں تشابہ کہتا ہوں۔

یہ مثال تو مادی کائنات کی ایک قدرتی آیت اور نشانی کی ہوئی، اب روحانی کائنات میں آیئے، دور کیوں جایئے، اسی رات ودن، جس کا بہر حال سورج کی روشنی ہی سے تعلق ہے، جسوقت تک اس کے جس حصہ پر سورج کی روشنی پڑتی ہے، اسکا وہ حصہ دن کہلاتا ہے، اور روشنی جب اس کے اس حصہ سے غائب ہو جاتی ہے۔ تو وہی

اس حصہ کی رات قرار پاتی ہے، قرآن میں اسی سورج کی طرف تجری کا لفظ منسوب کیا گیا ہے، لیکن یہ ہمارے عام احساس کی تعبیر ہے، یا خالق کائنات کے علم میں واقعہ کی جو صحیح نوعیت ہے، اسی واقعہ کے مطابق تجری کے اس لفظ سے اپنے علم کو حق سبحانہ وتعالیٰ ظاہر فرمانا چاہتے ہیں، ذہن دونوں پہلوؤں کی طرف منتقل ہوتا ہے، یہی تشابہ کا اقتضاء ہے، پھر جن کے دلوں میں کجی ہوگی اور زیغ ہے جن کے قلوب ماؤف ہیں وہ اس سے فتنہ انگیزی کا کام لے سکتے ہیں، لیکن راسخ علم والے آمنا بہ کل من عند ربنا کو متشابہات کے متعلق اصل قرار دیکر تاویل کی راہ اگر اختیار بھی کریں گے، تو وہ ایسی راہ ہوگی جس سے بجائے بھڑکنے کے فتنوں کے دبانے میں مدد مل سکتی ہے۔

شاہ صاحب کی اس توجیہ کو دیکھئے کہ گردش لیل ونہار کی وجہ خواہ کچھ ہو، آسمان یا آفتاب یا زمین کے گھومنے سے یہ نتیجہ ہوا ہو یا آئندہ اس انقلابی مشاہدہ کے متعلق سوچنے والوں پر کوئی نیا راز واضح ہو، کچھ بھی ہو، ہر حال میں قرآن کریم کے حریم ادب کا تقدس واحترام قائم ودائم باقی و برقرار رہتا ہے، انہی کے سراپردہ عصمت وجلال کو حکمت وسائنس کا کوئی نتیجہ بھی ہو چھو بھی نہیں سکتا، یوں فلسفہ وحکمت کے سیمیائی نظریات اور وہمی تاثرات کی دست نگری سے قرآن پر ایمان لانیوالے جیسے آزاد رہتے ہیں، ٹھیک اسی طرح کائناتی آیات اور نشانیوں کی توجیہ وتاویل، تلاش وجستجو کے اختیارات پر بھی قرآن کی طرف سے کسی قسم کی بھی پابندی عائد نہیں ہوتی، ایمان بھی آزاد، عقل بھی آزاد، اپنی اپنی راہوں پر دونوں ہی کسی تصادم اور کشمکش کے بغیر سرگرم سیر رہتے ہیں، یقین کیجئے کہ دانش کی پختگی، علم کا رسوخ خواہ قرآنی آیات میں ارزانی ہو یا کائناتی آیات میں میسر آئے، ہمیشہ اس نے اسی خوشگواری کے ماحول کو پیدا کیا ہے لیکن خام فکروں، خامکاروں کے ہاتھ پہونچ کر پکی باتیں بھی کچی بن جاتی ہیں (۱)

---

(۱) قرآن میں حق تعالیٰ کی طرف بعض صفات کا انتساب جن الفاظ میں (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

Toobaa-elibrary.blogspot.com

عارفِ رومی نے سچ فرمایا ہے۔

ہر چہ گیرد علتی علّت شود
کفر گیرد کاملے ملّت شود

کسی ظریف نے اسی مضمون کو یوں موزوں کیا ہے

اصیل مرغ سمجھتے ہیں اور ہیں خاموش
سنو گے ٹینیوں میں چوں وچرا کا جوش وخروش

تفسیر بالرّائے

اسی سلسلے میں قرآن کے متعلق حضرت شاہ صاحب کی اس اصولی بات کا بھی خیال آتا ہے، یہ تفسیر یا تاویل بالرائے کا مسئلہ ہے بعض روایات جن میں تاویل بالرائے کی ممانعت کی گئی ہے، اور اسے جراتِ بیجا قرار دیتے ہوئے دھمکی دی گئی ہے کہ اس جرم کا ارتکاب جہنم کو آدمی کا ٹھکانہ (مقعد) بنا دیتا ہے، عام طور پر اسی روایت کو بنیاد بنا کر کچھ اس قسم کا خیال لوگوں میں پھیلا دیا گیا ہے کہ قرآنی آیات کا مطلب کوئی بیان ہی نہیں کر سکتا ہے، جب تک اس مطلب کی تائید میں کسی روایت کی پشت پناہی اسے حاصل نہ ہو، اسی وجہ سے تفسیر کی ان کتابوں کو بہت اہمیت دی جاتی ہے، جن میں ہر آیت کے ذیل میں روایات

(صفحہ گذشتہ کا حاشیہ) کیا گیا ہے، مثلاً وہ بصیر ہے، وہ سمیع ہے، یعنی دیکھنے والا ہے، سُننے والا ہے۔ یہ مان لیا جاتا کہ جو چیزیں دیکھی جاتی ہیں ان کو ہی جانتا ہے، اور جو چیزیں سنی جاتی ہیں، ان کا ہی عالم ہے، تو بات ختم ہو جاتی لیکن دیکھنے کے بعد آنکھوں اور آنکھوں کے بعد آنکھوں کے پردوں اور ان اسباب وعلل کی طرف لوگوں کا ذہن منتقل ہوا، جن کے بغیر آدمی دیکھ نہیں سکتا، مثلاً رنگ اور روشنی کو بھی، خدا کے دیکھنے کے متعلق خام کاروں نے چھیڑ دیا، بس مباحث کا طوفان برپا ہو گیا، فرقوں پر فرقے بنتے چلے گئے، مختصر سی بات کتنی طویل ہو گئی۔

★

کے درج کرنے کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے، ابن جریر طبری کی تفسیر کا مدار زیادہ تر اسی پر ہے کہ تفسیری روایات کا غیر معمولی سرمایہ اس کتاب میں جمع ہو گیا ہے، یا طبری کے بعد السیوطی کی تفسیر "درمنثور" کی قدر وقیمت کا راز بھی یہی ہے، اسی نقطۂ نظر سے کہنے والوں نے امام فخر الدین رازی کے متعلق یہ لطیفہ مشہور کر رکھا ہے کہ

فیہ کل شیءٍ الا التفسیر امام رازی کی تفسیر میں تفسیر کے سوا سب کچھ ہے (۱)

بہر حال اس فقرہ سے اشارہ اسی طرف کیا گیا ہے کہ روایات کی طرف امام نے اپنی تفسیر میں جتنی توجہ چاہیئے نہیں کی، اور اس لحاظ سے کچھ یہ واقعہ بھی ہے، نہ سوچنے والوں میں یہ یا کچھ اس قسم کے احساسات پائے جاتے ہیں، اسی کے مقابلے میں ایک طبقہ بے باکوں کا بھی ہے، جو قرآنی آیات کی تشریح وتوجیہ میں، نہ اس ماحول ہی کو اپنے سامنے رکھنا چاہتا ہے، جس میں قرآن نازل ہوا تھا۔ یا جن بزرگوں کو اپنا مخاطب قرآن نے پہلی دفعہ بنایا تھا (یعنی صحابہ کرام)، قرآنی آیات کے متعلق ان کے تاثرات کی وہ پرواہ نہیں کرتا، حتی کہ شوریدہ سری میں عقل باختوں کا یہ گروہ بھی کبھی ترقی کر کے، اس حد تک آپہونچتا ہے کہ عربی لغت اور الفاظ کے لغوی معانی کی رعایت سے بھی اس راہ میں اگر ضرورت ہوئی ہے تو آزاد ہو گیا ہے۔

آج ہی نہیں، بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں اس قسم کی ناہمواریوں کا مشاہدہ قرآنی آیات کی تشریح وتوضیح کے سلسلے میں کیا گیا ہے "اتقان" میں

---

(۱) امام رازی کی تفسیر کے متعلق میرا ہی نہیں عموماً اہلِ بصیرت کا خیال یہی ہے کہ اس فقرے کو مشہور کر کے امام پر اور امام کی کتاب پر ظلم بیجا کیا گیا ہے، لیکن منہ سے جو بات نکل جاتی ہے، اپنی قیمت کبھی نہ کبھی حاصل کر ہی لیتی ہے، ہمارے زمانے میں مصر کے ایک صاحب نے جو علامہ طنطاوی کے نام سے مشہور ہیں، شاید پچیس ضخیم جلدوں میں ایک کتاب لکھی ہے، عنوان تو کتاب کا یہی ہے کہ قرآن کی یہ تفسیر ہے لیکن مطالعہ کے بعد یہ لکھنا پڑے گا کہ فیہ کل شیءٍ الا التفسیر کا (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

میں سیوطی نے نقل کیا ہے کہ لیطمئن قلبی کے لفظ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے ایک دوست کی طرف اشارہ کیا تھا جس کا نام قلبی تھا۔ مقصد یہ تھا کہ میں تو مطمئن ہوں لیکن میرا دوست قلبی مرنے کے بعد جی اٹھنے کے مسئلے میں چونکہ متردد ہے ان کی تسکین خاطر کے لئے بعض لوگوں نے دعویٰ کیا ہے کہ رب ارنی کیف تحیی الموتیٰ (اے میرے پروردگار دکھا دے مجھے کہ مردے کو تو کیسے زندہ کریگا) کی استدعا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے بارگاہِ الٰہی میں پیش ہوئی تھی۔ اسی طرح بعضوں کا قول یہ تھا کہ میتہ، لحم خنزیر وغیرہ بعض مردوں اور عورتوں کے نام ہیں مسلمانوں کو حکم دیا گیا تھا کہ ان سے ملنے جلنے سے پرہیز کریں اور ان خرافات کا ذکر کہاں تک کیا جائے، بقول ابومسلم اصفہانی ان اقوال کا ذکر صرف اس لئے کرنا چاہیے کہ

ان یعلم ان فیمن یدعی العلم حمقی | تاکہ معلوم ہو کہ علم کا دعویٰ کرنے والوں میں احمقوں کی کمی نہیں ہے۔

اور ان حماقتوں کا تعلق تو قدیم علم یا "دانش پارینہ" سے تھا، اسکے مقابلے میں "دانش نو" کی بوالعجبیوں کا جو طوفان عہد حاضر میں امنڈ آیا ہے اس کا نہ اور ہے اور نہ چھور!

بھلا اس دعویٰ کے ساتھ کہ قرآن میں نہ غلامی کا ذکر ہے، اور نہ تعدد ازدواج کے قانون کا، نہ معجزوں کا، نہ کرامتوں کا، نہ فرشتوں کا نہ جنوں کا نہ جنت کا اور نہ دوزخ کا اور نہ جنت کی حوروں کا نہ قصور کا، نہ اسکے اشجار کا، نہ اسکے انہار کا، نہ دوزخ کی نار کا، نہ اس کے ملائکہ غلاظ شداد کا نہ اس کے زقوم کا نہ غسلین کا، الغرض قرآن میں

(صفحہ گذشتہ کا حاشیہ) صحیح مصداق اگر کوئی تفسیر ہو سکتی ہے۔ تو وہ طنطاوی ہی کی یہ تفسیر ہے، خدا جانے کہ سیکڑوں سال پہلے خواہ مخواہ امام رازی کی تفسیر کے متعلق اس فقرے کو کس نے استعمال کر دیا تھا لیکن غلط باآب تبا کہ صحیح ہو گئی ہے اور اس کو حقیقی مصداق اپنا مل گیا ہے۔

جو کچھ ہے وہی سب کچھ قرآن میں نہیں ہے۔

اس عجیب و غریب ادعا کے ساتھ قرآنی الفاظ کی توجیہ و تشریح میں جن طلسماتی نیرنگیوں کے تماشے سامنے آسکتے ہیں، اور لفظوں کے ساتھ جو ساحرانہ کھیل کھیلے جاسکتے ہیں۔ اس کا اندازہ ہر صاحب عقل و شعور کر سکتا ہے۔ یہ صرف احتمال ہی نہیں بلکہ یہی کر کے دکھایا گیا ہے، اور قرآن کے ساتھ ان بدبختانہ بازیگریوں کا سلسلہ اب تک جاری ہے، عربی زبان کی ایک سطر بھی صحیح طریقے سے جو پڑھ نہیں سکتے، وہی قرآن کے اردو ترجموں کی مدد سے، ان ہی ناقابل برداشت "گستاخیوں" پر کوتاہ نصیبوں کا یہ گروہ جری ہو گیا ہے، طرفہ تماشا یہ ہے کہ اپنے ان بیہودہ حرکات پر داد کا بھی طالب ہے۔ آج ان مجرمانہ جسارتوں کا یہ نتیجہ ہے کہ جس مطلب اور مقصد کو بھی چاہا جاتا ہے، قرآن اور قرآنی الفاظ کے سر پر تھوپ دیا جاتا ہے،

بہر حال یہ بھی ہو رہا ہے، اور وہ بھی ہو رہا ہے، ایک طرف اس پر اصرار ہے کہ روایت بغیر کسی آیت کے مطلب کا بیان کرنا جہنم کو اپنا ٹھکانہ بنانا ہے، اور روایت کسی درجہ کی ہو، صحیح ہو، حسن ہو، ضعیف ہو، ضعف میں اس کا حال جو کچھ بھی ہو، لیکن صحیح تفسیر وہی ہے اور قابل اعتماد مفسر وہی ہے جو ان روایتوں ہی کی روشنی میں قرآن کی آیتوں کے مطلب اور منشا کو متعین کرتا ہو، دوسری طرف آزادی بخشی گئی ہے کہ، اپنے جس وسوسہ اور وہم کو جس کا جی چاہے، قرآن کی طرف منسوب کر دے، بقول اکبر مرحوم

مجھے تفسیر بھی آتی ہے اپنا مدعا کہیے

اس کو بتانے والوں نے اپنا علمی پیشہ اور ذہنی مشغلہ بنا رکھا ہے، بجنسہٖ پوری تقریر تو محفوظ نہیں ہے لیکن شاہ صاحب کا مطلب یہی تھا کہ مسلمانوں میں نسلاً بعد نسلٍ خلفاً عن سلفٍ جن حقائق سے اسلامی دین کی تعمیر و تقویم ہوتی ہے، جن کے بغیر اسلام کا تصور مسلمان تو مسلمان، شاید کوئی لکھا پڑھا غیر مسلم بھی نہیں کر سکتا یعنی دین کی ضروریات میں جو چیزیں شمار ہوتی ہیں، اول سے آخر تک بغیر کسی اختلاف

Toobaa-elibrary.blogspot.com

کے اسلام کی جو جانی پہچانی باتیں ہیں، ان سے ہٹ کر قرآنی آیات کی توضیح و تشریح کی جرأت ایمان سوز جرأت ہے، گویا فقیر اپنی خاص اصطلاح میں "البینات" ہے جن چیزوں کی تعبیر کرتا ہے، دین کے ان بنیادی مسلمات پر جس تفسیر سے زد پڑتی ہے، قرآنی آیتوں کی جس تاویل سے مذہب کا یہ غیر مشتبہ حصہ متاثر ہوتا ہو تفسیر و تاویل کی یہی وہ قسم ہے جسے شاہ صاحب تاویل بالرائے قرار دیتے تھے (۱)

لیکن یہ بات کہ قرآن کی کسی آیت کا کوئی مطلب تفسیری روایتوں کی پشت پناہی کے بغیر بیان کرنا ہر حال میں "تفسیر بالرائے" ہے، اور جو ایسا کرتا ہے، وہ قرآن کی تشریح و تاویل اپنے من مانے خیالات کے زیر اثر کر رہا ہے، جہاں تک میں جانتا ہوں حضرت شاہ صاحب شدت کے ساتھ اس کی بھی تردید فرمایا کرتے تھے، ان سے زیادہ باخبر اس حقیقت سے کون ہو سکتا تھا کہ تفسیر کی کتابوں میں جن روایتوں کا لوگ ذکر کرتے ہیں۔ امام احمد بن حنبل فرماتے تھے کہ اکثر و بیشتر حصہ ان کا ایسا ہے، جسکی اصل نہیں ہے سیوطی نے اتقان میں امام کے اس قول کو نقل کرتے ہوئے لکھا ہے،

قال احمد: ثلثة کتب لیس لها اصل التفسیر، والملاحم والمغازی۔ تین کتابیں روایتوں کی ایسی ہیں جن کی اصل نہیں، ایک تفسیر دوسرے ملاحم (آئندہ پیش آنیوالی جنگیں اور فتنے) اور جنگی معرکے، عہد نبوت میں جو پیش آگئے، ان کے متعلقہ

---

(۱) بخاری کی املائی شرح میں اور شاہ صاحب کی دوسری تحریروں میں لوگ ان کے اس اجمالی دعویٰ کی تفصیل پڑھ سکتے ہیں، مثلاً بخاری کی شرح میں ان کا یہ قول نقل کیا گیا ہے فاذا اوجب تغییر لمسألة متواترة او تبدیلا لعقیدة مجمع علیها فذلك هو التفسیر بالرأی وهذا الذی یستوجب صاحبه النار (یعنی متواتر مسئلہ دین کا جس تفسیر سے الٹا بدلتا ہو، یا مسلمانوں کا جو اجماعی عقیدہ ہے، اس میں تبدیلی پیدا ہوتی ہو یہی درحقیقت تفسیر بالرائے ہے، جس کا مرتکب جہنم کا حقدار بن جاتا ہے) فیض الباری ص ۱۵۰ ج ۴

قصے جن کو المغازی کہتے ہیں ص ۵۳۸ ج ۲ پھر خود علامہ سیوطی نے بھی اپنی طرف سے اس دعویٰ کو پیش کیا ہے کہ اَصحُّ المرفوع منه فی غایة القلة، ایسی روایتیں جو براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف صحت کے ساتھ منسوب ہوں، تفسیر کے متعلق بہت کم ہیں ص ۵۳۹ ج ۲

یہ حال تو ان روایتوں کا ہے جن کو اصطلاحاً مرفوع حدیثوں کے نام سے موسوم کرتے ہیں، باقی رہے صحابۂ کرام کے تفسیری اقوال، سو ابن عباس رضی اللہ عنہ کو اس باب میں غیر معمولی شہرت حاصل ہے لیکن جو ذخیرہ اس سلسلے میں ان کی طرف منسوب ہے، خود سیوطی نے بھی اس کے متعلق علماء کا یہ فیصلہ نقل کیا ہے کہ وهذه التفاسیر الطوال التی اسند وها غیر مرضیة ورواتها مجاهیل ص ۵۵۳ یہ لمبی لمبی تفسیری روایتیں جو ابن عباس کی طرف منسوب ہیں، سنداً ناپسندیدہ ہیں: انکے روایت کرنیوالے نامعلوم اشخاص ہیں، حضرت امام شافعی نے ابن عباس کے تفسیری اقوال کا جائزہ لیا تو اس نتیجہ تک پہونچے کہ لم یثبت عن ابن عباس فی التفسیر الا شبیه بمائة حدیث ص ۵۵۴ تقریباً سو روایتوں کے سوا ابن عباس کی طرف منسوب اقوال صحیح ثابت نہیں ہوئے۔ جس کی ایک کھلی دلیل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حدیثوں کا سب سے زیادہ معتبر اور صحیح مجموعہ، یعنی صحیح بخاری میں تفسیری روایات کا سرمایہ شاید دوسرے تمام ابواب کے مقابلے میں سب سے زیادہ کم ہے، امام بخاری نے بجائے روایتوں کے جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں قرآنی الفاظ کی لغوی تشریح پر زیادہ توجہ کی ہے، اور وہ بھی بقول شاہ صاحب کے، جیسا کہ فیض الباری میں بھی نقل کیا ہے، اور حافظ ابن حجر نے اس راز کو واضح کیا ہے کہ ابو عبیدہ (۱) معمر ابن المثنی کی کتاب مجاز القرآن پر

---

(۱) یاد رکھنا چاہئے کہ ابو عبیدہ کے لفظ سے کہیں دھوکہ نہ ہو، یہی کنیت مشہور محدث قاسم بن سلام کی بھی تھی جن کی کتاب الاموال حال ہی میں شائع ہوئی ہے، اور غیر معمولی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

Toobaa-elibrary.blogspot.com

امام نے زیادہ بھروسہ کیا ہے، شاہ صاحب کا خیال تھا کہ لم یعرج الی النقد اصلاً. امام بخاری نے معمر بن المثنی کے اقوال تنقید کے بغیر ہی اپنی کتاب میں نقل کر دیئے ہیں، اس لئے ابن المثنی کی کتاب میں جو نقائص پائے جاتے تھے، وہی کوتاہیاں صحیح بخاری کی کتاب التفسیر میں باقی رہ گئی ہیں، یہ نکتہ خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ شاہ صاحب فرماتے تھے کہ صحیح بخاری میں جو تفسیری اقوال پائے جاتے ہیں، ان کے متعلق یہ سمجھنا مناسب ہوگا کہ یہی امام بخاری کا فیصلہ ہے، بلکہ اس باب میں ان کی حیثیت صرف ایک ناقل کی ہے۔

کچھ بھی ہو، کم از کم امام ابوحنیفہ کے متعلق جب یہ مانا جاتا ہے کہ ضعاف وحسان ہی نہیں، بلکہ خبر واحد خواہ محدثین کی اصطلاح کی رو سے مرفوع و متصل و صحیح ہی کیوں نہ ہو، باوجود اس کے، قرآنی نصوص میں کسی ترمیم کو احاد خبروں کی روشنی میں امام صاحب جائز نہیں سمجھتے تھے۔ اصولِ فقہ کی ہر چھوٹی بڑی کتاب میں ان کے اسی فیصلہ کی تعبیر یہ کی گئی ہے کہ "کتاب میں زیادت خبرِ واحد سے نہیں ہو سکتی" اس کے بعد بھلا کون یہ کہہ سکتا ہے کہ روایتوں کی دستگیری کے بغیر قرآنی آیات کے مطالب کے سمجھنے، اور سمجھانے کی اجازت ہی نہیں دی جا سکتی۔ کتنی عجیب بات ہے کہ قرآنی نصوص قطعیت اور یقین آفرینی کے جس زور اور قوت کے حامل ہیں، واحد خبروں سے ان کے سمجھنے میں مدد لینے کے بعد ان کا یہ زور اور ان کی یہ قوت کیا باقی رہ سکتی ہے واحد خبروں کا مفاد بہر حال ظنی ہے، ظاہر ہے کہ یہی مظنونیت کی صفت نصوص قرآنی کی طرف بھی منتقل ہو جائے گی، امام ابوحنیفہ اگر خبر آحاد سے کتاب پر زیادت کو جائز نہیں سمجھتے تھے، تو بتایا جائے کہ یقین آفرینی اور قطعیت بخشی کی طاقت جو قرآنی آیات

(صفحہ گذشتہ کا باقی حاشیہ) قیمتی معلومات سے مالامال ہے، بلکہ یہ ابوعبیدہ مجاز القرآن کا مصنف دوسرا آدمی ہے اس کا نام معمر بن المثنی ہے۔

میں پائی جاتی ہے، اس کی حفاظت کی دوسری شکل ہی کیا تھی، مگر افسوس ہے کہ امام ابوحنیفہ کی نظر کی بلندی کا صحیح اندازہ لوگوں کو نہ ہوا۔ بلکہ برعکس، اس کے یہ پھیلا دیا گیا کہ قرآنی نصوص کے مطالب کو بجائے روایات کے قرآنی الفاظ ہی سے سمجھنے کی جو کوشش کرے گا، یا دوسرے کو سمجھائے گا، وہ تفسیر بالرائے کے جرم کا مجرم، دوزخی ہے، خدا جزائے خیر دے حضرت شاہ صاحب کو کہ تفسیر بالرائے کے اس غلط مطلب کا اپنے درس میں ازالہ فرمایا کرتے تھے، خدا کا شکر ہے کہ ان کا یہ فیصلہ بخاری کی املائی تقریریں درج کر دیا گیا ہے، ان کی طرف آخر میں یہ فقرے بھی اسی کتاب میں منسوب کئے گئے ہیں فرمایا کرتے تھے ومن حجر علی العلماء ان یبرزوا معانی الکتب لعدل الامعان فی السباق والسیاق والنظر الی حقائق الالفاظ المراعیۃ عقائد السلف یعنی کس نے اہلِ علم کو روکا ہے اس بات سے کہ کتاب اور اس کے معانی ومطالب کو آیات کے سیاق وسباق اور الفاظ کے اقتضاء کے مطابق، جس میں سلف صالحین کے عقیدے کی بھی رعایت کی گئی ہو، ان امور کو پیش نظر رکھ کر ظاہر کریں" آگے اسکے بعد اسی میں یہ بھی ہے کہ بل ذالک حظھم من الکتاب فانھم ھم الذین ینظرون فی عجائبہ ویکشفون الاستار عن وجوہ دقائقہ ویرفعون الحجب عن خبیئات حقائقہ فھذا النوع من التفسیر بالرای حظ اولی العلم ونصیب العلماء المستنبطین، بلکہ اللہ کی کتاب میں اہل علم کا واقعی یہی حصہ ہے، وہ اس کتاب کے نت نئے پہلوؤں پر غور کرتے ہیں، اور اس کے پوشیدہ اسرار سے نقاب الٹتے ہیں، جو باتیں چھپی ہوئی ہیں، انھیں نمایاں کرتے ہیں، اگر یہی تفسیر بالرائے ہے تو اہل علم کا یہی حصہ ہے، اور قرآنی آیات سے نتائج پیدا کرنیوالے صاحبان آگہی کی خوراک یہی ہے

آخر میں اسی کے ساتھ اس پر بھی تنبیہ فرماتے تھے واما من تکلم فیہ بدون صحۃ الادوات لاعندہ علم من کلام السلف والخلف ولا ذوق بالعربیۃ

Toobaa-elibrary.blogspot.com

وکان من اجلاف الناس لم یحملہ علی تفسیر کتاب اللہ غیر الوقاحۃ وقلۃ العلم فعلیہ الاسف کل الاسف وذالک الذی لیستحق النار۔

مگر قرآنی آیات سے صحیح واقفیت کے لیے جن قدرتی اسباب و ذرائع کی ضرورت ہے، جوان سے تہی دامن ہو اس کے پاس اگلوں اور پچھلوں کے اقوال کا علم نہ ہو، اور نہ عربی ادب کا ذوق رکھتا ہو، اس قسم کے کمینے آدمیوں میں قرآنی آیات کی تفسیر کی جرأت محض بے شرمی اور بے حیائی اور جہالت ہی کیوجہ سے ہوسکتی ہے، ان پر افسوس صد افسوس ہے، یہی لوگ جہنم کے مستحق ہیں۔

ذکرِ انوری کا اختتام

سمٹنا چاہتا ہوں مگر پھیل جاتا ہوں بسیدنا الامام الکشمیری قدس سرہ العزیز سے میرے غیر معمولی تاثر کا یہ شاید شعوری یا غیر شعوری نتیجہ ہے سمجھتا ہوں کہ ان کے متعلق باتیں ختم ہوگئیں کہ ذاکرہ کسی نئی چیز کو سامنے پیش کر دیتا ہے، ایسی نئی چیز کہ دل اس کے چھوڑ دینے پر کسی طرح راضی نہیں ہوتا، ناظرین شاید تھک چکے ہوں گے، دل پر جبر کرکے اپنے محبوب مرحوم استاد کے ذکر کو ختم کرتا ہوں۔

آپ ہی انصاف کیجئے "اپنے حقیر و فقیر، جہول و ظلوم، ادنیٰ ترین شاگرد کی حوصلہ افزائیوں میں جس کا یہ حال ہو کہ دار العلوم میں طالب علمی کی زندگی ختم کرنیکے بعد خاکسار القاسم اور الرشید نامی ماہوار پرچوں کی ادارت کے ساتھ کچھ درس و تدریس وغیرہ کے خدمات جب انجام دے رہا تھا لیکن تنخواہ جو مدرسے ملتی تھی ضروریات کے لئے کافی نہ تھی، رخصت لیکر مکان آگیا، اور دار العلوم کے مہتمم مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو یہ اطلاع دینے پر مجبور رہا کہ موجودہ تنخواہ پر کام کرنا، اپنے حالات کے لحاظ سے خاکسار کیلئے دشوار ہے، یہ درخواست جب پہونچی، اس کا اثر اور انجام کیا ہوا، اس کو چھوڑئیے، کہنا یہ ہے کہ بعد کو مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے جب نیاز حاصل ہوا تو براہِ راست ان سے سن کر ششدر و حیران

ہوگیا۔ فرمانے لگے۔

"بھائی مولانا انور شاہ صاحب تم سے تو غیر معمولی طور پر متأثر نظر آتے ہیں، تمہاری وہ درخواست جب پہونچی، تو میں نے شاہ صاحب سے اس مسئلے میں مشورہ لیا جواب میں انھوں نے کہا کہ آپ کے یہاں جتنے کام کرنیوالے ہیں، ان کو دیکھتا ہوں کہ جو درس دیتے ہیں، وہ تحریر کا کام نہیں کرتے یا نہیں کرسکتے، جو تحریر کا سلیقہ رکھتے ہیں، ان سے آپ تقریر و وعظ کا کام نہیں لے سکتے، الغرض ان تینوں شعبوں یعنی، درس، تحریر، تقریر کیلئے اس وجہ سے آپ کو الگ الگ آدمی رکھنے پڑتے ہیں، لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ اس غریب رسالہ کی ادارت اور تحریر کا کام بھی آپ لیتے ہیں، اور درس و تدریس کا کام بھی اس کے سپرد کرتے رہے۔ جہاں سے طلبی آئی وعظ و تقریر کے لیے بھیجتے رہے، گویا ان تینوں شعبوں کا کام حب دل خواہ وہ تنہا انجام دیتا رہا۔ اب اگر ان تینوں مدوں کے سلسلے میں ایک ایک آدمی کی تنخواہ اسے دی جائے۔ تو شاید اس کا یہ ناجائز مطالبہ نہ ہوگا"

سفارش کی اس تحلیلی ترکیب کا خطرہ خود میرے دل میں بھی نہیں گزرا تھا۔ بہر حال الفاظ تو بجنسہٖ یاد نہ رہے مفہوم یہی تھا حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ان الفاظ کو جس وقت میرے کان سن رہے تھے، آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں، اپنی بے بضاعتی، کم مائیگی کا خیال آیا۔ اُف ازنگی کو اس کا آقا کافور ٹھہرا رہا تھا حالانکہ زنگی پہلے بھی زنگی تھا، اور بعد کو بھی زنگی۔ اور اسوقت بھی زنگی ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہے یہ سوچتا ہوں۔ استاد مرحوم کی قدر شناسیوں کا دھیان آتا ہے۔ تو دل کہتا ہے ؎

بریں قول گر جاں بیازم رواست

علم و معرفت کا آفتاب ایک ذرہ کو چمکا رہا تھا۔ حالانکہ ذرہ کے پاس تھا بھی کیا، اور جو کچھ تھا سب آفتاب کا تھا۔

Toobaa-elibrary.blogspot.com

کیا کہوں، کیا نہ کہوں۔ یہی نہیں اور اسی قسم کی خصوصی عنایات اور نوازشوں کا سلسلہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے آخر وقت تک جاری رہا، اس زمانے میں بھی جب دائرہ اہتمام اور حضرت شاہ صاحب میں شکر رنجیوں کی صورتیں پیش آگئیں، یعنی دار العلوم دیوبند کی تاریخی زندگی کا وہی شر جس سے گجرات کے مشہور دار العلوم ڈابھیل کا خیر پیدا ہوا، کہ حضرت شاہ صاحب دار العلوم دیوبند کو خیرباد کہہ کر دار العلوم ڈابھیل میں فروکش ہوگئے، اور گجرات کا یہ شہر جمال انور سے بقعۂ نور بن گیا، اس زمانے میں بھی، جب خاکسار حیدرآباد میں تھا، اور کش مکش کی ان صورتوں پر حیدرآباد کا بھی دباؤ پڑ رہا تھا۔ یا چاہا جا رہا تھا کہ حیدرآباد کی حکومت بھی اپنا اثر اس پر ڈالے، اس زمانے میں عام طور پر یہ سمجھا جا رہا تھا، اور شاید یہی مشہور بھی کر دیا گیا تھا کہ اس دباؤ میں بجائے شاہ صاحب کی جماعت کے فقیر دائرہ اہتمام کے بزرگوں کی پشت پناہی کر رہا ہے، مجھ تک بھی اس قسم کی بدگمانیوں کی خبریں پہنچائی جارہی تھیں، حضرت شاہ صاحب کے قلب مبارک کی گرانی کا خیال مجھے بےچین کئے ہوئے تھا کہ عین انھیں دنوں میں قطعاً خلاف دستور اپنے دستخط خاص سے ایک رجسٹرڈ والا نامہ حضرت شاہ صاحب کا اس فقیر کے نام شرف صدور لایا تھرتھراتے ہوئے مرتعش ہاتھوں، لرزتی ہوئی اور کانپتی ہوئی انگلیوں سے اس گرامی نامہ کو کھولا۔ پڑھتا جاتا تھا۔ اور روتا جاتا تھا۔ اللہ اللہ سنانے والے مجھے کیا کیا سناتے رہے، اور آنکھیں آج کیا دیکھ رہی ہیں، مودت و محبت، سرفرازی اور عنایات بیکراں کے سوا اس میں اور کچھ نہ تھا۔ اس خاص خدمت کے لئے اس ذرۂ ناچیز کا انتخاب فرمایا گیا تھا حیران تھا کہ ہزارہا ہزار تلامذہ، جس کے اقطار ہند، بلکہ اسلامی دنیا کے کناروں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے حافظے میں مجھ جیسے کس مپرس ہیچمداں طالب الدنیا کا خیال اور وہ بھی اتنی خصوصیت کے ساتھ کیسے باقی تھا

افسوس ہے کہ بخت کی تہی دستی اور مزاج کے لاابالی پن کی وجہ سے اس والا نامہ کی

حفاظت میں کامیاب نہ ہو سکا، ورنہ آج جس حال میں ہوں، شاید وصیت کرتا کہ میرے کفن کے ساتھ اس کو میرے ساتھ دفن کر دیا جائے، تاہم امید ہے کہ اس میں جو راز تھا، انشاء اللہ وہ اپنے ساتھ ہی دفن ہوگا۔

بہرحال حضرت شاہ صاحب کے ظل عاطفت اور سایہ عافیت میں رہنے کا موقع اگرچہ دو ڈھائی سال سے زیادہ اس فقیر کو نہیں ملا لیکن اب میں کیا کروں کہ جن صحبتوں میں قریبا قرن گزرے ہیں ان کی یاد پیرانہ سری کے ان ایام میں تقریباً کچھ منٹ کی سی ہوگئی، لیکن خدا ہی جانتا ہے کہ دو ڈھائی سال کے ان متبرک، علم ریز، معارف بیز، محبت خیز ایام کی ایک ایک بات، دماغ میں کیونکر تروتازہ ہے، اسی لئے سچ پوچھئے تو حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق جو کچھ کہنا چاہتا تھا اس کا عشر عشیر بھی نہ کہہ سکا، لیکن پڑھنے والوں کی نفسیات کا خیال کرکے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب دوسرے اساتذہ کے متعلق ارتسامی تاثرات کو پیش کروں۔

Toobaa-elibrary.blogspot.com

باب ۱

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن قدس سرہ

چاہئے تو یہی تھا کہ صدر دار العلوم اور رئیس الاساتذہ ہونے کی حیثیت سے، جس قرن کے ذکر جمیل کو اب حوالۂ قلم کر رہا ہوں، سب سے پہلے ان ہی کا تذکرہ کرتا میری مراد شیخنا و شیخ الکل حضرت سیدنا شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی طاب ثراہ وجعل الجنۃ مثواہٗ کی ذات گرامی ہے۔

لیکن بزرگوں کے متعلق پیمائش اور فیتہ بازی کے شغل نامحمود سے فطرۃً نہ میرے دماغ ہی کو کبھی کسی قسم کا تعلق رہا، اور نہ دل کو۔ ناپنا اور ناپ تاپ کر بزرگوں کی نمبر اندازی، کسی کو اول، کسی کو دوم، کسی کو سوم نمبروں کا مستحق ٹھہرانا، یہاں تو یہاں بلندی کی آخری سطح تک اس جرأت بیجا کی اپنے اندر ہمت ہی نہیں پاتا، سب اپنے بزرگ ہیں، سب ہم سے بہتر و برتر، سب بڑے اور اونچے ہیں، رہا اپنے پیدا کرنے والے خالق تعالیٰ سبحانہ کے نزدیک ان کے لاہوتی مقامات و مراتب، سو ظاہر ہے کہ جب کلمۃ اللہ، روح منہ حضرت مسیح علیہ السلام تک کا یہ اعتراف قرآن میں نقل کیا گیا ہے کہ اپنے خالق کردگار کو خطاب کر کے عرض کریں۔

تعلم ما فی نفسی ولا اعلم ما فی نفسک (المائدہ) جو کچھ میرے جی میں ہے، اے تو جانتا ہے، اور جو کچھ تیرے جی میں ہے، اسے میں نہیں جانتا، تو آپ ہی بتائیے، کہ ایک ظلوم وجہول میں اس فیصلے کی جرأت کیسے پیدا ہو سکتی ہے کہ حق تعالےٰ سبحانہٗ کے یہاں احترام و قرب میں، کس کا درجہ کیا ہے؟ یہ تو ما فی نفسک کے علم کے جہاں تک میں سمجھتا ہوں، ایک بے بنیاد ادعاء کے سوا شاید اور کچھ نہیں، بقول شخصے ؎

جگر اُن کا ہے، جو تجھ کو صنم سے یاد کرتے ہیں
میاں ہم تو مسلماں ہیں خدا کہنے سے ڈرتے ہیں

کچھ بھی ہو فقیر نے اپنے بیان میں تاثیر و تاثر کی ترتیب کو جو لکھ پیش نظر رکھا ہے پہلے بھی مختلف پیرایوں میں عرض کر چکا ہوں کہ دار العلوم دیوبند کے حلقۂ تدریس میں شریک ہونے کے بعد سب سے پہلے یہ واقعہ ہے کہ اپنا دل حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہی ذات سے متاثر ہوا تھا اس لئے قدرۃً اس سلسلے میں ان ہی کے ذکر کو مقدم کرنا پڑا۔

شاہ صاحب کے بعد دوسری ہستی جس سے متاثر ہونا کیا معنی؟ واقعہ یہ ہے کہ جس تاثر کے بعد اور کچھ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو لیکن جو کچھ پہلے تھا۔ اس تاثرِ جدید کے بعد قطعاً وہ باقی نہ رہا۔

داستانِ انقلاب

اب انقلاب کی اس داستان کو سنئے، دل پر یہ افتاد جس زمانے میں پڑی تھی، اور جس حادثہ کی شکار یہ جانِ حزیں ہوئی، اس وقت بھی یاد آتا ہے کہ مولانا حالی مرحوم کی مسدس کے مقدمہ والا مشہور شعر

آں دل کہ رم نمودے، از خوب رو جواناں
دیرینہ سال پیرے بردہ بیک نگاہے

Toobaa-elibrary.blogspot.com

زبان پر جاری تھا۔ اور اب بھی جب خیال آجاتا ہے، تو بے ساختہ حافظہ میں یہی شعر تازہ ہو جاتا ہے، شاید پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ دار العلوم دیوبند کے تعلیمی رشتہ میں منسلک ہو جانے کے بعد خاکسار چند مہینوں تک دار العلوم کے اکثر اساتذہ سے بیگانہ اور ناآشنا ہی رہا، ان استاذوں میں حضرت سیدنا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے، پڑھنے کی حد تک تو طلبہ کے ساتھ، ان کے حلقۂ درس میں دوسروں کی طرح فقیر بھی بیٹھ جاتا تھا۔ لیکن براہِ راست ذاتی نیازمندی کا موقع اب تک میسر نہ آیا، اپنی اس محرومی کے اسباب کیا عرض کروں، خیر کا بادی رجحانات کا کچھ دباؤ تھے، اور کچھ یہ خیال کر دار العلوم میں لال پیلے، ہر رنگ برنگ کے طلبہ مختلف صوبجات ہند بلکہ مختلف اقالیم کے کیڑے مکوڑوں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں، کوئی وجہ نہ تھی کہ اپنے آپ کو انھیں کیڑوں میں سے کوئی ناپرسان کیڑا اور گمنام مکوڑا خیال نہ کرتا کوئی ایسی بات اپنے اندر ایسی نظر نہ آئی کہ ان بزرگوں سے ذاتی تعارف کی ہوس دل میں پیدا ہوتی، الغرض کچھ اسی قسم کے ملے جلے اسباب و مؤثرات تھے، جنھوں نے کئی مہینے تک حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے میرے تعلقات کو درس کے عام حلقے تک ہی محدود رکھا۔ دستور یہی تھا کہ کتاب یعنی ترمذی شریف کا جو نسخہ مدرسے سے عاریۃً پڑھنے کے لئے ملا تھا، بغل میں دبائے طلبہ کے ساتھ نو درہ کے شمالی سمت کی طرف بالاخانہ پر جو ایک وسیع و عریض کمرہ تھا۔ اسی میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بھی پڑھاتے تھے، اور شاہ صاحب بھی! بس اسی کمرے میں حاضر ہو کر طلبہ کے حلقہ میں کسی جگہ بیٹھ جاتا، زیادہ تر پچھلی صفوں ہی میں میرے لئے جگہ نکلتی دوسرے طلبہ پہلی صفوں پر قبضہ کر لیتے، اسی لئے جہاں تک میرا خیال تھا حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی نظر بھی اس فقیر پر نہ پڑی ہو گی، البتہ کبھی کبھی کوئی ضروری بات دریافت کر لیا کرتا تھا، ممکن ہے، اس کی وجہ سے خطاب کا موقع حضرت والا کو مل جاتا ہو، لیکن اسی پچاسی طلبہ کی بھیڑ میں اس کی توقع کہ سوال و جواب اور وہ بھی معمولی طالب علمانہ

انداز کے، ذاتی تعارف کا ذریعہ بن جائیں گے، یقیناً بے بنیاد ہی ہو سکتی ہے، بہرحال یوں ہی دن گزرتے رہے۔

حضرت شیخ الہند کا درس

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے درس کی شان، شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درس سے مختلف تھی، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ دوہرا اوڑھے ہوئے، اگر سرما کا موسم ہوتا، اور شاید درس جس زمانے میں شروع ہوا تھا، جاڑوں ہی کا زمانہ تھا سر پر دوپلی ٹوپی۔ بدن میں کھادی کا لمبا کرتا، کھادی ہی کا پائجامہ، اسی لباس میں ہاتھ میں لٹھیا لئے ہوئے، زینہ سے تشریف لاتے، درس کے کمرے میں ایک گدا جو لچکدار تاروں سے خاص طور پر اسی لئے بنایا گیا تھا کہ بواسیر کے مسوں کی وجہ سے عام قسم کے گدے پر آپ کو تکلیف ہوتی تھی، اسی گدے پر بیٹھ جاتے، دوہرے کے اندر محسوس ہوتا تھا ان کی انگلیاں تسبیح کے دانوں کے پھیرنے میں مصروف ہیں، طالب علم حدیث پڑھتا جاتا، اور آپ سنتے جاتے، دورہ میں ترجمہ بزبان اردو کا قصہ ختم ہو جاتا تھا۔ اس لئے کہ مشکوٰۃ میں حدیث کا متن طلبہ پہلے پڑھ چکے ہوتے، کہا جاتا ہے کہ دورہ میں شریک ہونے والے طلبہ، ترجمہ کی ضرورت سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے بطور "سرد" کے ایک حدیث کے بعد دوسری حدیث، دوسری کے بعد تیسری حدیث گزرتی چلی جاتی، لیکن کبھی کبھی "ہاں چلئے" کے سوا شیخ الہند کی زبان مبارک پر بمشکل کوئی لفظ آتا۔ گویا قطعی ایک خاموش درس تھا۔ جب کوئی ایسی حدیث آجاتی، جو بظاہر مفہوم کے لحاظ سے قطعی طور پر حنفی مذہب کے خلاف ہوتی، اور پڑھنے والا طالب علم خود رک کر دریافت کرتا یا دوسرے طلبہ پوچھتے "حضرت یہ حدیث تو امام ابوحنیفہ کے قطعاً خلاف ہے" جواب میں مسکراتے ہوئے بے ساختہ شیخ الہند کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلتے "خلاف تو ہے بھائی! میں کیا کروں؟ ہاں آگے چلئے" طالب علم عرض کرتا کہ حضرت آخر امام صاحب کی طرف سے

Toobaa-elibrary.blogspot.com

کوئی جواب اس کا دیا گیا ہے؟ تمہاری کتابوں میں کچھ لکھا ہوگا پڑھ لینا" یہ فرما کر ٹال دیا جاتا، طالب علم مصر ہوتا کہ آپ اپنا خیال ظاہر کیجئے فرماتے "بھائی بڑے بڑے علماء کے حواشی تو تمہاری کتابوں پر چڑھے ہوئے ہیں۔ ان کو پڑھ لو" طلبہ کا اصرار جب حد سے تجاوز کر جاتا، تب نہایت مجمل الفاظ میں کچھ اجمالی اشارات فرما دیتے۔ اسوقت ان اشاروں کی اہمیت محسوس نہ ہوتی تھی لیکن کم از کم اپنی حد تک فقیر یہ کہہ سکتا ہے کہ زندگی میں بعد کو پڑھنے پڑھانے، لکھنے لکھانے کے طویل مواقع جو ملے بلغیر مبالغہ کے عرض کر رہا ہوں کہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ان اجمالی اشاروں کا وزن روز بروز دل میں بجائے کم ہونے کے بڑھتا ہی چلا گیا، ایک نہیں، خلافیات کے سلسلے میں بیسیوں مسائل میں آخری تحقیقی بات وہی ثابت ہوئی جس کی طرف حضرت شیخ الہند اجمالی اشارے فرما دیا کرتے تھے، خام علم والے طلبہ پر ان پختہ باتوں کا ابتداء میں کم اثر ہوتا، وہ پھر اعتراض کرتے، شیخ الہند ذرا زیادہ گہرے ہو جاتے، اور یوں آہستہ آہستہ طالب علموں کو فکر و تحقیق کا خاص طریقے سے وہ عادی بناتے، لیکن باہر سے دیکھنے والا شیخ الہند کے اس سیدھے سادے طریقہ درس سے اگر متاثر نہ ہوتا، تو جو رنگ تھا۔ ظاہر اقتضاء اس کا یہی ہو سکتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ کمال بے نفسی کے بغیر اس قسم کے درس کی ہمت عام مدرسین میں شاید پیدا نہیں ہو سکتی، اس مناظراتی طریقہ تدریس نے بالآخر مجھے اس فیصلہ تک پہونچا دیا کہ یہ پیر سال خوردہ حد سے زیادہ ثاقب ذہن کا مالک ہے۔

ان کی غیر معمولی دقت فطرت کا اندازہ بتدریج ہوتا رہا، لیکن پھر بھی ذاتی تعارف کی صورت پیدا نہ ہو سکی، کبھی کبھی دل میں یہ ہوک اٹھتی تھی کہ گھر پہونچ کر شفاہی لقاء کا شرف حاصل کروں، لیکن اب خجالت مانع آجاتی تھی، خیال آتا کہ اتنے دنوں سے حضرت سے مستفید ہو رہا ہوں، اور ملاقات کی توفیق نہ ہوئی، اب کس منہ سے سامنا کروں۔

ایک عجیب ہولناک کیفیت

انھیں حالات میں تھا کہ اچانک میرے اندر ایک کیفیت شروع ہوئی، عجیب کیفیت؟ خصوصیت کے ساتھ زیادہ تر یہ کیفیت شیخ الہند کے حلقۂ درس میں جہاں تک یاد آتا ہے، زیادہ شدت پذیر ہو جاتی، اس وقت تو اس کے ذکر سے بھی جی گھبراتا ہے، لیکن جب واقعات ہی کے لکھنے پر آمادہ ہو گیا ہوں تو اس کا تذکرہ کیسے نہ کروں،

ہونے یہ لگا کہ جوں ہی حدیث شروع ہوتی، اپنے ذہن میں الجھنوں کے طوفان کو پاتا، طرح طرح کے شبہات، ہر حدیث میں ہوتے، یہ شبہے طالب علمانہ اور مولویانہ نہ تھے، بلکہ مصیبت یہ تھی کہ ذات رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے۔ العیاذ باللہ۔ ان خبیث اور گندے وساوس اور خیالات کا عموماً تعلق ہوتا، بدگمانیوں کی ایک آگ تھی جو معلوم ہوتا تھا کہ میرے باطن میں بھڑک اٹھی ہے، دو گھنٹے تک عموماً ترمذی شریف کا یہ درس مسلسل جاری رہتا، اور ایک سیاہ کار، سیاہ سینہ ان دو گھنٹوں کے اندر ان ہی شکوک و شبہات کی آتشیں لہروں میں جلتا بھنتا رہتا، ہر حدیث میرے لئے، بدگمانی اور سوء ظن کا چقماق گویا بنتی چلی جاتی تھی، دماغ صرف ہرزہ اندیشیوں اور یاوہ بافیوں کا کارخانہ بنا ہوا تھا، درس سے فارغ ہو کر جب اپنی فرودگاہ حجرۂ قبریہ میں آتا، تو تنہائی میں دیر تک اپنے نفس، دل و دماغ کے ان عجیب و غریب آثار کو سوچ سوچ کر کیا عرض کروں کہ کس طرح گھلتا چلا جاتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ قدیم فلسفہ کے ساتھ اخباروں اور رسالوں کے ذریعے موجودہ الحادی رجحانات سے گونہ واقف ہونے کے مواقع مجھے ضرور ملے تھے، لیکن بحمد اللہ ایسا کبھی وقت جہاں تک یاد پڑتا ہے کبھی نہیں گزرا تھا کہ دین کی آخری بنیاد رسالت محمدیہ علی صاحبہا الف الف سلام وتحیۃ کے متعلق شک و شبہ کا کوئی کانٹا دل میں کبھی کھٹکا یا چبھا ہو، اور نہ یہ پاک رشتہ ایمانی حدود سے بہرحال اپنی سیاہ کاریوں، اور بداعمالیوں کے باوجود دور ہونے

Toobaa-elibrary.blogspot.com

نہیں دیتا تھا، لیکن دل و دماغ پر اب جو دورہ پڑا تھا، محسوس ہو رہا تھا کہ دین کی مرکزی چٹان ہی سے پاؤں والعیاذ باللہ پھسل رہا ہے، اُف! اس تاریکی اور اندھیری کا اب جب خیال آتا ہے، تو کانپ اٹھتا ہوں گھبرا گھبرا کر کبھی تن تنہا جنگلوں اور کھیتوں کی طرف نکل جاتا، غلطاں و پیچاں انھیں خیالات و وساوس میں ٹہلتا رہتا۔ باتیں ایسی تھیں کہ کسی سے ذکر کر کے دل کی بھڑاس بھی نہیں نکال سکتا تھا، گویا ایک اندرونی آگ لگی ہوئی تھی، جس میں کروٹیں لیتا رہتا، خفقان اور دورے کی شدت روز بروز بڑھتی ہی چلی جاتی تھی، نمازوں میں سوچتا تو یہی سوچتا، دعائیں یہی کرتا کہ پروردگار یہ کیا حال ہے، میں دین کو درست کرنے کے لئے دار العلوم میں حاضر ہوا تھا، لیکن بچا کھچا جو سرمایہ بھی دین و ایمان کا تھا، میرا لُٹا چلا جاتا ہے، میں تو کہیں کا نہ رہا، یاد پڑتا ہے، کبھی کبھی تنہائی میں چیخ بھی نکل جاتی تھی، ایسا معلوم ہوتا کہ پیدا کرنے والے نے جہنم ہی کے لئے مجھے شاید پیدا کیا تھا۔ حالت جب حد سے زیادہ زبوں ہونے لگی، تب ایک خیال یہ بھی سامنے آنے لگا کہ میں دار العلوم کو چھوڑ کر چلا جاؤں، متعدد بار یہ فیصلہ دماغ میں آیا لیکن فیصلہ نے فیصلہ کی صورت اختیار نہ کی۔

شاید انھیں دنوں میں عید الاضحیٰ کی تعطیل کی وجہ سے چند دنوں کے لئے مدرسہ جب بند ہوا، تو کلیر شریف، منگلور، رڑکی وغیرہ پیدل سفر دیوانہ وار رنگ میں بھی فقیر نے کیا جو خود ایک مستقل داستان ہے، موقعہ ملا۔ تو مقالہ ختم کرتے ہوئے اپنے اس مجنونانہ سفر نیز قیام دار العلوم ہی کے زمانے میں گرو کل کانگڑی کی سیاحت کے حالات قلمبند کروں گا (آخر کتاب میں ملاحظہ ہوں)

قدرتی دستگیری

بہرحال اسی عرصہ میں ایک قدرتی دستگیری کی شکل سامنے آ گئی، جماعت دیوبند کے ایک اُمّی رکن، مشہور شخصیت حضرت امیر شاہ نور اللہ مرقدہٗ مینڈھو، جہاں ان کا مستقل قیام تھا، وہیں سے اپنے دستور کے مطابق دار العلوم میں اسی عرصہ میں تشریف فرما ہوئے، رات کو ایک دن مولانا مرتضیٰ حسن

مرحوم کے بھتیجے مولوی محمد حسن چاندپوری، جو اس زمانے میں ایک جوان رعنا تھے، اور تازہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد بحیثیت معین المدرسین کے دار العلوم کے تحتانی کلاسوں کی تعلیم کی خدمت انجام دیتے تھے، ہم عمری کی وجہ سے مولوی محمد حسن سے کافی رسم و راہ پیدا ہو گئی تھی، ان کو آریوں عیسائیوں وغیرہ کی مناظرہ بازیوں کا شوق تھا، جس سے تھوڑی بہت دلچسپی اس زمانہ میں فقیر کو بھی تھی، نودرہ میں مناظرہ کی مشقی مجلسیں جمعہ کی راتوں کو عموماً ہوا کرتی تھیں، مولانا مرتضیٰ حسن صاحب مرحوم صدارت اور حکم ہونے کے فرائض عموماً انجام دیتے تھے۔ مناظرہ کا ایک فریق مولوی محمد حسن کے مقابلہ میں عموماً فقیر ہی ہوا کرتا تھا۔ الغرض مختلف وجوہ سے، ان کے کمرے میں میری بیٹھک رہتی تھی، یاد پڑتا ہے کہ مغرب کے بعد ایک دن ان کے حجرے میں کسی مسئلہ پر ذرا بلند آواز سے کچھ بکواس کر رہا تھا، میری آواز نے امیر شاہ خاں کو متوجہ کیا، اور حجرے سے باہر ٹھٹھک کر دیر تک میری باتیں سنتے رہے، اور پھر چلے گئے، دوسرے دن دریافت کیا کہ یہ نئے طالب العلم کون ہیں، جو رات کو باتیں کر رہے تھے، لوگوں نے پتہ تبلایا، اب یاد نہیں کہ مجھے بلوایا، یا میرے حجرے میں خود قدم فرما ہوئے، بڑی شفقت سے ملے پوچھنے لگے، تم نے کہاں کہاں پڑھا ہے؟ اور کیا کیا پڑھا ہے؟ جو واقعہ تھا، عرض کر دیا گیا، چند ہی دنوں میں ان کی خصوصی توجہات کا مرکز بن گیا، بڑے پتہ کی باتیں ان سے معلوم ہوتی تھیں، لیکن میرے دل کی آگ کا پانی ان کے پاس بھی نہ تھا، جب ان سے انس اتنا زیادہ بڑھ گیا، تو جن خیالات و کیفیات میں الٹ پلٹ رہا تھا۔ آخر پریشان ہو کر ایک دن تنہائی میں امیر شاہ خاں کی خدمت میں انتہائی بے کسی کے ساتھ اپنی ذہنی آوارگی کی روداد! سنا ہی دی

پند پیر دانا

اس سرد و گرم چشیدہ پیر دانا نے غور سے میرے درد کی داستان سنی، سب کچھ سن لینے کے بعد بولے کہ اپنے ان خیالات کا تذکرہ اپنے استاد مولوی محمود حسن سے کیوں نہیں کرتے۔ میں نے

Toobaa-elibrary.blogspot.com

آبدیدہ ہو کر عرض کیا کہ میری کور بختی نے ان کے دربار تک پہونچنے کا موقع میرے لئے باقی نہیں رکھا ہے، مجھے شرم آتی ہے کہ اتنے دن دیوبند میں گزر گئے، اور حضرت کی خدمت میں حاضری کی توفیق میسر نہ آئی۔ ایسا مانا کرتے ہوئے ندامت اور خجالت محسوس ہوتی ہے۔ خاں صاحب نے اس پر تسلی و تشفی کے کلمات فرماتے ہوئے کہا کہ میں تم کو مولوی صاحب کی خدمت میں لے چلوں گا، ان سے ضرور ملو، اور جو حال ہے، انکو ان پر پیش کرو، وقت مقرر ہو گیا۔

شیخ الہندؒ کی خدمت میں حاضری

شاید عصر کے بعد کسی دن، امیر شاہ خاں صاحب مرحوم اپنے ساتھ لیکر حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہوئے، باہر کے ایک پلنگ پر تشریف فرما تھے، سلام کیا، مصافحہ کا شرف حاصل ہوا تب امیر شاہ خاںؒ نے فرمایا کہ یہ آپکے شاگرد ہیں، دورے کے طالب العلم ہیں، آپ کی خدمت میں کچھ عرض کرنے کیلئے حاضر ہوئے ہیں، ان سے یہ سن کر حضرت نے فقیر کیطرف خطاب کر کے فرمایا "آپ تو حدیث کے درس میں آتے ہیں" یہ پہلا فقرہ تھا جس سے معلوم ہوا کہ کم از کم حضرت والا کے لئے جیسا کہ میں سمجھے ہوئے تھا یہ غریب قطعاً مجہول المطلق ہونے کی حیثیت تو نہیں رکھتا۔ اتنا بہرحال وہ بھی جانتے ہیں کہ ان کے حلقۂ درس کا ایک طالب العلم میں بھی ہوں، پھر فرمایا کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ شاید اس وقت خلوت کی درخواست میری طرف سے پیش ہوئی، جو منظور ہو گئی، اور غالباً برآمدے کے بعد جو ہال حضرت کی نشستگاہ ہے، وہاں تشریف لے گئے، اور جب کوئی نہ تھا۔ شاید امیر شاہ خاں صاحب مرحوم بھی نہیں تو بھرائی ہوئی آواز میں دکھ کا افسانہ شروع کر دیا گیا، جو دل پر گزر رہی تھی بے کم و کاست عرض کرتا رہا۔ سنتے رہے، خاموشی کے ساتھ سنتے رہے، داستان جب ختم ہوئی، تو وہی بات جو ابتک زیادہ لمبی اور طویل نظر آتی تھی، شیطان کی آنت سے بھی زیادہ طویل، صرف ایک فقرے سے سکڑ گئی، اور ہمیشہ کیلئے سکڑ گئی،

داستان ختم ہو گئی، ارشاد ہوا "مولوی صاحب! آپ اتنے پریشان کیوں ہیں اپنا یہ حال جب آپ کے لئے اتنا ناگوار ہے، تو یہ بے ایمانی کی نہیں آپ کے ایمان کی دلیل ہے، ایمان نہ ہوتا تو ان حالات میں اتنا پریشان ہی کیوں ہوتے، بعد کو یہ مضمون نبوت کے ارشادات میں بھی ملا لیکن پہلی دفعہ حضرت شیخ الہند کی زبان مبارک سے یہ الفاظ اس طرح نکلے کہ دل میں معلوم ہوتا تھا کہ کچھ تھا ہی نہیں، طمانیت اور بشاشت کی لہریں میرے چہرے پر کھیلنے لگیں، یہ دیکھ کر تب ارشاد ہوا کہ آپ نے کہاں کہاں اور کیا پڑھا ہے، اپنی تعلیمی روداد سنادی گئی، زیادہ وقت قدیم فلسفہ اور منطق کے پڑھنے میں صرف ہوا تھا۔ یہ معلوم کر کے فرمانے لگے، جو کچھ آپ کچا پکا نگلتے چلے گئے ہیں، اب وہی سب کچھ باہر نکل رہا ہے، پریشان ہونے کی بات نہیں ہے۔ شاید بے اختیار گریہ کے ساتھ عرض رہا ہوا کہ حضرت میرے لئے خواہ کچھ بھی ہو، اب یہ حالت ناقابل برداشت ہے میرے لئے اس قسم کے وساوس و اوہام کسی حیثیت سے بھی ہوں ناقابل تحمل ہیں میری زندگی خطرے میں ہے۔

زندہ کرامت

اب خواہ دنیا مانے یا نہ مانے، لیکن اپنے ذاتی تجربہ کا میں کیا کروں، جواب میں فرمایا گیا، مولوی صاحب! جاؤ اب کوئی شبہہ اور کسی قسم کا شک تم کو نہ ہوگا، یہ یا اسی کے ہم معنی الفاظ تھے، آج کے تقریباً چالیس سال پہلے، اللہ کے ایک برگزیدہ دوست کی مبارک زبان سے یہ بات نکلی، خاکسار، اس کا دماغ، اس کا دل، اس کی زندہ شہادت ہے کہ اس طویل عرصہ میں بحمد اللہ پھر کسی قرآنی آیت، یا کسی نص نبوی میں کسی قسم کا کوئی شبہہ اب تک تو پیدا نہیں ہوا، عموماً یہی ہوتا ہے کہ کوئی ایسی چیز سامنے آتی بھی ہے، تو معاً اس کے حل کے مختلف پہلو دماغ میں آجاتے ہیں، اور یہ نہ ہوا تو اجمالاً ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا جواب موجود ہے، خواہ اس کی تفصیل کی قدرت اسوقت سردست مجھ میں نہ پائی جاتی ہو، گویا کہ کوئی کیل ٹھونک دی گئی ہو کہ وہی دل جو لرزاں اور ترساں رہتا تھا کچھ ایسا بیٹھ گیا کہ خواہ کچھ بھی

Toobaa-elibrary.blogspot.com

گزرے وہ اپنی جگہ پرسے نہیں ہلتا، اسی لئے سیدنا حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی ایک زندہ کرامت خود اپنے آپ کو، اپنے دل ودماغ کو اپنے ذہنی رجحانات ومیلانات کو سمجھتا ہوں، میں کیا تھا، اور کیا ہو گیا، بعد کو حالات نے مجھ کو جو کچھ بھی بنا دیا ہو، لیکن اسوقت جو صورت پیش آئی تھی کہہ سکتا تھا ؂

ذرہ بودیم آفتاب شدیم
سنگ خارا بدیم آب شدیم

ذاتی تعارف کا بند دروازہ اسکے بعد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے بھی کھل گیا، اور علاوہ درسگاہ کے حضرت والا کی خانگی صحبتوں میں شرکت کی سعادت بھی اس کے بعد بحمد اللہ میسر آنے لگی۔

حضرت شیخ الہند کا ارشاد مبارک "یعنی جاؤ اب کسی قسم کا وسوسہ نہیں ہو گا" تقریباً چالیس سال پہلے کی بات ہے، صحیح الفاظ یہی تھے یا اس کے قریب قریب، لیکن مفاد و مفہوم یہی تھا۔ وہ دن تھا، اور آج کا ہے۔ اس عرصے میں کہاں کہاں جانا پڑا، کن کن مخلوں میں شریک ہونے کے مواقع پیش آتے رہے۔ کیا کیا نہیں سنا، کیا کیا نہیں پڑھا، اونچوں سے بھی ملا، اور نیچوں سے بھی میل ملاپ رہا، بگڑے ہوؤں سے مڈبھیڑ ہوئی، سلجھے ہوؤں سے بھی ربط ضبط رہا، لیکن ان کی یہ کرامت اب تک زندہ ہے کہ وساوس وخطرات کے سوا جس کے اندر شاید کچھ نہ تھا کم از کم اسلامی دین کے عقائد واعمال، قرآنی آیات، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ونبوت کی حد تک ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل میں بھی انکی طرف سے برف کی سِل بھر دی گئی اور دماغ بھی برفانی خنکیوں سے گویا معمور ہے، پہلے بھی وہی قرآن وحدیث پڑھتا تھا، مگر وسوسوں کی چنگاریوں کیساتھ پڑھتا تھا۔ اور وہی قرآن اب بھی پڑھتا ہے، حدیثیں بھی اس کی نظر سے گزرتی رہتی ہیں لیکن بیان کر سکے یا نہ کر سکے، تاہم محسوس اس کو یہی ہوتا ہے کہ جو کچھ کہا گیا، اس کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

اس اعجازی اثر کے ساتھ حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ وجزاہ عنا خیر الجزا کی مجلس مبارک سے واپس ہوا۔

بدلا ہوا رنگ

دوسرے دن حلقۂ درس میں حسب دستور حاضر ہوا حاضری کا یہ رنگ گذشتہ حاضریوں کے رنگ سے مختلف تھا، ہر نیا دن جو اس کے بعد آتا جاتا تھا، اس میں یہ بدلا ہوا رنگ پختہ سے پختہ تر ہونے لگا، اب ان کی ہر بات کانوں سے گزرتی، دل میں اترتی چلی جاتی تھی، درس میں جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، حضرت والا خود اپنی طرف سے بہت کم کہا کرتے تھے، طالب العلم ہی جب پوچھتا، اور پوچھنے میں اصرار کی حد تک اس کا استفساری لہجہ پہونچ جاتا، تب جواب دیا کرتے، اور اس میں بھی مناظرہ کا عادی طلبہ کو بنایا جاتا۔ اب سمجھ میں آتا ہے کہ طالب العلم ہی خود اپنے سوال کو حل کرے، بحث کے اس طریقے سے چاہا جاتا تھا کہ اس کا ملکہ اور سلیقہ اس میں خود پیدا ہو، خود فکری کا عادی بنے، خلافیات میں، چالیس برس گزر جانے کے بعد سوال وجواب کے وہ سلسلے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب تک دل ودماغ میں تروتازہ ہیں، ان کی بتائی ہوئی گھاتیں، اور سکھائے ہوئے پینترے اپنی آئندہ تعلیمی وتدریسی زندگی میں ہمیشہ دستگیری کرتے رہے، علاوہ تمام مباحث ومسائل کے کبھی کبھی ایسے عمیق نکتے سننے میں آجاتے تھے کہ آج بھی ان کو سوچ کر سر دھنتا ہوں۔

محبت نبوی میں نفسانیت

بخاری شریف کا سبق ہو رہا تھا، مشہور حدیث گزری کہ تم میں سے کوئی اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا، جبتک کہ اس کے مال اور بال بچے اور سارے انسانوں سے زیادہ میں اس کے لئے محبوب نہ ہو جاؤں (لا یکون احدکم مومناً حتی اکون احب الیہ من مالہ وولدہ والناس اجمعین[1] او کما قال)

(۱) یہاں حدیث کے الفاظ میں کچھ تسامح ہو گیا ہے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں (باقی اگلے صفحہ پر)

Toobaa-elibrary.blogspot.com

کا جو حاصل اور ترجمہ ہے حدیث مشہور ہے، اور جانی پہچانی جاتی ہے۔ فقیر ہی نے عرض کیا کہ بحمد اللہ عام مسلمان بھی سرکارِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق محبت کی اس دولت سے سرفراز ہیں جس کی دلیل یہ ہے کہ ماں باپ کی توہین کو تو ایک حد تک مسلمان برداشت کرلیتا ہے، زیادہ سے زیادہ گالیوں کے جواب میں وہ بھی گالیوں پر اتر آتا ہے لیکن رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ہلکی سی سُبکی بھی مسلمانوں کو اس حد تک مشتعل کردیتی ہے کہ ہوش وحواس کھو بیٹھتے ہیں۔ آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ جان پر لوگ کھیل گئے۔ سن کر حضرت نے فرمایا کہ ہوتا بے شک یہی ہے، جو تم نے کہا، لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے؟ تہ تک تمہاری نظر نہیں پہونچی، محبت کا اقتضا یہ ہے کہ محبوب کی مرضی کے آگے ہر چیز قربان کی جائے۔ لیکن عام مسلمانوں کا جو برتاؤ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی مبارک کے ساتھ ہے، وہ بھی ہمارے تمہارے سامنے ہے، پیغمبر نے ہم سے کیا چاہا تھا، اور ہم کیا کر رہے ہیں، اس سے کون ناواقف ہے۔ پھر سُبکی آپ کی، جو مسلمانوں کے لئے ناقابلِ برداشت بن جاتی ہے، اس کی وجہ محبت تو نہیں ہوسکتی خاکسار نے عرض کیا، تو آپ ہی فرمائیں، اس کی صحیح وجہ کیا ہے؟

نفسیاتِ انسانی کے اس مبصر حاذق نے فرمایا کہ سوچ گے تو درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سبکی میں اپنی سبکی کا غیر شعوری احساس پوشیدہ ہوتا ہے، مسلمانوں کی خودی اور انانیت مجروح ہوتی ہے، ہم جسے اپنا پیغمبر اور رسول مانتے ہیں ہم اس کی اہانت نہیں کرسکتے۔ چوٹ درحقیقت اپنی اسی "ہم" پر پڑتی ہے لیکن مغالطہ ہوتا ہے۔ کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نے انتقام پر انکو آمادہ کیا ہے، نفس کا یہ

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ کا) لا یؤمن احدکم حتیٰ اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین۔ کوئی شخص اسوقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کے والد، اسکی اولاد اور تمام لوگوں سے بڑھ کر اس کے نزدیک محبوب نہ ہو جاؤں (بخاری کتاب الایمان)

دھوکہ ہے، اپنی جگہ ٹھنڈے دل سے جو غور کریگا، اپنے طرزِ عمل کے تناقض کے اس نتیجے تک پہونچ سکتا ہے، بہرحال محبوب کی مرضی کی جسے پرواہ نہ ہو، اذان ہو رہی ہے اور لایعنی اور لاحاصل گپوں سے بھی جو اپنے آپ کو جدا کر کے مؤذن کی پکار پر نہیں دوڑتا، اسے انصاف سے کام لینا چاہئیے کہ محبت کا دعویٰ اس کے منہ پر کس حد تک پھبتا ہے۔

حضرت والا کی تقریر کا یہی خلاصہ تھا ظاہر ہے۔ ندامت اور شرمندگی کے ساتھ سر جھکا لینے کے سوا، ان کی اس نفسیاتی تنبیہ کے بعد میرے لئے کچھ اور پوچھنے کی گنجائش ہی کیا باقی رہی تھی

درسِ بخاری

سیدنا شیخ الہند کی ژرف نگاہی اور ان کے حکیمانہ نقطۂ نظر کا سب سے زیادہ تجربہ اسوقت ہونے لگا جب بخاری شریف شروع ہوئی بخاری کے مہمات میں جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں سب سے زیادہ اہم تراجم(۱) ابواب کا معاملہ ہے قرآنی آیات میں مناسبت اور باہمی ربط جیسے قرآن کی سب سے بڑی حکمت ہے، اسی طرح امام بخاری کے تراجم ابواب کا رنگ بھی تقریباً یہی ہے، بظاہر بے ربطی ہے جس میں ربط کا راز پوشیدہ ہوتا ہے۔ لیکن ہر باب کی حدیثوں کا باب کے تراجم سے کیا تعلق ہے، شاید جس دن سے یہ کتاب اہلِ علم کے حلقے میں پیش ہوئی ہے، حل کرنے والے، تراجم ابواب کے اس معمے کو حل کرنے میں منہمک ہیں، ہزار سال سے زیادہ مدت میں سوچنے والوں نے اس سلسلہ میں جو کچھ سوچا اور لکھا ہے، کتابوں میں عموماً وہ محفوظ ہے، لیکن باایں ہمہ اہلِ بصیرت یہی کہتے چلے آرہے ہیں کہ امت پر امام بخاری کا جو قرض چڑھ گیا ہے

---

(۱) امام بخاری، کسی حدیث کے ذکر کرنے سے پہلے باب قائم کرتے ہیں، اور اس باب کا ایک مجمل عنوان ذکر کرتے ہیں۔ گویا حدیث اس اجمال کی تشریح یا عنوان کے دعویٰ کی دلیل ہوتی ہے۔ لیکن یہ تشریح یا دلالت ہمیشہ واضح نہیں ہوتی۔ کبھی بہت خفی ہوتی ہے، انھیں عنوانات ابواب کو تراجم ابواب یا ترجمۃ الباب" کے عنوان سے اہلِ علم ذکر کرتے ہیں۔

Toobaa-elibrary.blogspot.com

اُس کے اتارنے میں، جیسا کہ چاہیئے، اب تک صحیح معنوں میں کوئی کامیاب نہیں ہوا، حافظ الدنیا علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی شرح بخاری دوسرے پہلوؤں سے جس حد تک بھی مکمل شرح ہو لیکن تراجم ابواب کا قصہ ان کی شرح کے بعد بھی یہی سمجھا جاتا ہے کہ ہنوز تشنہ ہے، شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی تراجم کے حل کو اپنی بحث کا موضوع خاص بنا کر مستقل رسالہ ہی ارقام فرمایا ہے، کوئی شبہ نہیں کہ حضرت شاہ صاحب کے اس رسالے نے بخاری کے تراجم ابواب کے سمجھنے کی نئی شاہراہ شاید پہلی دفعہ کھولی یہی ولی اللہی راہ تھی، جو شیخ الہند رحمۃ اللہ کے سامنے دراشتہ آئی۔

حقیقت یہ ہے کہ جس وقت تراجم ابواب کی بحث شیخ الہند رحمۃ اللہ کے حلقے میں چھڑ جاتی تھی، تو حضرت والا پر بھی خاص حال طاری ہو جاتا تھا۔ اور سننے والے بھی محو حیرت بن جاتے تھے، وجد کی سی کیفیت میں معلوم ہوتا تھا کہ سارا مجمع ڈوب گیا ہے، کَاَنَّ عَلٰی رُءُوْسِہِمُ الطَّیْرَ کا منظر قائم ہو جاتا تھا، خود وہ بھی کھل جاتے تھے، اور سننے والے بھی کھلے جاتے تھے، نئے معارف، جدید حقائق جو نہ کبھی سنے گئے، اور نہ پڑھے گئے، معلوم ہوتا تھا کہ ان سے پردے ہٹ رہے ہیں، دل کی گرہیں وا ہوتی چلی جاتی ہیں،

اپنے تراجم میں امام بخاری کا قاعدہ یہ ہے کہ قرآنی آیتوں کو حسب ضرورت شریک کرتے چلے گئے ہیں۔ اس بہانے سے ان قرآنی آیتوں کے نئے پہلوؤں کے جاننے ہی کا موقع نہیں ملتا تھا، بلکہ قرآن فہمی کی نئی راہیں بھی کھلتی تھیں، اور میں کیا بتاؤں کہ ترمذی شریف کے درس کے بعد، بخاری شریف کا درس جب شروع ہوا تو دل کے لئے بھی اور دماغ کے لئے بھی کیسی لذیذ خوراکیں ملنے لگیں، ایسی خوراکیں، جو منطق کی کسی کتاب میں ملیں نہ فلسفے میں، نہ ادب میں اور نہ کسی اور فن میں ملی تھیں، دوسروں کے متعلق کچھ کہنے کا ظاہر ہے، مجھے کیا حق ہے، لیکن اپنی حد تک یہ محسوس ہوتا تھا کہ میرا باہر بھی بدل رہا ہے اور اندر بھی۔

تبدیلیوں کی داستانِ عجیب

یہ تبدیلیاں اتنی سُرعت اور اور تیزی کے ساتھ اثر انداز ہو رہی تھیں کہ چند ہی دنوں کے بعد تجربے نے ثابت کیا کہ میرے پاس جو کچھ تھا شاید چھن گیا، جن شخصی خصوصیتوں کے ساتھ دار العلوم کے احاطہ میں داخل ہوا تھا، اب نہ وہی باقی تھیں، اور نہ وہ شخصیت۔ تھا تو یہ تجربہ ناگفتنی! لیکن اب جس حال میں ہوں، اور بہت سی ناگفتنیوں کو گفتنی بنا چکا ہوں، انھیں میں ایک یہ بھی سہی!

ہوا یہ کہ انہی دنوں میں جب یہ فقیر بدل رہا تھا۔ دِل بَدَل رہا تھا، اندر بدل رہا تھا، باہر بَدل رہا تھا، دار العلوم کے چند طلبہ مُصر ہوئے کہ معقولات کی مشہور کتاب میر زاہد رسالہ انھیں پڑھاؤں، وہی میر زاہد رسالہ، جس کے پڑھنے میں یہ واقعہ ہے کہ شاید سال بھر سے زائد مدت ٹونک میں صرف ہوئی تھی، حضرۃ الاستاذ مولانا سید برکات احمد نور اللہ مضجعہٗ نے یوں تو منطق و فلسفہ یعنی معقولات کی بھی چھوٹی بڑی کتابیں غیر معمولی توجہ سے مجھے پڑھائی تھیں لیکن میر زاہد رسالہ کے پڑھانے میں جو طریقہ اختیار فرمایا تھا، شاید وہ نیا اور مخصوص طریقہ تھا، میر زاہد کا متن قطبیہ مصنفہ قطب الدین رازی اور امام کی چند سطریں پہلے پڑھائی جاتیں، ان کے بعد ان سطروں کی شرح میں میر زاہد نے اصل شرح میں جو کچھ لکھا ہے، اسے پڑھتا، اپنی شرح پر خود میر زاہد نے جو نوٹ لکھے ہیں، درسی حلقوں میں جن کو منہیہ کہتے ہیں، اس کی نوبت آتی، پھر میر زاہد کی شرح منہیہ پر غلام یحییٰ بہاری کے حواشی پڑھائے جاتے، غلام یحییٰ کے حاشیے پر مولانا عبد الحق خیر آبادی کا جو مطبوعہ حاشیہ ہے، وہ پڑھایا جاتا، پھر خیر آبادی حاشیہ پر موقع موقع سے خود حکیم صاحب قبلہ نے جو کچھ لکھا تھا، اسے بھی پڑھنا پڑتا، یوں آہستہ خرام بلکہ مخرام کی چال کے ساتھ میری کتاب پوری ہوئی تھی، پڑھنے میں جہاں تک یاد آتا ہے ممکنہ توجہ جو مجھ سے ہو سکتی تھی کی گئی تھی اردو زبان میں استاد سے سنی ہوئی تقریروں کو بھی قلم بند کرتا چلا گیا، ظاہر ہے کہ اس خاص طریقے سے پڑھی ہوئی کتاب کے پڑھانے میں دشواری ہی کیا محسوس ہوتی،

Toobaa-elibrary.blogspot.com

قلتِ فرصت کے حیلے حوالے سے کچھ دن تو طلبہ کو ٹالتا رہا، لیکن میرے حیلے حوالے کام نہ آئے، اور پڑھانے کی حامی بھرلی گئی، کل سے درس شروع ہوگا۔ یہ وعدہ کرکے کتب خانے سے مولوی عبدالحق خیرآبادی کا حاشیہ میر زاہد رسالہ والانکال لایا، اپنے ذاتی مطالعہ سے فارغ ہونے کے بعد چاہا کہ ایک نظر اس حاشیہ پر ڈال لوں۔

اب یہیں سے تجربے کا آغاز ہوتا ہے، وہی کتاب جو انہماکِ توجہ کی مذکورہ بالا خصوصیوں کے ساتھ پڑھی گئی تھی، شاید ہی کوئی میرے اس بیان کو تسلیم کرے گا۔ لیکن کیا کیجئے کہ یہی واقعہ پیش آیا کہ پڑھنے کے لئے کتاب کی طرف ہاتھ جسوقت بڑھانے لگا، تو ایسا محسوس ہوا کہ اس پر لرزہ طاری ہے، دل دھڑک رہا ہے۔ یاالٰہی یہ کیا ماجرا ہے، کچھ ہی دن پہلے جس کتاب کا مطالعہ میرے دل و دماغ کا لذیذ ترین مشغلہ تھا، اسی کتاب کے ساتھ دل کے تعلق کا آخر یہ کیا رنگ ہے، کانپ رہا تھا، سوچنے لگا کہ پھر کیا کروں، خیال آیا میرا حال خواہ کچھ ہی ہو، لیکن کل طلبہ بہرحال آئیں گے، اگر اسوقت کل کے درس کے لئے اپنے آپ کو تیار نہیں کیا جائے گا، تو سارا بھرم جاتا رہے گا۔ ٹونک کی نسبت سے میری خلقیت اور معقولیت سے طلبہ کافی مرعوب تھے، غیر معمولی ذہنی کشمکش اور دماغی کوفت کے پنجوں میں گرفتار تھا۔ آخر رسوائی کی اذیت کا خیال غالب آیا، اور جس طرح بھی ممکن ہوا کانپتے ہوئے مرتعش انگلیوں ہی سے کتاب کھولنی پڑی، مگر نہ دماغ قابو میں تھا، نہ دل، مگر بالجبر مطالعہ میں مشغول ہونا ہی پڑا

عبرتناک خواب

اس کے بعد ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ حالانکہ مطالعہ کرتے ہوئے، سو رہنے کا عادی نہ تھا لیکن اسوقت خلافِ عادت کتاب پر سر جھک گیا، اور نیند آگئی۔ نیند میں دیکھتا ہوں کہ ایک طویل و عریض میدان میں ہوں، اور چاروں طرف سے جنگلی سُور حملہ کرتے ہوئے میری طرف بڑھتے چلے آتے ہیں، ان کو دیکھ کر میں بھاگ رہا ہوں، مگر کسی طرح میرا پیچھا نہیں چھوڑتے دیکھا کہ سامنے ایک درخت ہے، سُوروں کے حملے سے بچنے کے لئے میں اس درخت پر

چڑھ گیا، اور درخت کی کسی اونچی شاخ پر بیٹھ گیا، پھر بھی دیکھتا ہوں کہ سوروں نے درخت کو گھیر رکھا ہے، اور ہر ایک میری طرف جھانک رہا ہے، سخت پریشان ہوں یاالٰہی ان سوروں سے نجات کی کیا صورت ہوگی۔

یہ ہی سوچ رہا تھا کہ اچانک کیا دیکھتا ہوں ایک شخص سامنے سے چلا آرہا ہے، ہاتھ میں اسکے ایک چھوٹی سی بندوق ہے، اسی بندوق سے مسلسل سوروں پر فائر کرتا چلا جارہا ہے۔ کسی کی ٹانگ ٹوٹ گئی، کسی کے سینے پر گولی لگی، سوروں میں بھگدڑ مچی ہوئی ہے، چند ہی لمحے میں ان کی ڈار تتر بتر ہوگئی، درخت ہی پر دل میں خیال ڈالا گیا کہ بندوق مارنیوالے یہ صاحب جو اچانک نمودار ہوئے حضرت مولینا سید حسین احمد مدنی ہیں، شاید اسی کے بعد آنکھ کھل گئی، دلچسپ لطیفہ یہ ہے کہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے نام سے تو واقف تھا لیکن حضرت والا کے جمالِ جہاں آراء کی دید کے شرف سے اسوقت تک میری نگاہیں محروم تھیں، تعبیر سوچتے ہوئے، اسوقت یہ خیال کرلیا گیا تھا کہ توفیقِ ربانی کی مثالی شکل اس نام کے ساتھ میرے سامنے آگئی تھی، مگر چند ہی دنوں کے بعد اس خوابیدہ بخت کے طالعِ بیدار نے یہ تماشہ دکھایا کہ حضرت مدنی مدظلہٗ مدینہ منورہ سے دیوبند تشریف فرما ہوئے، پہلی نظر ان پر پڑی، اور اب تک یاد ہے کہ خواب میں جو کچھ دیکھا تھا وہی بیداری میں دیکھ رہا تھا، وہی شکل، وہی شمائل، وہی خط، وہی خال، یہ کیا تھا اسوقت بھی میرے لئے یہ معمہ تھا۔ اور آج تک وہ معمہ حل نہیں ہوا ہے، خود حضرت مدنی سے ایک سے زائد دفعہ پوچھ چکا ہوں، لیکن خواب کا مطلب جب کبھی پوچھا ٹال دیا گیا۔

حیرت اور مسرت کی ملی جلی کیفیت، دل میں اب بھی باقی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس رویا کے بعد میرا فیصلہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا، کہ خواہ کچھ بھی اثر ہو، طلبہ کچھ بھی سمجھیں لیکن سور بن کر جو چیز میرے سامنے آچکی تھی، پھر اس کو بکریاں کیسے خیال کرسکتا تھا کچھ بھی ہو، ہوا یہی کہ فیصلہ کی رات کے بعد جو صبح ہوئی، طلبہ آئے، کتابیں لئے ہوئے آئے خواب تو ایک راز تھا۔ طالب علموں سے اس کا ذکر تو کیا کرتا صرف کہدیا گیا کہ اس کتاب

Toobaa-elibrary.blogspot.com

کے پڑھانے کی صلاحیت مجھ میں باقی نہیں رہی ہے، اس کا جواب نہیں دیا جا سکتا تھا، بیچارے پُرامید آئے تھے مایوس ہو کر واپس ہوئے۔

چہ گویم جلوہائے دیدنی را

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں انہی زمانے میں جب بخاری کا درس جاری تھا منجملہ دوسری خوش نصیبیوں کے اپنی زندگی کی ایک بڑی کامیابی، اس حسن اتفاق کو خیال کرتا ہوں کہ ٹھیک انھیں دنوں میں جب شیخ الہند جیسے شیخ وقت سے پڑھنے کا موقع میسر آیا تھا، شیخ مدنی مدظلہ العالی، اچانک مدینے سے دیوبند تشریف فرما ہوئے، اور تشریف لاکر مسجد نبوی کے حلقۂ حدیث کا شیخ درس، طالب العلم بن کر طلبۂ بخاری کی جماعت میں شریک ہو گیا، شیخ الہند استاد تھے اور شیخ مدینہ شاگرد[۱] درس کے جس حلقے کا یہ رنگ قائم ہو گیا ہو، وہاں غریب طلبہ کا وجود اگر عدم بن کر رہ گیا ہو، تو اس کے سوا اور ہوتا کیا؟ قاری بخاری کے اب شیخ مدنی تھے، اور سارے طلبہ سامع بن گئے، اب میں کیا بتاؤں کہ اس عجیب و غریب درس میں کیا کیا سنا، کیا کیا دیکھا، جنھوں نے نہیں سنا، نہیں دیکھا، سوچ کر ہی ان کو اندازہ کرنا چاہیئے کہ ایک کہنہ مشق فاضل جلیل طالب العلم بن کر اپنے حد سے زیادہ شفیق استاد گرامی سے کیا پوچھتا تھا، اور جواب کیا پاتا تھا، سوال و جواب کی خاص منزل تک پہونچنے کے بعد یہ واقعہ ہے کہ طلبہ کی اکثریت بازو ڈال کر بیٹھ جاتی تھی۔ ایک ایک مسئلے پر شیخ الہند اور شیخ مدینہ کے درمیان دیر تک گفتگو ہوتی رہتی۔ میدان کے دو کھلاڑیوں کے داؤ پیچ کا یہ تماشہ بڑا دلچسپ تھا، اپنے لئے فخر کا

(۱) واللہ اعلم یہ عام دستور تھا، یا اسی سال کی خصوصیت تھی کہ بخاری شریف جس دن شیخ الہند کے یہاں شروع ہوئی، تو دارالعلوم کے ممتاز اساتذہ جن میں سیدنا الامام الکشمیری بھی تھے، تبرکاً و تیمناً پہلے دن کے درس میں طلبہ کے ساتھ مل کر شریک تھے، کچھ جواب و سوال کا سلسلہ بھی جاری ہوا۔

*

سب سے بڑا سرمایہ یہی ہے کہ اس تماشے کے دیکھنے والوں میں اس ظلوم و جہول کو شریک ہونیکا موقع حق سبحانہ و تعالیٰ نے آسان فرمایا۔

مزاحی لطیفے

جذبات کے ساتھ محبوب استاد اور محبوب تلمیذ کے درمیان کبھی کبھی مزاحی لطیفوں کا بھی تبادلہ ہوتا، یاد پڑتا ہے کہ کسی خاص مسئلے میں حضرت مدنی نے فرمایا کہ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ پر اس مسئلے میں امام شافعیؒ ہی غالب نظر آتے ہیں، سننے کے ساتھ حضرت شیخ الہند کی زبان مبارک سے بیساختہ یہ فقرہ نکلا کہ

"ہاں بچھڑنے کی آواز تو میں نے بھی سنی لیکن نیچے کون ہے، اس کو آپ دیکھئے"

شفقت و محبت کے غیر معمولی جذبات نے سخن گستری کے میدان کو وسیع کر دیا تھا، کبھی کبھی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے۔

"آخر عرب کی بداوت سے تم کو بھی متاثر ہونا پڑا۔ بدوؤں کی سمجھ میں یہ نکتہ نہیں آسکتا"

میرے لئے تو ان الفاظ کو نقل کرنا بھی بے ادبی ہے، محبوب استاذ اور محبوب تلمیذ کے درمیان سوز و ساز کے جو تعلقات تھے۔ ان کا رنگ تو انھیں بے تکلفیوں میں نکھرتا تھا، یہ سال مہربانیوں اور لطف و کرم کا سال تھا۔

حضرت مدنی کے حلقۂ درس میں

شیخ الہند کے ساتھ شیخ مدینہ سے بھی نسائی شریف پڑھنے اور سننے کا موقع اسی زمانہ میں میسّر آیا، حضرت مدنی کی تشریف آوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، مدرسہ والوں نے دورے کا ایک سبق آپ کے بھی سپرد کر دیا تھا، زندگی میں پہلا موقع بھی تھا اور آخری بھی۔ کہ براہِ راست عربی زبان میں مطالب کی تقریریں اپنے استاذ سے سنیں۔ حضرت مدنی مدینہ منورہ کی مسجد میں بزبان عربی درس دینے کے

Toobaa-elibrary.blogspot.com

عادی تھے، یہاں بھی حسبِ عادت جو کچھ بھی فرماتے فصیح عربی زبان ہی میں فرماتے اسوقت مدینہ منورہ سے تازہ وارد تھے۔ اب تو ہندوستانی طالب علموں کی رعایت فرماتے ہوئے ہندوستان کے دستور کے مطابق آپ کی درسی تقریریں بھی اردو زبان ہی میں ہوتی ہیں مگر ان پر بھی عربی لب و لہجہ کا رنگ اب بھی غالب ہے۔ گویا بخاری کے سبق میں رفاقت اور نسائی میں تلمذ، ان دوگونہ نسبتوں کا شرف حضرت مدنی کی ذاتِ گرامی سے بحمد اللہ اس ذرۂ ناچیز کو حاصل ہوا جن کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

حضرت شیخ الہند سے ارادت و بیعت

بہرحال حضرت شیخ الہندؒ سے موانست و مناسبت کا رشتہ قوی سے قوی تر ہوتا چلا گیا، تا اینکہ یہی نسبت ترقی کر کے اس حد تک پہونچ گئی، جو افادہ اور استفادہ کے سلسلے کی آخری منزل سمجھی جاتی ہے، ازل سے جس کی غلامی کا حلقہ کان میں ڈالا گیا تھا، ناسوتی زندگی میں اس کی غلامی کی سعادت میسر آئی، عہد جو کیا گیا تھا۔ کیسے کہوں کہ وہ پورا ہوا، لیکن جو کچھ ہونا تھا، وہ بہرحال ہو گیا، اس سے زیادہ شاید کہنے کی گنجائش نہیں کہ شیخ الحدیث ہی کو قدرت نے شیخ الطریق بھی بنا دیا۔

ازبخت شکر دارم و از روزگار ہم

تحریری زندگی کی بسم اللہ

آقا کی طرف سے غلام کی سرفرازیوں کا افسانہ طویل ہے۔ اس سلسلے کے ایک واقعہ کا ذکر سن ہی لیجئے، سینکڑوں طلبہ کے ہجوم میں، ایک کس مپرس طالب علم سے زیادہ جس کی کوئی حیثیت نہ تھی، اپنے حجرہ قبریہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک بندہ کے شیخ پر نظر پڑی، اس حجرے کے باہر جو وسیع کرہ مسجد کے شمالی رخ پر ہے، اس پر چند دیگر حضرات کے ساتھ حضرت جلوہ فرما ہیں۔ ایسا معلوم ہوا کہ جو کچھ نہ تھا اپنے اسی ہیچ کا رخادم کو تلاش کر رہے ہیں، سامنے نکل کر کھڑا ہو گیا۔ چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ اس پر رونق افروز ہو کر ارشاد فرمایا

"مولوی صاحب! میں نے سنا ہے کہ لکھنے پڑھنے کا تم خاص ذوق رکھتے ہو، مدرسہ کی طرف سے القاسم رسالہ جو نکلتا ہے، اس میں مضمون کیوں نہیں لکھتے"۔

لکھنے پڑھنے کا حال یہ تھا کہ شاید دو ایک سطحی صحافی مقالوں کے سوا، آج تک کسی اخبار یا رسالے میں میرا کوئی بڑا یا چھوٹا مضمون شائع نہیں ہوا تھا، حیران تھا کہ حضرت تک اس کی اطلاع کس نے پہونچائی، لیکن جو فرمایا جا رہا تھا، سر جھکائے سنتا رہا، جو حکم دیا جا رہا تھا، تسلیم کے سوا چارہ ہی کیا تھا؟ شاید عذر و معذرت کے الفاظ کچھ یاد آتا ہے خاکسار کی طرف سے پیش بھی ہوئے جن کی شنوائی نہ ہوئی، کیا جاتا تھا کہ آئندہ اسی القاسم کی ادارت سے اپنی علمی زندگی کی بسم اللہ ہوگی "خیر الامم کا طغرائے امتیاز" یہی پہلا مقالہ تھا جو ارشادِ گرامی کی تعمیل میں لکھا گیا، چند شمارے اس مضمون کے مسلسل القاسم میں شائع ہوتے رہے پھر تو القاسم اور الرشید، دار العلوم سے شائع ہونیوالے دونوں مجلوں کے ساتھ ایک ایسا رشتہ قائم ہوا کہ بسا اوقات دونوں رسالوں میں فقیر کے ہفوات کے سوا اور کچھ ہوتا ہی نہ تھا (۱)

(۱) اس زمانہ تک ہمارے قدیم علمی حلقوں کا یہ احساس تھا کہ رسالوں کی مضمون نگاری ہے وقار علمی متاثر ہوتا ہے، دار العلوم کے اساتذہ کی اکثریت میں یہ احساس باقی تھا، حالانکہ القاسم کے مضمون نگاروں میں شیخ الہند، مفتی اعظم، مولانا شبیر احمد رحمہم اللہ اجمعین شریک تھے مگر یہ عملی درس بھی اس احساس کے ازالے کیلئے کافی نہ ہوا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ القاسم، اور الرشید میں مضمون لکھنے پر کوئی آمادہ نہ ہوتا، ادارت کا فریضہ فقیر کے سر ڈالدیا گیا تھا، تنہا دو دو پرچوں کو اول سے آخر تک مضامین سے بھرنا یوں ہی مجھ جیسے نو مشق طالب علم کیلئے آسان نہ تھا، اور کچھ ان رسالوں کی شان کے مناسب بھی نہ تھا، دماغ پر زور دیکر اس زمانے میں ایک نئی ترکیب نکالی گئی یعنی زندہ مضمون نگاروں سے مایوس ہو کر ان لوگوں کے مضامین شائع کرنے لگا جو دنیا میں موجود نہ تھے، پرانے فائل اٹھا کر ان رسالوں کو دیکھئے مضمون نگاروں کی فہرست میں آپکو امام غزالی، امام رازی، شیخ ابن عربی، علامہ محمود آلوسی جیسے بزرگوں کے نام ملیں گے لطیفہ: ایک لطیفہ بھی اس سلسلے میں اسی زمانے میں پیش آیا، لاہور سے الفلاح نامی ایک رسالہ جاری ہوا القاسم اور الرشید سے کبھی کبھی خاکسار کے مضامین نقل ہو کر اس رسالے میں شائع ہوتے تھے، مضمون نگاروں کی فہرست میں مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی شکل میں اپنے نام کو پا کر الفلاح کے مدیر کو لکھا کہ بھائی، یہ فقیر ابھی زندہ ہے، مردوں میں اس کو بھی آپ نے شریک فرمایا۔

Toobaa-elibrary.blogspot.com

دو اہم باتیں

سیدنا حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ تلمذ و بیعت کی سعادتیں، اس کوتاہ بخت، سیاہ کار کے لئے جس حد تک بھی سرمایۂ افتخار و ناز ہوں، کم ہیں، لیکن اسی کے ساتھ مجھے اعتراف کرنا چاہئے کہ حضرت والا کے دامنِ دولت کی وابستگی کی طویل و عریض صف میں اس فقیر کا شمار کسی زمانہ میں بھی نہ قبیل ہی میں تھا، نہ دبیر میں، نہ اگلوں میں وہ کبھی گنا گیا، نہ پچھلوں میں، علماً و عملاً اپنی ہیچ میرزی نے امتیاز کا موقع حاصل ہونے نہ دیا، چونکہ یہ واقعہ واقع ہو چکا ہے کہ حضرت والا کے حلقۂ درس میں، دوسروں کے ساتھ حاضری کا موقع میرے لئے بھی آسان کیا گیا تھا، اور صورتِ حال ہی ایسی پیش آگئی کہ توبہ کی بیعت کیلئے حضرت شیخ الہند کے دستِ حق پرست تک مجھے پہنچا دیا گیا۔ ورنہ اپنی سابقہ اور لاحقہ زبوں حالی کو جب سوچتا ہوں تو دیر تک سوچتا ہوں کہ یہ کیسے ہوا اور کیوں ہوا؟ حضرت والا کے تلامذہ میں کہاں امام کشمیری اور شیخ مدنی، اور انھیں جیسے اجلۂ اکابر شریک ہیں، اسی طرح روحانی تربیت یافتوں میں خدا ہی جانتا ہے کہ کتنے بڑے بڑے مقبولانِ بارگاہِ الٰہی ہوں گے مگر کیا کیجئے کہ آسان کرنیوالے نے کسی زمانے میں ان ہی باتوں کو آسان فرما دیا تھا جن کا تصور بھی اب مجھے لرزہ براندام کر دیتا ہے اور یہ عجیب بات ہے کہ مجھ جیسے ایک عامی آدمی کے حافظہ میں حضرت والا کے متعلق دو ایسی اہم باتیں محفوظ رہ گئی ہیں جن کی روایت کا صحیح استحقاق دراصل آستانہ محمودی کے برگزیدوں ہی کو حاصل تھا۔ مگر اب کیا کروں کہ باوجود کچھ نہ ہو سکنے کے کچھ چیزیں مجھ تک بھی پہونچ گئی ہیں۔ جی نہیں چاہتا کہ اپنی بے وزنی کا خیال کر کے ایسی دو وزن دار باتوں کو اپنی ہی حد تک محدود رکھوں۔

مولانا عبید اللہ سندھی کا مسئلہ

پہلی بات تو وہی ہے جس کا تعلق مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم سے ہے۔ خاکسار جس زمانے میں پڑھنے کے لئے دار العلوم میں داخل ہوا، یہ وہ زمانہ

تھا جب مولانا سندھی اور دار العلوم کے اربابِ حل و عقد کے درمیان تلخیاں بڑھتی ہوئی، اس حد تک پہونچ چکی تھیں کہ دیوبند سے کنارہ کش ہو کر دلی کو مولانا سندھی نے اپنا مستقر بنا لیا تھا۔ اور نظارۃ المعارف القرآنیہ کے نام سے ایک خاص نوعیت کا تعلیمی ادارہ قائم کر کے چند مخصوص طلبہ کو قرآن کا درس اپنے ایک خاص نقطۂ نظر سے دے رہے تھے، ان طلبہ میں دار العلوم کے سند یافتہ بھی تھے، اور غالباً کچھ انگریزی تعلیم یافتہ حضرات بھی اسمیں شریک تھے، اس عرصہ میں کبھی کبھی مولانا سندھی مرحوم دیوبند بھی تشریف لایا کرتے تھے، غرض اصلی تو حضرت شیخ الہند سے ملاقات ہوتی، اور موقع مل جاتا تو ایک چکر دار العلوم کا بھی لگا لیتے۔

خاکسار کچھ تو اپنی نوعمری کی وجہ سے، اور کچھ اس لئے کہ دار العلوم کے حلقۂ طلبہ میں میری حیثیت گویا اسوقت نوگرفتاروں کی تھی! اس لئے دار العلوم کے طلبہ کی جو عام ذہنیت ہوتی، اس کے زیر اثر رہنے پر مجبور تھا، طلبہ کے جس حلقے سے میں زیادہ مانوس تھا، اس کا تاثر یہ تھا کہ مولوی عبید اللہ سندھی صاحب سے دار العلوم کے اربابِ حل و عقد چونکہ ناراض ہیں اس لئے ان طلبہ کی بھی خاص نگرانی کی جاتی ہے، جو سندھی صاحب سے ملتا جلتا ہو، ہو سکتا ہے ہو کہ یہ نوعمری کے تخیلات ہوں، تاہم میں مولانا عبید اللہ صاحب کے نام ہی سے نہیں، بلکہ ایک حد تک ان کے کام سے گونہ واقف تھا، دل میں ان کی عظمت بھی تھی، ان کے علم کی تعریفیں بھی سن چکا تھا، اس لئے جب وہ دار العلوم کے حلقہ میں نظر آتے، تو بے ساختہ ان سے ملنے کا تقاضا دل میں پیدا ہوتا، لیکن پھر یہ سوچ کر کہ کہیں اربابِ بست و کشاد تک خبر نہ پہنچ جائے دل کا ولولہ دل ہی میں بیٹھ کر رہ جاتا

بمشکل ایک دن جب مولانا سندھی مسجد والے احاطہ کے آخری مشرقی کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے، اس زمانے میں ہمارے مرحوم و شہید دوست مولوی منظر الدین شیر کوٹی (مدیر الامان) کی قیام گاہ بھی وہی حجرہ تھا، مدرسہ میں کچھ تدریسی خدمت انجام دیتے تھے اسی احاطہ میں عرض کر چکا ہوں کہ احقر کا بھی حجرہ قریب تھا، مولانا سندھی کو وہاں پاکر دبے پاؤں فقیر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سلام و کلام کے بعد جو باتیں ہوئیں کُل تو یاد نہیں

Toobaa-elibrary.blogspot.com

رہی، ایک جُز یاد رہ گیا ہے،

فقیر نے دریافت کیا کہ آپ کی علمی جد وجہد کا خلاصہ کیا ہے اور آپ کیا چاہتے ہیں؟ جواب میں مولانا سندھی نے جو بات کہی تھی وہ یہ تھی کہ مولوی بہت زیادہ پستی میں پڑے ہوئے ہیں، اور تعلیم یافتہ طبقہ بہت اوپر نکل گیا ہے، مولویوں کو تو چاہتا ہوں کہ ذرا کھینچ کر اوپر کروں، اور تعلیم یافتہ طبقہ کو اسی طرح چاہتا ہوں کہ کچھ نیچے اتار لوں، یوں مولویوں اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کو ایک سطح پر میری خواہش ہے کہ لے آؤں، اس زمانے کی ذہنیت کہ مولانا سے باتیں بھی کرتا جاتا تھا اور ادھر ادھر دیکھتا بھی جاتا تھا کہ کسی صاحب کی مجھ پر نظر نہ پڑ جائے، چند منٹ میں میری ملاقات مولانا سے ختم ہو گئی۔

اس دفعہ تو وہ دلی واپس ہو گئے، لیکن زیادہ وقفہ نہ گزرا تھا پھر دیوبند پہونچے ہم تو طلبہ کے جھمیلے میں تھے۔ افواہاً ادھر اُدھر سے خبریں ملتی رہیں کہ آج کل دار المشورہ میں مولانا عبید اللہ سندھی کا مقدمہ پیش ہے، دار العلوم کے اساتذہ ان سے ایک خاص مسئلہ پر بحث و مباحثہ کر رہے ہیں، لیکن اختلافی مسئلہ کیا ہے، صحیح تعبیر پہونچانے والے مجھ تک نہیں پہونچا سکے، تبلیغ کے مسئلہ میں اختلاف ہے پھر اس سے زیادہ اور کچھ پتہ نہ چل سکا کہ اچانک دار العلوم کی مسجد میں دیکھا گیا کہ مدرسے کے ارباب بست و کشاد جمع ہو رہے ہیں، اساتذہ میں مجھے جہاں تک خیال آتا ہے، بجز حضرت شیخ الہند کے سب ہی موجود تھے، طلبہ کی بھی خاصی تعداد ادھر ادھر سے بطور تماش بینوں کے جمع ہو گئی، اب ترتیب تو صحیح طور پر یاد نہ رہی، لیکن یکے بعد دیگرے دیکھا کہ کھڑے ہو ہو کر تقریر کرنے والوں میں ایک تو مولانا شبیر احمد عثمانی، اور خود مولانا سندھی تھے، اور تیسرے مقرر غالباً مولوی غلام رسول مرحوم استاذ فلسفہ و منطق تھے، مولوی عبید اللہ صاحب نے کھڑے ہو کر جہاں تک خیال آتا ہے، یہ فرمایا کہ قرآنی آیت لِأُنذِرَكُم بِهِ وَمَن بَلَغَ (تاکہ ڈراؤں میں تم لوگوں کو، اور ان لوگوں کو جن تک بات پہونچی) اس سے میں اس نتیجہ تک پہونچا ہوں کہ بنی آدم میں جن لوگوں تک قرآن کا پیغام نہیں پہونچا ہے۔ ان سے مواخذہ اسلام کے نہ قبول کرنے پر نہیں ہو گا۔

اب آگے پورے طور پر یاد نہ رہا کہ انھوں نے کیا کہا، کچھ ایسا خیال آتا ہے کہ اپنے اس خیال کے متعلق یہ کہتے ہوئے کہ عام علماء کی یہ رائے نہیں ہے، بلکہ انکے نزدیک تبلیغ عام ہر فرد تک ہو چکی ہے، اس لئے عدم تبلیغ کا عذر کسی قوم یا فرد کے لئے باقی نہیں رہا ہے، اب واللہ اعلم انھوں نے اپنے اس خیال خاص سے رجوع کا اعلان کیا یا نہیں؟ لیکن دیکھا کہ مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم غصہ میں ان کے خیال پر تنقید فرما رہے ہیں، ان کی تقریر تو یاد نہ رہی، ان کے بعد مولوی غلام رسول صاحب مرحوم نے تقریر کی تھی، ان کی تقریر کا یہ فقرہ بھُولا نہیں جاتا، کہا تھا کہ یہ مولوی عبید اللہ سندھی اگرچہ ہماری جماعت کے ایک فرد ہیں، لیکن جب کوئی عضو سڑ جاتا ہے، تو کاٹ دیا جاتا ہے، اسی طرح ہماری جماعت سے یہ الگ کر دیئے گئے، قریب قریب کچھ اسی نوعیت کے الفاظ تھے، میرا دل بھی اسوقت بھر آیا تھا، اور یاد پڑتا ہے کہ مولوی عبید اللہ صاحب جس وقت تقریر فرما رہے تھے، تو کچھ آبدیدہ سے تھے۔

مجلس برخاست ہو گئی، اس مجلس میں جو کیفیت گزری تھی، میرا دل اس سے بیحد متاثر تھا، غالباً دو کر دن، یا ایک دو دن بعد ترمذی شریف کا درس حضرت شیخ الہند کے حلقہ میں ہو رہا تھا، ہمت کر کے اسی فقیر نے اس مسئلے کو اٹھایا کہ مسئلہ تبلیغ میں جو اختلاف اس وقت رونما ہوا ہے، حضرت والا کا خیال اس باب میں کیا ہے؟ کہنے کو تو کہہ گیا، اور جس طرح سے عرض کیا، اسے کیا بتاؤں؟ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کے جلسہ کی تقریروں کی خبریں حضرت تک بھی پہونچ چکی تھیں، جن سے متاثر تھے، اور خلاف دستور دیکھا کہ ذرا اُچھل کر متوجہ ہو گئے، اور ایک ایسی شستہ اور رفتہ تقریر اس مسئلہ پر فرمائی، جو خاکسار کے نزدیک حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے، اپنی کتاب الدین القیم میں اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے اور عام خیالات کے سوا حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے خاص نظریہ کو درج کر کے آخری فیصلہ حضرت والا کی اسی درسی تقریر کو اپنی کتاب میں قرار دیا ہے، تفصیل

Toobaa-elibrary.blogspot.com

کے لئے تو مناسب ہے کہ اس پوری بحث کا مطالعہ میری اس کتاب میں کیا جائے، جو عام طور پر بازار میں ملتی ہے، ہندوستان و پاکستان میں متعدد اڈیشن اس کتاب کے شائع ہو چکے ہیں، لیکن اسوقت جو تقریر حضرت شیخ الہند نے فرمائی تھی اس کا خلاصہ یہ تھا۔

"تبلیغ اور مواخذہ ان دونوں کی حیثیت کلی مشکک جیسی ہے۔ مثلاً ارشاد ہوا تھا کہ ابوبکر صدیقؓ کو تبلیغ جس رنگ میں ہوئی تھی ظاہر ہے کہ وہی رنگ اس تبلیغ کا نہیں ہو سکتا، جو ہمارا اور آپ کا ہے صدیق اکبر براہِ راست نبوت کبریٰ کے محرم اسرار تھے، جو قرب ان کو حاصل تھا، یقیناً آج کل کے ایک عامی مسلمان کو وہ میسر نہیں ہے۔

اسی طرح حق تعالیٰ کے مواخذہ و گرفت کی نوعیت بھی ایک جیسی نہیں ہے، آخر ابوجہل پر حجت جس طرح پوری ہوئی تھی، اور اسی بنیاد پر جس مواخذہ کا وہ مستحق ہوا یہی نوعیت ان لوگوں کے مواخذہ کی کیسے ہو سکتی ہے، جنھیں ابوجہل کی نشانیاں میسر نہیں"

اس تمہیدی مقدمہ کو سمجھانے کے بعد فرمایا گیا کہ بس اجمالی عقیدہ یہ رکھنا چاہئے کہ ہر شخص کا مواخذہ، اس کی تبلیغ کی نوعیت کے ساتھ وابستہ ہے، جس حد تک تبلیغ ہوئی ہے، اسی حد تک اس سے مواخذہ بھی ہو گا۔ یہ بالکل ممکن ہے ایک شخص ہندوستان یا عرب ہی میں رہتا ہو لیکن اس کے خاص حالات کیوجہ سے دین حق کا پیغام اس شخص تک اس رنگ میں نہ پہونچے، جس رنگ میں یورپ یا امریکہ کے کسی ایسے شخص تک پہونچا ہو جس نے باضابطہ اسلام اور اسلامی تعلیمات اسلامی کتابوں کا مطالعہ کیا ہو

الغرض انفرادی طور پر یہ بات کہ تبلیغ کسے کس درجہ کی ہوئی ہے، حق سبحانہ تعالیٰ ہی اسے جانتے ہیں، اور مواخذہ بھی وہی اپنے علم کے مطابق کریں گے تفصیلی علم تو اسکا

خدا ہی کو ہے، ہمارے لئے اتنی اجمالی بات کافی ہے کہ جسے جس حد تک تبلیغ ہوئی ہے اسی حد تک اس سے مواخذہ بھی ہو گا، اشخاص کو متعین کر کے یہ بتانا آدمی کے لئے ناممکن ہے کہ کسے کس درجہ کی تبلیغ ہوئی ہے، اور جب تبلیغ کے مدارج کا تفصیلی علم نہیں ہو سکتا، تو مواخذہ کی تفصیل بھی ہم کیسے کر سکتے ہیں۔

درس اس دن کافی پرجوش اور گرم تھا، پہونچانیوالوں نے یہ خبر دار المشورہ تک پہنچائی کہ فلاں طالب علم نے آج شیخ الہند کے حلقۂ درس میں فلاں مسئلہ کو چھیڑا ہے، جس کا جواب یہ دیا گیا ہے، کافی شور و غوغا ہوا، نو درہ میں ایک جلسہ بھی طلب کیا گیا، اور اس غلط فہمی کے پھیلنے کا جو اندیشہ پیدا ہوا تھا کہ آج اس اختلافی مسئلہ میں حضرت شیخ الہند نے ایسی تقریر فرمائی ہے، جس سے مولوی عبید اللہ سندھی کے خیال کی تائید ہوتی ہے، اس اندیشہ کا ازالہ کیا گیا، درانحالیکہ دونوں خیالوں میں فرق تھا، کیونکہ جہانتک خیال آتا ہے، مولوی عبید اللہ صاحب یورپ و امریکہ کے باشندوں کو متعین کر کے دعویٰ کرتے تھے کہ ان کو دینِ حق کی صحیح تبلیغ نہیں ہوئی ہے، اور حضرت شیخ الہند کی تقریر اصولی تھی، شاید اس جلسہ سے اس فرق کو واضح کرنا منظور تھا، بہر حال یہ تو عقلی بات تھی، جو اپنی طالب العلمی کے زمانے میں حضرت شیخ الہند کی طرف سے میرے کانوں میں پہونچی۔

دار العلوم کا مقصد شیخ الہند کا نقطۂ نظر

دوسری بات جسے اسی سلسلہ کی ایک کڑی سمجھنا چاہیئے یعنی مولوی عبید اللہ سندھی اور ارباب مدرسہ کی کشیدگی پھر بھی باقی ہی رہی، اور یہ سلسلہ بھی واضح ہوتا چلا گیا کہ حضرت شیخ الہند اور مولوی عبید اللہ دونوں کا زاویۂ خیال، مدرسہ کے ارباب بست و کشاد سے جدا ہوتا چلا جا رہا ہے، تبلیغ والا مسئلہ تو خیر ایک علمی مسئلہ تھا، درحقیقت ان دونوں صفوں میں ایک حقیقی اختلاف سیاسی طریقۂ عمل کے متعلق تھا، اب پوری بات تو یاد نہ رہی لیکن ایک

Toobaa-elibrary.blogspot.com

دن کچھ ایسا ہوا کہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نایب مہتمم نے فقیر کو یاد فرمایا، اور کہا کہ تم حضرت شیخ الہند سے مل کر دریافت کرو کہ واقعی سیاسیات میں حضرت والا کا صحیح مسلک کیا ہے؟ میں خود حیران ہوں کہ اتنے اہم مسئلہ کے متعلق مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے مجھ جیسے کس مپرس آدمی کا انتخاب کیوں فرمایا لیکن اب کیا کیجیے کہ واقعہ یوں ہی پیش آیا، شاید ظہر کی نماز کے بعد کا واقعہ ہے، مسجد کے احاطہ میں ایک کمرہ تھا جسے اس زمانہ میں دار التصنیف کا نام دیا گیا تھا، اس کمرے میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اپنی زندگی کے آخری مشغلہ یعنی ترجمہ قرآن مجید کا کام کچھ دیر کیا کرتے تھے، فقیر تو اس احاطہ کا باشندہ ہی تھا، نماز کے بعد حضرت اپنی تصنیف و ترجمہ کے اسی کمرے میں تشریف لے گئے، تنہا تھے، موقع پا کر فقیر بھی پیچھے سے حاضر ہو کر عرض رسا ہوا کہ کچھ عرض کرنا ہے، جیسا کہ قاعدہ تھا خندہ جبینی سے فرمایا گیا کہ آؤ، کیا کہنا چاہتے ہو، بیٹھ گیا، اور جو پیغام میرے سپرد کیا گیا تھا، اسے پہونچا دیا، سنتے رہے، اپنی بات جب ختم کر چکا تو دیکھا کہ حضرت پر ایک خاص حال طاری ہے، اور اپنے استاذ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب بانیٔ دار العلوم جن کو وہ حضرۃ الاستاذ کے لفظ سے یاد کرتے تھے انھیں کا نام لے کر فرمایا

"حضرۃ الاستاذ نے اس مدرسہ کو کیا درس و تدریس، تعلیم و تعلم کیلئے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا، جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی ناکامی کے بعد یہ ارادہ کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے، جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے"

چالیس سال پہلے کی بات ہے، روایت باللفظ کی توقع فضول ہے، حضرت والا کی تقریر سے دل میں جو اثر اسوقت قائم ہوا تھا، اسی اثر کے نتائج کی تعبیر اپنے الفاظ میں کر دی گئی ہے۔ تقریر کی مدت کافی تھی لیکن حاصل یہی تھا، آخر میں ارشاد ہوا کہ

"تعلیم و تعلم، درس و تدریس جن کا مقصد اور نصب العین ہے، میں ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہوں، لیکن خود اپنے لئے تو اسی راہ کا میں نے انتخاب کیا ہے، جس کیلئے دار العلوم کا یہ نظام میرے نزدیک حضرۃ الاستاذ نے قائم کیا تھا"

اس کے بعد دو راہیں مختلف ہو گئیں، ایک راہ تعلیم و تعلم اور دینی نشر و اشاعت کی تھی، اور دوسری راہ وہی تھی، جسے بالآخر حضرۃ شیخ الہند نے اختیار فرمایا، اور اسی مسلک کیساتھ اپنے مالک سے جا ملے، خیال آتا ہے کہ حضرت نے یہ بھی فرمایا تھا کہ

"فرائض الٰہیہ جس حد تک بن پڑا، ادا کرتا رہا، اب آخری کام رہ گیا ہے، جسے اپنی حد تک تو میں کر گزروں گا۔"

اور اسی کو وہ کر گزرے، خاکسار نے جو کچھ سنا تھا وہی ان لوگوں تک پہونچا دیا جنھوں نے اپنا پیغام دیکر بھیجا تھا۔

Toobaa-elibrary.blogspot.com

باب ۱۱

حضرت مولانا شبّیر احمد عثمانی علیہ الرّحمۃ

دار العلوم کے اساتذہ میں تیسرے استاذ، جن سے خاکسار کو غیر معمولی استفادہ کے مواقع میسر آئے۔ وہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب کی ذات بابرکات ہے، دار العلوم ہی میں نہیں، بلکہ زندگی میں جن بزرگوں کے تلمذ کا شرف فقیر کو مختلف ادوار حیات میں حاصل ہوتا رہا ہے، ان میں جہاں تک سوچتا ہوں، شاید سب سے زیادہ میرے نوعمر استاد مولانا عثمانی قدس سرہٗ تھے، جس زمانے میں، ان کے حلقہ درس میں شریک ہوا مولانا کی عمر غالباً اس وقت تیس پینتیس[۲۵] کے درمیان تھی، بمشکل مجھ سے آٹھ دس سال عمر میں وہ بڑے ہوں گے، لیکن یہ خدا کی دین تھی کہ اس عمر میں وہ دار العلوم کے صفِ اول کے اساتذہ میں شریک ہو چکے تھے، اور دورۂ حدیث کی اہم ترین کتاب سننِ ابی داؤد کا درس انھیں سے متعلق تھا۔

یوں تو مولانا عثمانی کے نام سے دار العلوم میں حاضر ہونے سے پہلے بھی کچھ نہ کچھ آشنا ہو چکا تھا۔ ٹونک میں بعض طلباء دار العلوم سے ہو کر پہونچتے تھے، ان کے علم و فضل کا ذکر غیر معمولی امتیاز کے ساتھ کرتے تھے۔ اس خصوصیت کے ساتھ کہ دینی علوم کے علاوہ عقلیات میں، انھیں طالب علموں سے معلوم ہوا تھا کہ مولانا غیر معمولی شہرت

حاصل کر رہے ہیں، یہ بھی جانتا تھا کہ باوجود نوعمری کے مدرسہ فتحپوری میں صدر مدرس کے عہدے کے لئے بھی ان کا انتخاب ہوا تھا، اور دلی جیسی مرکزی آبادی میں چند ہی دنوں میں مولانا کی تقریر و تحریر کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔

میری نظر سے القاسم کے بعض شمارے بھی گزرے تھے، جن میں مولانا عثمانی کے بعض مقالات شائع ہوئے تھے، تحریریں ان کا رنگ عام مولویوں سے نیا تھا، شاید ایک حد تک یہ کہنا صحیح ہے کہ دیوبندی حلقے کے علماء میں مولانا شبیر احمد عثمانی پہلے بزرگ تھے جن کی انشاء و تحریر میں عصری تقاضوں کی رعایت پائی جاتی تھی۔

سننِ ابی داؤد کا پہلا درس

بہرحال دار العلوم میں داخل ہونے سے پہلے میرے معلومات مولانا کے متعلق بس انھیں حدود تک محدود تھے، دفتر سے جو اطلاع دورہ کے اسباق کے متعلق شائع ہوئی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ سننِ ابوداؤد پڑھنے کے لئے مولانا شبیر احمد عثمانی کے درس میں حاضر ہونا پڑے گا، وقت ظہر کے بعد کا تھا، طالب علموں کے ساتھ خاکسار بھی، اس حلقے میں جا کر بیٹھ گیا، تو دورہ کے جنوبی حصہ میں دیکھا کہ ایک نوجوان طالب علموں کے درمیان بیٹھا ہوا ہے، یہ یاد نہیں کہ کوئی حدیث ابھی شروع ہوئی تھی یا نہیں کہ ایک طویل تمہیدی خطبہ مولانا نے شروع کیا، ان کے بولنے کا طرز حد سے زیادہ سنجیدہ، خطاب کا طریقہ غیر معمولی طور پر دلآویز تھا۔ چند ہی لمحات میں محسوس ہوا کہ کچھ نئی باتیں کان میں پڑ رہی ہیں۔

قاسمی نظریات و معارف

اس وقت تک سیّدنا الامام الکبیر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی کسی تحریر یا کتاب کے پڑھنے کا موقع مجھے نہیں ملا تھا۔ حضرت مولانا عثمانی نے، جیسا کہ بعد کو پتہ چلا! اپنی خداداد ذکاوت و ذہانت کی مدد سے قاسمی نظریات و معارف کو گویا دینی تفہیم کا ایک مستقل

Toobaa-elibrary.blogspot.com

نظام ہی بنالیا تھا حضرت نانوتوی کے خصوصی افکار کو عصری تعبیروں میں پیش کرنے کی غیر معمولی مہارت ان کو حاصل تھی نئی نئی باتیں درحقیقت وہی تھیں جن کے متعلق مجھے اعتراف کرنا چاہئے کہ حضرت مولانا عثمانی سے پہلے میں نے کسی سے سنی تھیں اور نہ کسی کتاب یا مضمون میں اس کا سراغ ملا تھا۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کے درس کا یہ حصہ میرے لئے حد سے زیادہ دلچسپ اور لذیذ ثابت ہوا، مولانا جس طریقہ سے ان چیزوں کو ادا کرتے تھے، ان میں بڑی حلاوت اور شیرینی ہوتی تھی، جہاں تک خیال آتا ہے۔ حلقۂ درس میں طالب علموں کی تعداد اسّی بیاسی سے متجاوز تھی، ان ہی کے مجمع میں گھسا ہوا گوشہ میں بیٹھ کر مولانا کی باتیں سنا کرتا تھا، یہ باتیں ایسی دل نشیں ہوتی تھیں، اور کچھ ایسے منطقی تسلسل کے ساتھ مولانا ان کو بیان کرتے تھے کہ ان کو نوٹ کرنے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی تھی، وہ فرماتے جاتے تھے، اور حافظہ میں خود بخود ان کی جگہ بنتی جاتی تھی، شاید ایک ہفتہ یا اس سے زیادہ مدت گزری ہوگی۔ یوں ہی طلبہ کے ساتھ مولانا کے حلقۂ درس میں آکر بیٹھا کرتا تھا ذاتی طور پر مولانا سے تعارف کی کوئی صورت پیش نہیں آئی تھی۔

ذاتی تعارف

میرا خیال یہی تھا کہ طلبہ کے اتنے بڑے مجمع میں وجہ ہی کیا ہوسکتی ہے کہ مجھ جیسے ایک کس مپرس طالب علم پر امتیازی نظر مولانا کی پڑے گی، اب میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کی تقریر کی سماعت میں غیر معمولی انہماک نے ان کو متنبہ کیا، یا ممکن ہے درس میں ایک دو بات استفادۃً خاکسار نے جو دریافت کی تھی، اس کا نتیجہ تھا، بہر حال اسباب سے آج تک ناواقف ہوں لیکن اسی عرصہ میں ایک دن یہ واقعۂ عجیب پیش آیا۔

ہمارے دوست مولوی احسان اللہ تاجور مرحوم، جو بعد میں، اردو زبان کے ممتاز شعراء میں شمار کئے گئے، شمس العلماء کے خطاب سے بھی حکومت نے سرفراز کیا تھا، یہ بھی اسی زمانے میں دار العلوم میں تھے۔ ان کا دورہ ختم ہو چکا تھا، گویا فارغ التحصیل ہو

چکے تھے، اور آئندہ مستقبل کا پروگرام بنا رہے تھے، شعر و شاعری کا ذوق طالب علمی ہی سے رکھتے تھے، طالب علموں میں ان کے اشعار کا اچھا خاصا چرچا اسی زمانے میں پھیلا ہوا تھا، ادبی ذوق کے اشتراک کی وجہ سے مجھ میں اور ان میں مراسم ابتدا ہی سے قائم ہوگئے تھے۔

بہر حال یہی بیچارے تاجور مرحوم ایک دن میرے پاس آئے اور بولے کہ آج میں مولانا شبیر احمد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، مولانا نے مجھ سے کہا ہے کہ دورہ کے طالب علموں میں مناظر احسن نامی جو طالب العلم ہیں۔ ان تک تم میرا پیغام پہنچا دو کہ میں ان سے ذاتی طور پر ملنا چاہتا ہوں، تاجور مرحوم سے یہ میں سنتا جاتا تھا، اور حیران تھا کہ اس سے زیادہ کہ طالب علموں کے رجسٹر حاضری میں فقیر کا بھی نام تھا، اور حاضری کے وقت دوسروں کے ساتھ میرا نام بھی پکارا جاتا تھا، کسی قسم کا کوئی تعارف مولانا سے میرا نہیں ہے، پھر انھوں نے اپنی خصوصیت کے ساتھ خاکسار کو کیوں یاد فرمایا ہے، غالباً مغرب کا وقت تھا، رات ہو چلی تھی، صبح کا منتظر رہا

درِ دولت پر حاضری

دوسرے دن تاجور مرحوم سے مولانا کے درِ دولت کا پتہ دریافت کرکے، غالباً کسی ملنے والے طالب علم کی رہنمائی میں خدمت والا میں حاضر ہوا، مولانا کو دیکھا کہ متبسم ہیں، سلام کرکے بیٹھ گیا، خود ہی فرمانے لگے کہ دورہ کے سبق میں تم بھی آتے ہو، اگرچہ زیادہ دن نہیں گزرے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کسی سے آدمی کو محبت ہو تو اس کو مطلع کردے، میں نے اسی لئے آپ کو طلب کیا تھا، تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کے مطابق آپ کو مطلع کردوں، اپنے دل میں آپ کی محبت پاتا ہوں۔

اپنی ہیچ میرزی، کس مپرسی، جہل و نادانی کو دیکھتے ہوئے مولانا غفر اللہ لہٗ کی زبان مبارک سے یہ باتیں سنتا جاتا تھا، اور بے ساختہ آنکھوں سے آنسو ابلے آتے تھے، کچھ نا

Toobaa-elibrary.blogspot.com

مبہوت تھا کہ جواب میں شاید کچھ عرض نہ کر سکا، شاید عدم حاضری کی تقصیر کی معافی چاہی گئی، کچھ دیر بیٹھ کر مدرسہ واپس چلا آیا۔

مولانا شبیر احمد عثمانی کی زندگی میں انقلاب

اب مولانا سے براہ راست ذاتی واقفیت پیدا ہو چکی تھی، درس انکا جاری تھا، درس کیا تھا۔ ان کے خطبات تھے، جن کا سلسلہ شاید ایک مہینہ کے قریب جاری رہا، اصل کتاب کی چند ہی حدیثیں پڑھی گئی ہوں گی کہ اچانک حضرت کی زندگی میں ایک نیا انقلاب شروع ہوا

ہوا یہ کہ مولانا کا یہ درس جاری تھا، خاکسار بھی کبھی کبھی در دولت پر حاضر ہوجاتا تھا، میرے ساتھ بہار ہی کے ایک اولے طالب علم مولانا نور الہدیٰ در بھنگہ ضلع کے رہنے والے تھے، انھوں نے کانپور کے مدرسۃ الٰہیات میں بھی کچھ تعلیم حاصل کی تھی، جہاں تقریر و تحریر کی مشق کا ان کو بھی موقع ملا تھا، اور اردو ادب کا اچھا مذاق رکھتے تھے، عمر بھی کافی تھی، دار العلوم میں حدیث کی تکمیل کے لئے آئے تھے، وطنی اور مذاقی وحدت کی وجہ سے ہم دونوں میں خصوصی تعلقات قائم ہو گئے تھے، مولانا عثمانی کی خدمت میں ہم دونوں عموماً ساتھ ہی حاضر ہوا کرتے تھے۔ اب پورے طور پر یہ یاد نہیں رہا کہ ہم دونوں کو بلا کر مولانا نے کیا فرمایا، یا یہ واقعہ بعد کا ہے، بہرحال مولانا کے درس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ سلسلہ اس کا بیچ بیچ میں زیادہ تر ناسازی طبع کی وجہ سے ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا، مہینہ میں ایک دو دن کا ناغہ اس زمانے میں ایک عام بات تھی، اسی عرصہ میں یہ صورت پیش آئی کہ ناغہ کا سلسلہ کچھ دراز ہو گیا، مولانا کی صحت اچھی نہیں رہتی تھی عیادت کے لئے ہم دونوں جو پہنچے، تو گو کچھ کچھ جسمانی شکایت کے آثار بھی پائے جاتے تھے لیکن ہم دونوں کو دیکھ کر اٹھ بیٹھے، اور عجیب و غریب تقریر کی جس کی پہلے سے قطعاً توقع نہ تھی۔

بجنسہٖ الفاظ کا نقل کرنا تو ناممکن ہے، لیکن خلاصہ یہی تھا کہ تعلیم کے موجودہ طریقہ پر شدید تنقید کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ یہ کیا طریقہ ہے، پست و بلند، اکس و ناکس ہر قسم کے طالب علموں کو درس کے حلقہ میں شرکت کی اجازت دے دیجاتی ہے، عمومیت اور اکثریت آج کل کے طلبہ کی ایسی ہے، جو صحیح معنوں میں درس فیصد بھی اپنے اساتذہ کی تقریروں سے مستفید ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہے، بہت دنوں سے اس صورت حال پر غور کر رہا ہوں، اب تو بات میرے تحمل اور برداشت سے باہر ہو چکی ہے اور میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس بھیڑ یا دھسان والے حلقۂ درس سے اپنے تعلق کو منقطع کر لوں، اور صرف چند خاص طالب علموں کو پڑھانے کیلئے انتخاب کروں، کچھ ایسے لب و لہجہ میں مولانا تقریر کر رہے تھے، جس سے یہی سمجھ میں آیا کہ شاید وہ مدرسہ سے ملازمت کے رشتہ کو منقطع کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں، میں حیران تھا کہ آخر یہ کیا فرما رہے ہیں؟ چپ چاپ جو کچھ کہتے رہے سنتا رہا، آخر میں جب ہم دونوں اٹھنے لگے، تو یہ فرماتے ہوئے کہ میں نے پورے حلقۂ درس میں صرف دو طالب علموں کا انتخاب کیا ہے، ایک یہی فقیر اور دوسرے مولوی نور الہدیٰ، ہم دونوں کو حکم دیا گیا کہ کل سے کتاب لیکر تم دونوں میرے گھر آجایا کرو، میرے لئے ان سینکڑوں طلبہ میں صرف یہی دو طالب العلم کافی ہیں۔

اسی سلسلہ میں حضرت نانوتوی سیدنا الامام الکبیر کے اس تعلیمی نظریہ کا بھی مولانا نے ذکر کیا تھا کہ علم کی اشاعت کی دو مستقل شکلیں ہیں، ایک کمّاً دوسری کیفاً، کمّاً یعنی اہل علم کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں پھیلانے کی صورت یہی جو مدرسوں میں اختیار کیجاتی ہے۔ لیکن علم کی کیفیت میں اگر ترقی مقصود ہو تو بجائے جماعتی تعلیم کے چند خاص طالب علموں کو پڑھانا چاہیئے، اور شخصی طور پر ان کی تربیت و پرداخت میں کوشش کی جائے، فرماتے کہ حضرت نانوتوی نے اسی اصول کے تحت خود مدرسہ میں کبھی نہیں پڑھایا بلکہ اپنے لئے چند طلبہ کو انتخاب کر لیا تھا، انھیں کو آپ نے اپنا طالب علم بنا رکھا تھا، جن میں حضرت شیخ الہند، مولانا احمد حسن امروہی اور مولانا فخر الحسن گنگوہی وغیرہم حضرات تھے۔

Toobaa-elibrary.blogspot.com

مشکلات میں غیبی امداد

الغرض تدریسی زندگی میں ایک نیا انقلابی دور تھا، جس کا آغاز بدقسمتی سے اسی زمانے میں ہوا، جب یہ فقیر دورہ میں شریک ہوا، اور حضرت والا کے زیر تعلیم تھا، بدقسمتی سے اس لئے کہہ رہا ہوں کہ آگے یہ قصہ بڑھا، اور بہت زیادہ بڑھا، مولانا نے باضابطہ مدرسہ میں استعفا داخل کردیا، انکے بڑے بھائی مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی طرف سے جو نائب مہتمم تھے، بہت کچھ فہمائش کی کوششیں کی گئیں، خود بھی کی، دوسروں سے بھی کوشش کرائی، لیکن جو فیصلہ مولانا کر چکے تھے، اسی پر ڈٹے اور جمے رہے

ہم لوگوں کے لئے مشکل یہ ہوئی کہ مولانا کے حکم کی تعمیل سے گریز بھی مشکل تھا، انکے ارشاد کے مطابق کتاب لیکر مکان پر حاضر ہوتے رہے لیکن شاید چند اسباق سے زیادہ انفرادی درس کا یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا، مدرسہ کیطرف سے ابو داؤد کا درس حضرت مولانا میاں سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد کردیا گیا تھا، ہم بھی اسی درس میں جاکر شریک ہوگئے، اور یوں ہماری یہ کتاب ختم ہوئی، ورنہ ابو داؤد میں یہاں تک خطرہ پیش آگیا تھا کہ ہمارا دورہ نامکمل ہی رہ جاتا۔

مولانا کے معاش کا واحد ذریعہ وہی مدرسہ کی تنخواہ تھی۔ اس سے دست بردار ہونے کے بعد اب کیا بتایا جائے کہ کیا صورت پیش آئی، مولانا صاحب اولاد تو نہ تھے، لیکن بہرحال گھر میں ان کی بیوی صاحبہ تھیں، خانہ داری کا نظم ان کے لئے سخت دشوار ہوگیا، لیکن تاہم مولانا یہی طے کئے ہوئے تھے کہ مدرسہ کی جس ملازمت کو چھوڑ چکا ہوں، پھر اس کو اختیار نہیں کروں گا، اور جب تک دار العلوم میں فقیر کا قیام رہا، مدرسہ کی ملازمت کے تعلق سے وہ آزاد ہی رہے۔ یہ زمانہ مولانا پر بڑی آزمائش کا تھا، تاہم کسی نہ کسی طرح وقت گزرتا ہی رہا، ضرورتیں پوری ہوتی ہی رہیں، ان کی سوانح عمری میں چاہیے تو یہی تھا کہ زندگی کی اس خاص منزل کے حالات جاننے والوں سے دریافت کرکے درج کئے جاتے،

آپ کی زوجۂ محترمہ[۱] مدظلہا سے مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی[۲] اور مولانا عماد الدین صاحب[۳] انصاری، جن سے اس زمانے میں مولانا کے گہرے دوستانہ تعلقات قائم تھے، وہی بتا سکتے ہیں کہ کن کن شکلوں میں غیبی امداد آپ کے سامنے آئی۔

فتح الملہم کی ابتداء

اسی زمانہ میں مولانا کے قلب مبارک میں صحیح مسلم شریف کی شرح کا خیال پیدا ہوا، ابتدائی کام شروع بھی کردیا تھا، تھوڑی بہت خدمت فقیر کو بھی اس سلسلے میں انجام دینی پڑی تھی۔

قصہ مختصر۔ جو کچھ ہو، مولانا عثمانی سے اس میں شک نہیں کہ کتابی تلمذ کی نوعیت اگرچہ سنن ابی داؤد کے چند ابتدائی اوراق ہی تک محدود رہی، لیکن حکمت قاسمی سے صرف روشناس ہی ہونے کا موقع مولانا کے ذریعے نہیں ملا۔ بلکہ کہہ سکتا ہوں کہ باضابطہ علم کے اس خاص شعبے کی تعلیم مولانا ہی سے اس فقیر کو میسر آئی۔ اس باب میں میرے بلاشرکت غیرے واحد معلم اور استاذ ہیں۔ نور اللہ ضریحہ وجعل الجنۃ مثواہ، دار العلوم کے احاطہ سے باہر حیدرآباد وغیرہ میں مولانا سے تعلقات قائم رہے، لیکن مضمون چونکہ دار العلوم کی حد تک محدود ہے، اس لئے خارج از دار العلوم کی سرگزشتوں کے ذکر کا یہاں موقع نہیں ہے۔

دار العلوم کا ہر تنکا پیام اصلاح تھا

واقعہ یہ ہے کہ مستفید ہونے کی حد تک یوں تو اس کج راد کج فہم کے لئے دار العلوم کا تنکا تنکا اصلاح و ترمیم کا پیغام بنا ہوا تھا، اللہ اللہ دار العلوم کی مقدس و پاک مسجد کی لمبی لمبی صفوں کی وہ نمازیں جن میں خدا ہی جانتا ہے کہ اللہ کے کیسے کیسے راست باز، مخلص، وفادار بندے شریک تھے۔

(۱-۲-۳) تینوں حضرات جوارِ رحمت میں پہونچ چکے ہیں۔

Toobaa-elibrary.blogspot.com

زمین پر وہ نہ پہچانے جاتے ہوں، پھٹے پرانے کپڑے، بال الجھے ہوئے، ان سے باتیں کیجئے تو وہ فقرے بھی بیچارے صحیح طور پر ادا کرنے کی قدرت نہ رکھتے تھے، لیکن میرے تجربات و مشاہدات مجھ پر ثابت کرتے چلے تھے کہ اللہ کے پیغمبر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شاید انھیں جیسوں کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ رب اشعث اغبر مدفوع بالابواب لواقسم علی اللہ لابرہٗ (او کما قال) چہروں پر گرد پڑی ہوئی، بال بکھرے ہوئے، انھیں دروازوں پر دھکے دیئے جانے والوں میں ایسے نفوس بھی ہیں کہ خدا کی قسم کھا کر کوئی بات کہدیں، تو حق تعالیٰ ان کی قسم پوری فرماتا ہے گلیوں اور بازاروں میں جب نکلتے تو ان پر انگلیاں نہیں اٹھتی تھیں، لیکن ان کا حال ہی ایسا تھا کہ زمین والے نہ بہی مگر سے

حوریاں رقص کناں نعرۂ مستانہ زدند

کا منظر آسمانوں پر اگر قائم ہو جاتا ہو تو اس پر متعجب نہ ہونا چاہیئے، اپنے درس کے ان رفقاء کا اب بھی جب خیال آجاتا ہے تو آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا اٹھتی ہیں، کچھ نہیں معلوم کہ وہ کہاں گئے اور کہاں رہے، لیکن آج بھی مل جائیں تو جی چاہتا ہے کہ دیر تک ان کے قدموں کو چومتا رہوں، ان کے پاک قدموں کی خاک کو سر پر ملوں، آنکھوں میں اس کا سرمہ لگاؤں، الغرض دارالعلوم کا سارا ماحول میرا معلّم اور استاذ بنا ہوا تھا۔

مولی حجّام

اور تو اور اسی زمانے میں ایک بوڑھا نائی تھا جو اپنے کند استرے سے غریب طلبا کے نازک بالوں پر ظلم توڑا کرتا تھا، اس کا اصل نام کیا تھا۔ اس کا تو علم نہ ہو سکا لیکن عام طور پر مولی بروزن چولی کے عرفی نام سے پکارا جاتا تھا، یہ مولی حجام، حجامت اور اصلاح سازی کے کام سے زیادہ مدرسہ کے طلبہ کی باسی بچی کھچی روٹیوں کی حجامت سے تعلق رکھتا تھا، صبح ہوئی اور میاں مولی ہر کمرے کے سامنے کھڑے ہو کر پکار رہے ہیں "میاں رات کی کچھ دھری پڑی رہ گئی ہوں تو وہ روٹیاں دے دینا" دینے والے دیا کرتے تھے، خدا جانے یہ واقعہ تھا بھی یا نہیں، لیکن مشہور یہی تھا کہ میاں

مولی دارالعلوم جیسے دینی ادارے سے تعلق رکھنے کے باوجود نماز سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، عمر ستر سے بظاہر متجاوز رہی ہوگی، قدرۃً طلبہ نے یہ شغلہ بنا لیا تھا کہ جہاں بچی کھچی رات کی باسی روٹیوں کے لئے میاں مولی نے کسی حجرے میں منہ ڈال کر اپنی سفید طویل و عریض داڑھی ہلانی شروع کی کہ ہر طرف سے بآواز بلند ہوتی، مولی تم نماز نہیں پڑھتے؟ اس سوال کا جواب جب تک مولی غریب سے حاصل نہ کر لیا جاتا، لوگ اس بیچارے کو روٹی نہ دیتے، لیکن اس اعتراض کا بھلا مولی حجام بھلا کیا جواب دے سکتا، مگر پھر بھی رہا تھا مولویوں ہی میں، جواب میں یہ ترکیب اس نے نکالی تھی کہ پوچھا جا رہا ہے اس سے کہ نماز کیوں نہیں پڑھتا، تو جواب میں کہتا کہ آموں میں ابھی بور کہاں آئے ہیں، طالب علم کہتے کہ بھئی تو نماز کیوں نہیں پڑھتا، اس کے جواب میں کہتا کہ برسات کے آنے میں کچھ وقفہ ہے، بازاروں میں سنگھاڑے آ گئے، ناشپاتیاں بکنے لگیں، الغرض سوال سے جن باتوں کا کسی قسم کا کوئی تعلق نہ ہوتا، مسلسل یکے بعد دیگرے ان ہی جوابوں کو پیش کرتا چلا جاتا، اور اتنی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ پیش کرتا کہ لب پر مجال کیا کہ ہلکی سی مسکراہٹ بھی آ جائے، لوگ اس کے اس بے جوڑ انمل جوابوں سے تنگ آنے کے بعد روٹی کے خشک ٹکڑے جو کہیں پڑے دھرے ہوتے اس کے حوالے کر دیتے۔

جملۂ مولیہ

ہم لوگوں کے حلقے میں مولی حجام کے اس خاص طریقۂ جواب کی بنیاد پر ایک خاص علمی اصطلاح ہی مروج ہو گئی تھی، بحث و مباحثہ میں جہاں کسی کی طرف سے کوئی ایسا جواب پیش ہوا، جس کا سوال سے زیادہ تعلق نہ ہوتا تو کہدیا جاتا کہ آپ "جملہ مولیہ" استعمال فرما رہے ہیں۔ گویا اصطلاح ہی مقرر ہو گئی تھی کہ وہ جواب جس کا سوال سے چنداں تعلق نظر نہ آئے، جملوں اور فقروں کی دنیا میں وہ "جملہ مولیہ" یا "فقرۂ مولیہ" بن جاتا۔ نو وارد طلبہ اس جملہ مولیہ کا مطلب پوچھتے کہ یہ کیا بلا ہے، جملوں کے اقسام میں اس خاص قسم یعنی جملہ مولیہ کا ذکر تو کسی نے آج تک نہیں کیا، تب کہا جاتا کہ ٹھہر جائیے مولی حجام آپ کو اس کا جواب دیگا، وہ آتا حسب دستور نماز کیوں نہیں پڑھتے؟

Toobaa-elibrary.blogspot.com

کے جواب میں آسمان وزمین کی سنانے لگتا، اور مولی حجام کے آنے تک انتظار کی زحمت جو برداشت کرنے پر آمادہ نہ ہوتے، تو ان کو سمجھا دیا جاتا کہ چاول سفید ہوتے ہیں اس لئے سمجھنا چاہیئے کہ دنیا گول ہے۔ جیسے دلیل اور دعویٰ کی اس ترتیب میں کوئی ربط نہیں اسی طرح ہر غیر مربوط کلام اور فقرے کا نام جملہ مولیہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جملہ مولیہ کی اس اصطلاح کی بدولت بعض اوقات طول طویل تقریروں کی زحمت سے ہم لوگ بچ جایا کرتے تھے کہ یہ تو جملہ مولیہ ہوا۔ لمبی باتوں کی جگہ صرف اتنا کہنا کافی ہوجاتا تھا، اصطلاح کے جاننے والے فوراً متنبہ ہوجاتے، اور کلام میں ترتیب پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔

ظاہر ہے کہ دارالعلوم کے اس تعلیمی ادارے میں پہونچکر مولی حجام تک کا وجود جب معلمی کا فرض انجام دیتا تھا، اور کیسی معلمی؟ کہ آج بھی جملہ مولیہ یا فقرہ مولیہ کی جگہ چاہتا ہوں کہ کوئی ایسی اصطلاح ہاتھ آجائے، جس سے وہی کام لیا جاسکتا ہو، جو جملہ مولیہ سے دارالعلوم کے احاطہ میں لیا جاتا تھا، کم از کم میری سمجھ میں تو ایسی اصطلاح ابتک نہیں آئی ہے اپنے مخاطب کو جس آسانی کے ساتھ اپنا مطلب جملہ مولیہ کہہ کر سمجھا لیا جاتا تھا، شاید اتنی سہولت کے ساتھ اس منشا کو کسی دوسرے لفظ سے ہم آج بھی سمجھانے پر قادر نہیں ہیں، گویا یوں سمجھنا چاہیئے کہ ہماری تعلیمی زندگی بنا دارالعلوم کے حجام میاں مولی کا بھی ساتھ تھا۔ فقیر بعد کو جب کبھی کسی ضرورت سے دارالعلوم حاضر ہوتا تو میاں مولی کو ضرور تلاش کرتا، لیکن بیچارے کا وقت ہم لوگوں کے بعد جلد پورا ہوگیا۔ اللّٰھم اغفر لہ وارحمہ

۱۲ ب

دوسرے اساتذہ اور دارالعلوم کا ماحول

اسی سلسلہ میں فقیر کا یہ بھی واقعہ ہے کہ دارالعلوم کے مطبخ کے سابق داروغۂ مطبخ مولوی گل محمد صاحب مرحوم منگلوری (۱) سے خارج از مدرسہ چند دوسرے طلباء کے ساتھ علم (؟)

---

(۱) مطبخ کی داروغگی مدرسہ کا ایک ایسا عہدہ ہے کہ جو بھی جس زمانے میں اس عہدے پر بحال ہوا اکی طرف سے کچھ نہ کچھ کدورت وگرانی طلبہ کے قلوب میں پیدا ہو ہی جاتی ہے۔ باورچی خانوں کے کھانے کی یکرنگی گونہ ملال کی کیفیت لوگوں میں پیدا کرتی ہے۔ دلوں کی یہی ملالی کیفیت غریب داروغہ کی طرف سے غم وغصہ کی شکل اختیار کرلیتی ہے، بے چارے مولوی گل محمد (خدا ان کی مغفرت فرمائے) جہاں تک میرا خیال ہے امانت ودیانت میں ایک مثالی آدمی تھے لیکن طلبہ کے رنج وغم کا نشانہ وہ بھی کبھی کبھی بن جاتے تھے اپنا سجع انھوں نے غالباً ؎

ع باغ عالم کا گل محمد خاں

بنا رکھا تھا لیکن طلبہ میں ان کا یہی سجع ؎ زاغ مطبخ کا گل محمد خاں۔ کی شکل میں مسخ ہو کر مشہور ہوگیا ہوگیا تھا، مولوی صاحب سیاہ چہرہ سانولے رنگ کے چونکہ تھے، اس لئے زاغ کا لطیفہ (باقی اگلے صفحہ پر)

Toobaa-elibrary.blogspot.com

کی کتاب سراجی پڑھی تھی۔ نیز ہدایہ اخیرین حکیم محمد حسن صاحب سے پڑھی جو حضرت شیخ الہند کے بھائی تھے، مدرسہ کے طبیب تھے، شکار کا خاص ذوق رکھتے تھے۔ علم کا طالب ہی بن کر جب دار العلوم کے احاطہ میں شریک ہوا تھا، تو جس سے بھی سیکھنے سکھانے کا موقع جس شکل میں مل سکتا تھا قدرۃً اس سے مستفید ہوتا رہا۔

اس سلسلے میں مولانا غلام رسول مرحوم استاد معقولات، اور حضرت میاں اصغر حسین صاحب نور اللہ مرقدہ اور گو کہتے ہوئے شرم ہی نہیں بلکہ قلب کی ندامت شاید کبھی ختم نہیں ہوسکتی۔ واقعہ یہ ہے کہ جن جن اساتذہ سے دورہ کی کتابوں کے پڑھنے کا حلم مدرسہ کی طرف سے دیا گیا تھا۔ اس میں وقت کے خدا رسیدہ بزرگ عارف باللہ مفتی عزیز الرحمٰن صاحب قدس سرہ العزیز مفتی اعظم دار العلوم بھی تھے، لیکن اسے اپنی ایسی بدقسمتی یقین کرتا ہوں جس کی تلافی نہیں ہوسکتی کہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے جیسا چاہیئے فائدہ حاصل کرنے سے قاصر رہا، ہم سے پیش رو طلبہ میں کچھ اس قسم کی باتیں مشہور تھیں کہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی حد سے گزری ہوئی بے نفسی اور نیکی کی وجہ سے، حدیث پڑھاتے ہوئے، ان روایتوں کے متعلق جو امام ابو حنیفہ کے مسلک کے بظاہر مخالف نظر آتی ہیں، ان ہی کے جواب میں ان تین جوابوں میں سے کوئی ایک جواب دیدیا کرتے ہیں یعنی (۱) اس روایت کی کوئی ناسخ روایت ہوگی، (۲) یا اس کی تخصیص کرلی جائے گی (۳) یا حنفی فقہاء نے کچھ نہ کچھ اس کا جواب دیا گیا ہوگا، ظاہر ہے کہ یہ سن لینے کے بعد مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ان پر کچھ چپاں سا ہوگیا تھا۔ ان کی غیبت کو خدا جانے طلبہ نے کس فتویٰ کی رو سے جائز قرار دے رکھا تھا۔ شاید اپنی مظلومیت کو عذر میں پیش کرتے۔ اپنی بدبختی تھی کہ طلبہ کے اس عام وبائی عارضہ سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکا۔ شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ دینی علوم میں فرائض کے اس علم سے مناسبت پیدا نہ ہوسکی، استاد کے احترام میں لاپرواہی۔ اسی جرم کی سزا اپنے اس عدم مناسبت کو سمجھتا ہوں۔

حدیث کی اس کتاب کے پڑھنے کا ذوق مجھ جیسے وسواسی طلب کے لئے کیا باقی رہ سکتا تھا۔ غالباً موطا امام محمد اور موطا امام مالک کے درس کا تعلق مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تھا۔ ہفتہ میں ایک دن بطور دورے کے ان کتابوں کا سبق ہوتا تھا، یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ان کے درس میں حاضری کی سعادت سے کلیۃً محروم رہا، لیکن جس قسم کے فوائد انکے انفاسِ طیبہ سے حاصل ہوسکتے تھے عمر بھر اس کا افسوس رہے گا کہ اس کی طرف توجہ کیوں نہیں ہوئی۔

اسی طرح مولوی غلام رسول صاحب کے نام غالباً سنن ابن ماجہ کا سبق تھا، عموماً مشہور تھا کہ مولوی صاحب موصوف بڑے معقولی آدمی ہیں۔ اسی شہرت کی وجہ سے انکے اسباق میں حاضری کے مواقع کم ہی میسر آتے تھے۔ خیال بھی گزر رہا تھا کہ روایتیں تو ان ساری کتابوں میں عموماً مشترک ہیں، حضرت شاہ صاحب اور مولانا شیخ الہند رحمہما اللہ کے درسی حلقوں کے معلومات حدیث کی ان ساری کتابوں کے لئے کافی ہیں۔ اور یہ خیال بجائے چنداں بے بنیاد تھا بھی نہیں۔ اگرچہ اپنی کوتاہیوں کا کچھ خمیازہ بھگتنا بھی پڑا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ سالانہ امتحان میں ابن ماجہ کا پرچہ جب سامنے آیا تو اس میں بعض ایسی باتیں پوچھی گئی تھیں، جن کا اسی کتاب سے خصوصی تعلق تھا، جواب دینے کے لئے تو جواب دیدیا گیا، لیکن دوسری کتابوں کے بالمقابل کم نمبر اس کتاب میں مجھے ملے۔ مولانا غلام رسول صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض رسا ہوا کہ حضرت اس پرچہ میں تو کچھ نئی باتیں تھیں، اسوقت کچھ برہم ہوکر فرمانے لگے کہ اور سبق سے غائب رہا کرو گویا طلبہ کی حاضری کا اوسط ان کے درس میں حد سے زیادہ جو کم ہوا کرتا تھا، اس کی طرف سے معلوم ہوا کہ دل میں ان کے کچھ گرانی ہے، معافی کا طالب ہوا۔ خیال یہی ہے کہ پھر فقیر سے راضی ہوگئے تھے۔

بہرحال یوں استاد ہونے کی حیثیت سے دار العلوم کے ان سارے اساتذہ کیساتھ تلمذ کی نسبت اس فقیر کو حاصل ہے، لیکن سچی بات یہی ہے کہ حضرت کشمیری، مولانا شیخ الہند

Toobaa-elibrary.blogspot.com

مولانا شبیر احمد عثمانی نور اللہ تعالیٰ قبورہم سے تمتع کے جو مواقع میسر آئے دوسرے اساتذہ کے متعلق دعویٰ نہیں کرسکتا۔

حضرت مولانا میاں سید اصغر حسین صاحب طابَ ثراہُ

جیسا کہ عرض کرچکا ہوں کہ مولانا شبیر احمد صاحب مرحوم اسی سال جو ہمارے دورے کا سال تھا۔ مدرسہ کی تدریسی خدمت سے دست کش ہوکر گھر بیٹھ گئے، چند دنوں تک ان کے گھر پہنچ کر، فقیر اور مولانا نور الہدیٰ صاحب دربھنگوی ابوداؤد پڑھتے رہے۔ لیکن مولانا پر جو حال طاری تھا، اس نے زیادہ دنوں تک اس سلسلہ کو بھی باقی نہ رکھا، مدرسہ کی طرف سے ان کی کتاب سنن ابی داؤد کا سبق میاں سید اصغر حسین صاحب نور اللہ ضریحہ کے سپرد کردیا گیا تھا۔ ہم انھیں کے حلقہ میں شریک ہوگئے، سید صاحب یوں بھی خاموش آدمی تھے۔ ان کی یہی فطری خاموشی درس کے حلقے میں بھی نمایاں رہتی، لیکن اسی کے ساتھ میں کہہ سکتا ہوں کہ مہر سکوت کے توڑنے کی جہاں جہاں واقعی ضرورت ہوتی، طویل تقریر تو اسوقت بھی نہیں کرتے تھے، لیکن چند ہی فقروں میں جو کچھ بھی کہہ دیتے تھے، اصل مسئلہ کے لحاظ سے شاید انھیں چند فقروں میں سب کچھ آجاتا تھا۔

حقّہ ہی پر لکھ دیجیے

ان کی شخصیت میں دوسرے پہلوؤں کے ساتھ باایں ہمہ وقار و تمکنت، ظرافت و طیبت کا عنصر بھی کچھ ایسے اعتدالی رنگ میں شریک تھا کہ جب کبھی حلقۂ درس میں طلبہ کو خاص نظر کے ساتھ دیکھتے ہوئے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ اس سلسلہ میں کچھ فرمادیا کرتے تو قلوب انبساط و جذبات سے بھر جاتے، ان کی تحریروں میں ان کی طبیعت کا یہ رنگ بیساختہ کبھی کبھی جھلکنے لگتا ہے، ایک دفعہ کی بات یاد آتی ہے یہ اس زمانہ کی بات ہے جب دارالعلوم کے مجلات القاسم، الرشید میں فقیر مضامین لکھنے لگا تھا، ان رسالوں سے

میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بھی گونہ تعلق تھا، کسی موقع پر حاضر ہوکر عرض کرنے لگا حضرت تنہا دو دو پرچوں میں کب تک لکھتا رہوں، دوسرے اساتذہ قطعاً کسی قسم کی مدد نہیں کرتے، تو گردن جھکا زیرلب تبسم کے ساتھ فرمانے لگے، مولوی صاحب! آپ کا کیا ہے؟ آپ کے لئے بھلا مضمون کی کیا کمی ہو، کسی ہر حقہ ہی پر لکھ دیجئے۔ کوئی چیز جو سامنے پڑی ہو، اسی پر مضمون تیار کرلیجئے ______ میں بھی ہنس کر چپ ہوگیا اور کیا جواب دیتا۔

حضرت میاں صاحب کا کرم

دوسری طرف انکی سیادت و شرافت کے بعض تجربات میرے لئے عجیب تھے، اپنے دفتر سے ایک دن واپس ہوتے ہوئے اس حجرے کیطرف تشریف لائے، جس میں فقیر رہا کرتا تھا، نظر پڑتے ہی باہر نکل آیا حضرت کیا ہے؟ حجرے کے چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے فرمانے لگے مولوی جی! تم سوتے کس چیز پر ہو، جو واقعہ تھا عرض کردیا گیا کہ میرے ساتھ کچھ طلبہ بھی رہتے ہیں، چٹائیوں پر جب وہ سوتے ہیں اسی طرح ایک چٹائی پر فقیر بھی اپنا بستر لگا دیا کرتا ہے، بولے نہیں، اب آپ طالب علم نہیں ہیں، اتنا فرمایا اور چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتا ہوں کہ ایک اچھا خاصا پلنگ لئے ایک شخص میرے حجرے کے سامنے کھڑا ہے، اور نام لے کر یہ کہہ رہا ہے کہ میاں صاحب نے یہ پلنگ تمہارے لئے بھیجا ہے، ایک غریب الوطن کس مپرسی کیلئے میاں صاحب مرحوم کی نوازش خاص جس اثر کو پیدا کرسکتی تھی وہی اثر پیدا ہوا اور مجبوراً ان کے اس تحفے کو قبول کرنا پڑا، حالانکہ فقیر میاں صاحب کی مجلس کے خاص حاضرباشوں میں نہ تھا، مہینوں اور ہفتوں میں کبھی کبھی حاضری کا موقع ان کی مجلس مبارک میں مل جاتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اپنے ان اساتذہ سے علمی منافع کے ساتھ اثر پذیر قلوب کو انکی عملی زندگی سے مسلسل جو درس ملتا رہتا تھا، شاید اس کی قیمت کتابی علوم کے تبصروں سے بھی زیادہ اور بہت زیادہ تھی، اللہ اللہ یہی میاں صاحب مرحوم ہیں، ان کے دولتخانے پر پہونچ کر جب دیکھتا ہوں کہ مٹی کے ایک چبوترے پر بوریئے کا مصلیٰ (جانماز) پڑا ہوا

Toobaa-elibrary.blogspot.com

ہے، سامنے مٹی کا ایک لوٹا ہے، اس ساز و سامان کے سوا بان کی بنی ہوئی ان چند چارپائیوں کے سوا اور کچھ نہ ہوتا جن پر آنیوالے بیٹھتے۔

حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ

آخرت کے مسافر دل کی زندگی، مجبوری دنیا میں کس طرح گزرتی ہے، یا اسے گزارنی چاہئے یقین جانئے کہ اسکا نقشہ آنکھوں میں اب بھی تر و تازہ ہو جاتا ہے۔ دارالعلوم کے وہی مفتی اعظم جن کے تفقہ و تدین اور تصوف و تالہ کے چرچوں سے ہندوستان گونج رہا تھا، دیکھنے والے انہی کو اس حال میں دیکھتے کہ عصر کے بعد بازار سے سودا سلف کی بھری گٹھری بغل میں دبائے چلے جا رہے ہیں، معلوم ہوتا کہ اپنے گھر کی ضرورت کے سوا محلے ٹولے کی بیواؤں، بڑی بوڑھیوں کی فرمائشوں کا بڑا حصہ اس گٹھری میں بھرا ہوا ہے، اس میں پالک کا ساگ بھی ہے، اس میں شلجم بھی ہے، پیاز بھی ہے، لہسن بھی ہے، ادرک دھنیا، کوتیر، پودینہ، الغرض روزمرہ یہی دستور رہا یہی وہ سبق تھا، جو دارالعلوم کے احاطہ میں رہنے والے طلبہ کو دارالعلوم کے اس احاطے کے باہر بھی ملا کرتا تھا، اپنے اپنے ظرف کے مطابق جس کے لئے جتنا مقدر تھا اتنا حصہ حاصل کیا کرتا تھا۔

درس کا صحیح طریقہ

مان بھی لیا جائے، جیسا کہ مشہور کرنیوالوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ تین مقررہ جوابوں میں تعین کوئی ناسخ ہو گا، تخصیص کر لی جائے گی، فقہائے حنفیہ نے اس کا کوئی جواب دیا ہو گا، اپنی کی حد تک مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا درس حدیث محدود رہتا ہو، اگرچہ جہاں تک تحقیق سے معلوم ہوا عموماً یہ طرز عمل مشکوٰۃ شریف کے درس میں وہ اس لئے اختیار کرتے تھے کہ اس کتاب میں بجائے فقہی جھگڑوں کے طالب علموں کو حدیث کا صحیح ترجمہ لغوی، اور نحوی و صرفی کے اشکال کے حل تک قصداً وہ محدود رکھنا چاہتے تھے، لیکن گدرانے سے پہلے بعض طلبہ پک جانے کا ارادہ کرتے ہیں، چاہتے ہیں کہ ترمذی اور بخاری میں

جو باتیں بتائی جاتی ہیں وہی باتیں ان کو مشکوٰۃ اور بلوغ المرام وغیرہ متون حدیث میں بتا دیئے جائیں، خام کار نوخیز اساتذہ طلبہ کے فائدہ کے لئے نہیں بلکہ اپنے علمی رعب کی دھاک قائم کرنے کے لئے موجودہ اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ ایم۔ اے کے درجے میں بتائے جانیوالے معلومات میٹرک کے بچوں تک پہونچانا شروع کر دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ طلبہ کی بدتمیزیوں کے ساتھ درس کا ایک غلط اور قطعاً غیر مفید طریقہ استاذوں کی درسی بدسلیقگی کی بھی دلیل ہے، پختہ کار اساتذہ کے درس کا طریقہ وہی ہے، جسے مفتی صاحب کی طرف منسوب کیا جاتا تھا، کہنے کی حد تک یہ بات جتنی بھی آسان ہو، مگر طلبہ کے حلقے میں پہونچ کر اپنے نفسیاتی اقتضاؤں سے بلند تر ہو کر طالب علموں ہی کے فائدے کو پیش نظر رکھتے ہوئے درس دینا آسان نہیں ہے بڑے بڑوں کی ٹانگیں اس لغزش گاہ میں پہونچ کر پھسل جاتی ہیں (۱)

عملی درس

سچی بات تو یہی ہے کہ ہر چوبیس گھنٹے میں عصر کے بعد دیوبند کے بازاروں میں مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا عملی درس

---

(۱) میں نے سنا ہے کہ دارالعلوم کے صدر اوّل حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ باوجود صدر اساتذہ ہونے کے کبھی کبھی دیکھا جاتا تھا کہ طلبہ کو پڑھا رہے ہیں کسی مقام میں کوئی دشواری پیش آتی اسی وقت طلبہ کے حلقہ سے اٹھ کر کتاب لئے ہوئے اپنے ماتحت استاذوں میں سے کسی استاذ کے پاس پہونچ جاتے، اور کتاب کھول کر دریافت کرتے کہ مولوی صاحب اس دشواری کو بتائیے، کیسے حل کیا جائے، کوئی معقول بات اپنے ماتحت استاذ سے ان کو معلوم ہو جاتی تو اپنے کلاس میں پہونچکر طلبہ سے کہتے کہ بھائی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی فلاں مولوی صاحب اس کا یہ مطلب بتاتے ہیں میرے نزدیک بھی یہی اقرب الی الصواب ہے۔

Toobaa-elibrary.blogspot.com

سالہا سال سے جو دیا جا رہا تھا، شاید ہی کسی قیمت پر بھی وہ کہیں دوسری جگہ میسر آسکتا تھا، ان کی ساری زندگی، زندگی کا ایک ایک پہلو اپنے اندر انھیں لاہوتی شعاعوں کو چمکاتا اور پھیلاتا رہتا تھا۔

ملکوتی تلاوتِ قرآن

وہ قرآن کے حافظ تھے، میں نے سنا ہے کہ مغرب کے بعد اوابین والی نماز میں آٹھ پارے روزانہ پڑھنے کے ملتزم تھے، اپنی مسجد میں امامت خود کرتے تھے، ان کی قرأت پر ایک سیدھے سادے ہندوستان کے قصباتی مسلمان کے لب ولہجہ کا رنگ غالب تھا، اگرچہ اصولاً تجوید کے ہر قاعدے کی پوری رعایت کی جاتی تھی بلکہ شاید تجویدی اصولوں کے مطابق قرأت ان کی عادت ہوگئی تھی، لیکن مصنوعی قرأت سے دور کا سروکار بھی ان کی یہ قرأت نہیں رکھتی تھی، کبھی کبھی کسی کسی وقت کی نماز کے پڑھ لینے کی سعادت اس کور بخت کو بھی اللہ کے اس ولی کے پیچھے میسر آجاتی تھی، یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا شبیر احمد مرحوم پر صوفیانہ مشاغل کا غلبہ تھا، مفتی صاحب کی مسجد کے حجرے میں وہ چلہ کش تھے، فقیر بھی تراویح کے وقت حاضر ہو جاتا، اور چند ٹوٹے پھوٹے سننے والے مسلمانوں کے ساتھ یہ بھی ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا، ایسا کیوں کرتا تھا، نہ قرأت ہی میں کان کو کوئی خاص لذت ملتی تھی نہ کچھ اور تھا، لیکن دل یہی کہتا تھا کہ شاید زندگی میں پھر ایسے سیدھے سادے لہجے میں قرآن سننے کا موقع نہ ملیگا، اور دل کا یہ فیصلہ صحیح تھا، نمازیوں میں مولانا شبیر احمد رحمۃ اللہ علیہ بھی شریک رہتے تھے، اسی زمانے میں ایک دفعہ جو واقعہ پیش آیا، اب بھی جب اسے سوچتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، دل کانپنے لگتا ہے، مفتی صاحب قبلہ حسب دستور وہی اپنی زم زم سبک رو آواز میں قرآن پڑھتے چلے جاتے تھے، اسی سلسلہ میں قرآنی آیت وبرزوا للہ الواحد القھار (اور نکل کر لوگ سامنے آگئے اللہ کے جو اکیلا ہے اور سب پر غالب ہے) پر پہونچے نہیں کہہ سکتا کہ مفتی صاحب خود کس حال میں تھے، کان میں قرآن کے

یہ الفاظ پہونچے اور کچھ ایسا معلوم ہوا کہ کائنات کا سارا حجاب سامنے سے اچانک ہٹ گیا، اور انسانیت کھل کر اپنے وجود کے آخری سرچشمے کے سامنے کھڑی ہے، گویا جو کچھ قرآن میں کہا گیا تھا، محسوس ہوا کہ وہی آنکھوں کے سامنے ہے، اپنے آپ کو اس حال میں پا رہا تھا، شاید خیال یہی تھا کہ غالباً میرا یہ ذاتی حال ہے۔ مگر پتہ چلا کہ میرے اغل بغل جو نمازی کھڑے ہوئے تھے، ان پر بھی کچھ اسی قسم کی کیفیت طاری تھی، مولانا شبیر احمد صاحب کو بے ساختہ چیخ نکل پڑی، یاد آرہا ہے کہ چیخ کر غالباً وہ تو گر پڑے، دوسرے نمازی بھی لرزہ بر اندام تھے، چیخ و پکار کا ہنگامہ ان میں بھی برپا تھا، لیکن مفتی صاحب کو وقار بنے ہوئے امام کی جگہ اسی طرح کھڑے تھے، جدید کیفیت ان پر جو تھی، وہ صرف یہی تھی خلافِ دستور بار بار اس آیت کو مسلسل دہراتے چلے جاتے تھے، جیسے جیسے دہراتے، نمازیوں کی حالت غیر ہوتی چلی جاتی، آخر صف درہم برہم ہوگئی، کوئی ادھر گرا ہوا تھا، کوئی ادھر پڑا ہوا تھا، آہ آہ کی آواز مولانا شبیر احمد کی زبان سے نکل رہی تھی صف پر ایک طرف وہ بھی پڑے ہوئے تھے، کچھ دیر کے بعد لوگ اپنے آپ میں واپس ہوئے، تازہ وضو کر کے پھر نئے سرے سے صف میں شریک ہوئے، جہاں تک خیال آتا ہے۔ مفتی صاحب دار و گیر چیخ و پکار، صیحہ اور نعرہ کے ان تمام ہنگاموں میں اپنی جگہ کھڑے ہوئے، اس آیت کریمہ کی تلاوت میں مشغول رہے، جب دوبارہ صف بندی ہوئی تب پھر آگے بڑھے۔

سارا ماحول سبق آموز تھا

بہرحال کتابی درسی تعلیم کے سوا یہ کہہ سکتا ہوں کہ دار العلوم کا سارا ماحول ہی اس زمانے میں اسباق ہی اسباق سے لبریز تھا۔ فقیر نے باضابطہ دار العلوم کے مہتممین یعنی مہتمم اعظم حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب اور مہتمم ثانی حضرت مولانا حبیب الرحمٰن غفرلہ سے کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی، لیکن نہیں کہہ سکتا کہ ان بزرگوں کی عملی زندگی سے مسلسل جو درس ملتا رہا، شاید اس کی تفصیل کیلئے ایک مستقل کتاب ہی کی ضرورت

Toobaa-elibrary.blogspot.com

ہو، ان بزرگوں کا اخلاص، ان کا جود وکرم، ان کی نظر کی غیر معمولی بلندیاں، چھوٹوں پر ان کی شفقت، ان کی مہربانیاں، میری زندگی کے روشن چراغ ہیں، اب جبکہ تنہائی میں جب ان کے حسن سلوک، ان کی ہمت افزائیوں کے ان قصوں کو سوچتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے پاس او لاہے ہی کیا، لیکن جو کچھ بھی ہے، محض ان بزرگوں کے ہی فیض نظر کا صدقہ ہے

جاگیری عطیہ کو ٹھوکر ماردی

اللہ اللہ وہ کتنی کڑی اور سخت گھڑی تھی جب حکومت قائمہ کیطرف سے حضرت مفتی محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام یہ فرمان مدرسہ میں آیا کہ نہری علاقہ میں زمین کا ایک بڑا سرسبز وشاداب رقبہ آپ کی خدمت میں حکومت پیش کرتی ہے، شاید سینکڑوں ہی ایکڑ یا بیگھے پر حکومت کا یہ موہوبہ رقبہ مشتمل تھا، مشورے کی اس مجلس میں، جس میں حکومت کا یہ فرمان غور وخوض کے لئے پیش ہوا، اس فقیر کو بلا کر شریک کر لیا گیا تھا قبول کیا جائے، یا نہ قبول کیا جائے، اس پر دیر تک بحث ہوتی رہی، آخر میں یہی ہوا کہ قبول کرنے کی صورت میں مدرسہ کے اہتمام کا رشتہ حافظ صاحب مرحوم کو منقطع کر دینا پڑے گا، پشتہا پشت کی فراخ حالی کی ضمانت حکومت کے جس جاگیری عطیہ میں پوشیدہ تھی، ایک ٹھوکر میں وہ قدموں کے نیچے ڈال دی گئی، اور سیدنا الامام الکبیر مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلف صالح سے، جسکی توقع کی جاسکتی تھی، وہی توقع پوری ہوئی، ادھر ہی ادھر سے حکومت کو جواب دیدیا گیا، شاید ایسی کوئی صورت پیش آئی تھی یا نہیں، فقیر اگر شوریٰ کی اس مجلس میں خود شریک نہ ہوتا، تو وہ بھی قطعاً اس سے ناواقف ہی رہتا، ایثار وقربانی کا یہ واقعہ اگر ان لوگوں میں پیش آتا، جو خالق سے زیادہ مخلوق کی ستائشوں کے پیاسے ہیں، تو خدا ہی جانتا ہے کہ کس کس طریقے سے اس کا چرچا نہ پھیلایا جاتا، لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں، اس محدود حلقے کے سوا، جس میں اس مسئلے کو پیش کر کے فیصلہ کیا گیا تھا

کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی، کہ پیش کرنے والوں کی طرف سے کیا پیش ہوا تھا۔ اور واپس کرنے والوں نے کس چیز کو واپس کیا۔ تغمدھم اللہ بغفرانہ وطاب ثراھم۔

Toobaa-elibrary.blogspot.com

باب ۱۳

طلبہ برادری کے کچھ مشغلے

مضمون کے لئے جس وقت قلم اٹھایا گیا تھا خیال یہی تھا کہ زیادہ سے زیادہ چار قسطوں میں ختم ہو جائے گا لیکن اب اسے کیا کہیں کہ ایک بات سے مختلف باتوں کی طرف ذہن منتقل ہوتا چلا گیا، قلم رکنا نہیں چاہتا تھا میں نے بھی روکنا اسکو مناسب خیال نہ کیا اس کا فیصلہ تو پڑھنے والے ہی کر سکتے ہیں کہ مفید معلومات ان تک پہونچے، یا جیسے آج کل لاکھوں لاکھ اوراق میں پھیلاتے والے دوراز کار قصوں، بے سر و پا افسانوں کو پھیلاتے رہتے ہیں، کچھ بھی نوعیت اس مضمون اور اس کے مندرجات کی بھی تھی، اپنی نیت بہرحال یہی رہی کہ انھیں امور کا ذکر کیا جائے جن میں گونہ افادیت کا کوئی خاص پہلو مجھے نظر آتا تھا، اس حیثیت سے گویا سمجھنا چاہئے کہ اب یہ مضمون ختم ہو چکا ہے لیکن دار العلوم دیوبند کے احاطے میں پڑھنے کے لئے اپنی عمر کے جس حصے میں خاکسار داخل ہوا تھا، اگرچہ الحیوۃ الدنیا یا خاکی زندگی کے ان پانچ دوروں میں سے جن کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے ان کے دو ادوار یعنی لہو اور لعب سے تقریباً باہر نکل چکا تھا، آخر دو عشرے زین کے اس کرے پر جس کے گزر چکے ہوں، یا گزرنے کے قریب پہونچ چکے ہوں، اور کچھ نہیں تو اس کی امید بہرحال کرنی چاہیئے کہ لہو و لعب کے اعمال و اشغال سے وہ

اکتا چکا ہے، لیکن کیا کیجئے کہ طالب العلمی کی زندگی سے ابھی نجات نہیں ملی تھی، طالب العلموں ہی کے ساتھ رہنے پر جو مجبور ہو، وہ اپنی برادری کے عادات و رسوم سے چاہتا بھی تو قطعاً بے تعلق ہو کر نہیں رہ سکتا تھا۔

طالب العلمی کے دنوں میں (چنانچہ افتد دانی) کے بعض حوادث سے گزرنا ہی پڑا جب بیتے ہوئے ان دنوں کے سارے قصے آپ سن چکے تو ان مختصر لفظوں میں اس داستان کو بھی سن ہی لیجئے۔

جیسا کہ عرض کر چکا وہ وں وطنی تعلق اور رشتہ کی بنا پر بہاری ہی کے طلبہ کے ساتھ مجھے رہنا پڑتا تھا، بہاری طلبہ میں بھی ایک خاص ٹولی تھی، اس ٹولی کے سرگروہ مخدومی حکیم سید منظر حسن بہاری تھے، جو تقریباً اکتیس تیس سال سے اپنے وطن بہار ہی کے ایک گاؤں ڈیانواں میں مقیم ہیں اور اطراف و نواح میں اس وقت ان کا شمار سب سے بڑے اور پرانے اطباء میں کیا جاتا ہے (۱)، ہمارے یہ حکیم صاحب اپنے چند رفقاء کے ساتھ دار العلوم میں چند سال گزار چکے تھے، اس لئے مدرسے کے سواد دیوبند کے باغوں، کھیتوں، تالابوں وغیرہ سے کافی طور پر روشناس ہو چکے تھے، ہماری طالب العلموں کی یہ ٹولی چند خاص لعبی مشاغل میں کافی شہرت حاصل کئے ہوئے تھی، جن میں چند اہم مشاغل یہ تھے۔

تکیہ بازی

یہ ان طالب العلموں کا ایک خاص مشغلہ تھا، رات کی تاریکی میں جب اپنی اپنی چٹائیوں پر بستر ے ڈال ڈال کر طلبہ سو رہتے تو اچانک ایک آسمانی مصیبت کی طرح کسی پر ایک تکیہ آ کر گرتا، بھنا کر سونیوالا طالب العلم اٹھ بیٹھتا۔ اور اپنے سر کے نیچے کے تکیہ کو نکال کر بے تحاشا دوسرے طالب العلم پر دے مارتا، اس کے بعد سارے طلبہ جو اس حجرے میں ہوتے، ان میں کھلبلی مچ جاتی،

---

(۱) حکیم صاحب بھی اب جوار رحمت میں پہونچ چکے ہیں۔ رحمہ اللہ

Toobaa-elibrary.blogspot.com

اندھیرے میں ایک دوسرے پر تکبیر چلانا شروع کر دیتے، مسجد کے جنوبی سمت میں جو حجروں کی قطار ہے، ان ہی حجروں میں ایک حجرے میں بہاری طلبہ کی یہ ٹولی عموماً فروکش تھی، اور تکبیر بازی کا سلسلہ اسی حجرے میں گھنٹوں جاری رہتا۔

فقیر بھی اس ٹولی میں جب شریک ہوا، تو میرے ساتھ اتنی رعایت کی گئی کہ حجرے کے اندر ایک ذیلی حجرہ تھا، جس کا نام اس زمانے میں میں نے "حجرۂ قبریہ" رکھدیا تھا۔ اس میں مجھے جگہ دی گئی تھی، اور باہم طلبہ نے عہد کر لیا تھا کہ اس غریب لو وارد کو تکبیر بازی کے قانون سے "مستثنیٰ" قرار دیا جائے، یہ واقعہ ہے کہ اس معاہدہ کا کافی احترام کیا گیا، اور مجھے یاد نہیں آتا کہ تکبیر بازی کے اس ہنگامہ میں مجھے بھی شریک ہونے پر کبھی مجبور ہونا پڑا ہو، الّا یہ کہ صرف ایک دفعہ یہ صورت پیش آئی کہ مغرب کی نماز کے بعد مسجد ہی سے بڑے حجرے میں داخل ہوا، بڑے حجرے سے اپنے حجرۂ قبریہ میں جا ہی رہا تھا کہ اچانک ایسا محسوس ہوا کہ تکبیر کا کوئی وار مجھ پر بھی چلا ہی دیا گیا، پلٹ کر بڑے حجرے میں دیکھنے لگا کہ کن صاحب کی یہ نوازش ہے؟ بجز ایک صاحب کے جو بھاگلپور کے رہنے والے تھے، حجرے میں کسی دوسرے پر نظر نہ پڑی، یہ بھاگلپوری طالب العلم جن پر میری نظر پڑی، میں نے ان کو دیکھا کہ بیچارے نماز میں ہیں، اور نماز ہی میں رکوع کئے ہوئے ہیں، وقفہ اتنا مختصر تھا کہ رکوع تک تکبیر مار کر پہونچنا بظاہر ناممکن تھا اتنے میں دوسرے طلبہ بھی آگئے، میں نے ان کے سامنے اس مقدمہ کو پیش کیا کہ آپ لوگوں کے باہمی معاہدے کے احترام کو آج کن صاحب نے ختم کر دیا، یعنی اس فقیر پر بھی آج تکبیر کا حملہ ہو گیا، ساتھ ہی یہ بھی لوگوں سے عرض کر دیا گیا کہ بھاگلپوری صاحب حجرے میں موجود تو ضرور تھے، مگر نماز خصوصاً رکوع کی حالت میں ان کو نہ دیکھتا، تو سمجھا بھی جاتا کہ ان حضرت کی کرامت ہے، میں نے عرض کیا کہ وہ رکوع میں تھے، اس لئے اس جرم کا مجرم ان کو نہیں قرار دیا جا سکتا، یہ گفتگو تو بھاگلپوری کے سامنے کی گئی لیکن جب کسی ضرورت سے وہ ہٹ گئے، تو ہم سب کا اتفاقی فیصلہ یہی ہوا کہ تکبیر اسی شخص نے چلایا ہے، اور مصنوعی طور پر رکوع کی حالت اپنے

اوپر طاری کر لی تھی، تاہم طے کیا گیا کہ ان کے سامنے یہی کہا جائے کہ وہ رکوع میں تھے، تکبیر چلانے کا الزام ان پر نہیں لگایا جا سکتا، شروع میں تو بھاگلپوری صاحب بہت خوش ہوئے کہ ہماری ترکیب چل گئی، اس خوش فہمی میں رہے کہ نمازی کی صورت بنا کر باوجود مجرم ہونے کے جرم سے بری قرار دیئے گئے، لیکن وہ بھول گئے کہ ریائی نماز والے کو قرآن میں ویل کی دھمکی دی گئی ہے۔

مالم یسم فاعلہ کا لطیفہ

سنیئے، یہی ویل، قرآنی سزا نے انھیں کسطرح پکڑا، اس دن سے یہ دستور ہی مقرر کر لیا گیا کہ کھانے کے لئے دسترخوان پر طلبہ کی یہی ٹولی دونوں وقت جب بیٹھتی، یہ بھاگلپوری صاحب بھی لزوماً شریک ہوتے، تو سب سے پہلے اسی مسئلہ کو اٹھایا جاتا یعنی خلاف معاہدہ مولوی صاحب پر کس نے تکبیر چلایا؟ پھر یہ کہتے ہوئے کہ بھاگلپوری صاحب بیچارے تو نماز پڑھ رہے تھے، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کون تھا؟ اس کے بعد اس مجہول، مالم یسم فاعلہ، تکبیر چلانے والے کی طرف حد سے زیادہ اذیت رساں، تکلیف دہ الفاظ منسوب کیے جاتے کہلجاتا کہ جس نے یہ جرأت بیجا کی وہ ایسا تھا ویسا تھا، دسترخوان پر بیٹھنے والے سب بکر اس اموختہ کو روزآنہ دہراتے، ہر ایک دوسرے کی ہمنوائی کرتا، سارے مجمع میں خاموشی صرف ان ہی بھاگلپوری صاحب پر طاری رہتی، اور چپ چاپ وہ صرف کھانے میں مصروف رہتے، تقریباً پندرہ بیس روز تک دسترخوان کا وظیفہ یا حدیث المائدہ دونوں وقتوں کے لئے یہی گفتگو بنی رہی۔

آخر ایک دن بھاگلپوری صاحب کچھ آب دیدہ ہو کر فرمانے لگے کہ بھائی آپ لوگ معاف فرمائیں، آخر ایک دن ہو، دو دن ہو، مسلسل پندرہ بیس دن سے صرف ایک دفعہ تکبیر چلانے کے جرم میں گالیاں سن رہا ہوں، مسلسل سن رہا ہوں، میں اپنے قصور کا اعتراف کرتا ہوں، یہ جسارت مجھ ہی سے ہوئی تھی، رکوع میں ڈر کے مارے مصنوعی طور پر چلا گیا تھا، ظاہر ہے کہ اعتراف جرم کے اس دلچسپ منظر کے بعد قہقہہ کی

Toobaa-elibrary.blogspot.com

آواز سے کمرہ کس حد تک گونج اٹھا ہوگا

ہنڈیہ بازی

تکیہ بازی کے ساتھ ساتھ ہماری طلبہ کی یہی ٹولی کبھی کبھی یہ حرکت بھی کرتی تھی کہ دسمبر جنوری کے کڑاکے کے جاڑے کے دنوں میں کسی ہانڈی یا ٹھلیا میں پانی بھر کر ڈوری کے ساتھ کسی طالب العلم کے فرش کے سامنے چھت کے کڑے میں لٹکادی جاتی، جوں ہی کہ صبح کو بیدار ہو کر طالب العلم اٹھتا، اس کا سر پانی سے بھری ہنڈیا یا ٹھلیا سے ٹکرا جاتا۔ اور سارا بدن اور اس کے کپڑے پانی سے تربتر ہوجاتے، جاڑے کے ان دنوں میں باہمی مذاق کا یہ عجیب رواج تھا۔

رنگ بازی

ایک دن یہ لطیفہ بھی حد سے زیادہ دلچسپ پیش آیا کہ ایک طالب العلم جن کا زیادہ وقت گہری نیند ہی کے اندر گزرتا تھا جھنجھوڑنے پر بھی بمشکل بیداری کی کیفیت ان کے دماغ میں واپس ہوتی تھی کیا یہ گیا کہ ان کے ہاتھ کو رنگ سے رنگین کرکے دوسرے طلبہ جو سوئے ہوئے تھے، انکی پیشانیوں پر بھی وہی رنگ نیند کی حالت میں چھڑک دیا گیا، جاگنے کے بعد لوگوں کو جب محسوس ہوا کہ کسی نے ان کی پیشانیوں کو رنگ سے رنگین کر دیا ہے، تو دیکھنے لگے کہ کس کا ہاتھ رنگین ہے، خوابیدہ دماغ غریب بے قصور مجرم ٹھہرایا گیا، لاکھ قسمیں کھاتا لیکن بکف چراغ دارد کہتے ہوئے اسی کو دزد دلیر ٹھہرایا گیا

پٹاخے بازی

ہماری طلبہ کی یہ ٹولی اس قسم کی حرکات بھی کیا کرتی تھی، یعنی گوشت کی جھلی میں نسل پوٹاس والے پٹاخے کی گولیوں کو لپیٹ کر کتوں کے آگے ڈال دیتی جس میں پتھر کا کوئی ٹکڑا بھی محفوظ کردیا جاتا، کتے غریب گوشت کی لالچ میں پورا منہ ان پر مارتے، دانتوں کے نیچے دبنے کے ساتھ ہی یہ گولی منہ کے اندر پھٹتی اور ایک ہیبت ناک آواز آتی، غریب ایک عجیب مصیبت میں مبتلا ہو جاتا، حکیم صاحب کا خیال تھا کہ اپنے متعلق کتے کو یقین ہو جاتا ہے کہ میں مرگیا۔ اور واقعہ ہے کہ کچھ دیر کے لئے معلوم ہوتا کہ وہ مردہ ہو چکا ہے، لیکن

جب ہوش آتا تو پھڑپھڑا کر بھاگ جاتا۔

خرسواری

اسی طرح چاندنی راتوں میں یہی ٹولی یہ حرکت بھی کبھی کیا کرتی تھی کہ قصبہ میں ادھر ادھر گدھے جو مارے مارے پھرتے، ان کو پکڑتے، اور دُم اٹھا کر پسی ہوئی سیاہ مرچوں کا سفوف اس کے اندر ڈال دیا کرتے، طالب علم اس پر سوار ہوجاتے، اور مرچوں کی وجہ سے گدھوں پر ایک حال طاری ہوجاتا کہ لاکھ ان کو روکتے، مگر وہ بھاگتے چلے جاتے تھے، گویا خرسواری کا وقت رات کے بارہ بجے کے بعد چاندنی راتوں میں مقرر تھا، اور خرسواروں کا یہ گروہ اپنی اپنی شہ سواریوں کے کمالات دکھاتا، اور بھی طرح طرح کے لطائف مختلف شکلوں میں اس ٹولی کی طرف سے پیش آتے رہتے، مگر خاکسار کی شرکت دیکھ لینے اور مسکرا کر ہٹ جانے کے آگے مشکل ہی سے کبھی بڑھی ہوگی

شکاری کی مہم

ہماری طلبہ کی اس ٹولی کا ایک خاص مشغلہ شکار بھی تھا۔ آبی یا بحری شکار کے لئے خدا جانے ان لوگوں نے کہاں سے جال بھی مہیا کرلیا تھا۔ اور دسمبر جنوری کی راتوں میں جال کو لیکر ایک بجے دو بجے کے بعد عموماً تالابوں میں یہ اتر پڑتے اور مچھلیوں کا شکار کرتے، بعض دفعہ ایک خاص قسم کی مچھلی کسی کو کاٹ بھی کھاتی، زہر اس کے کاٹنے کا تقریباً بچھو کے زہر جیسا ہوتا تھا، نام اس مچھلی کا سینگی یا قریب یہی تھا۔

اسی طرح بری شکاروں کا سلسلہ بھی جاری تھا، جن میں سب سے زیادہ اہم جنگلی کبوتروں کا شکار تھا، دیوبند کے اطراف وجوانب گنوں کی کاشت کا رواج بہت زیادہ ہے۔ گرمیوں کے موسم میں پانی دینے کے لئے تقریباً ہر کھیت میں کچے کنوئیں کھودے جاتے ہیں۔ ان ہی صحرائی کنوؤں میں جنگلی کبوتر راتوں کو بسیرا لیا کرتے تھے، کھیتوں کے ان کچے کنوؤں میں عموماً طاق جیسے سوراخ ہوتے تھے، جن میں کبوتروں کو پناہ مل جاتی تھی، یہ شکاری مہم بھی راتوں ہی میں انجام پاتی تھی، کبھی کبھی فقیر بھی شب گزاری

Toobaa-elibrary.blogspot.com

کی اس مہم میں اس ٹولی کے ساتھ رات رات بھر کھیتوں اور میدانوں میں بھٹکتا رہا ہو، مگر اس ٹولی کا سب سے زیادہ ضعیف شمار کیا گیا۔

بہرحال سرخیل تو شکاریوں کی اس ٹولی کے حکیم منظر حسن صاحب ہی ہوتے، خدا جانے کس طرح پتہ چلا لیتے کہ اس کنویں میں کبوتروں کی کافی تعداد ہے، یہ فیصلہ کر کے جال پہلے کنویں کے منہ میں پھیلا دیا جاتا، اور ایک رسّہ جو ساتھ رہتا تھا اسی کو ہاتھ میں پکڑ کر حکیم صاحب اپنے خاص رفقاء کے ساتھ کنویں میں اتر جاتے، ان لوگوں کے اترنے کے ساتھ ہی کبوتر اڑنے لگتے۔ کنویں سے باہر نکلنا چاہتے لیکن جال میں گرفتار ہو جاتے، اور کچھ ایسے بھی ہوتے جو کنووں کے ان خانوں میں پکڑے جاتے جو قدم جمانے کے لئے کاشتکار ان کنووں میں بنا دیا کرتے یا واللہ اعلم خود کبوتر اپنی چونچوں سے کھود کھود کر اپنے رہنے کی جگہ بنا لیا کرتے ہیں نے حکیم صاحب سے عرض کیا کہ آپ کو اس کا خوف نہیں ہوتا کہ جن سوراخوں سے آپ کبوتر نکالتے ہیں، ان میں سانپ وغیرہ ہوں، تو ہنسے اور بولے کہ جس کنویں میں ایک سانپ بھی ہو گا اس میں کبوتر کا وجود ناممکن ہے، پس کبوتر کا ہونا ہی دلیل ہے کہ اس کنویں میں کوئی خطرہ نہیں ہے، یہ مبالغہ نہیں ہے بلکہ واقعہ ہے کہ ایک مہم میں بسا اوقات تین تین سو چار چار سو کبوتر ہاتھ آ جاتے تھے۔ پو پھٹنے کے ساتھ ہی ہم لوگ مدرسہ میں داخل ہو جاتے صبح کو ذبح کئے ہوئے کبوتروں کی پکائی، دیگوں میں ہوتی۔ اس میں شک نہیں کہ بڑی لذیذ غذا تھی۔ بھلا پرند کے گوشت کا اتنا بڑا ذخیرہ کہاں میسر آ سکتا تھا، پھر وہ خود اور دوسرے طلبہ بھی کبوتروں کی اس دعوت میں شریک ہوا کرتے تھے۔

خرگوش کا شکار

مچھلیوں اور کبوتروں کے ساتھ ساتھ خرگوش کی بھی کافی تعداد ہر دوسرے تیسرے دن شکار ہوتی تھی، گیہوں کے کھیتوں میں بکثرت خرگوش ہانکے جاتے تھے۔ اور یہ طلبہ کبھی کبھی لاٹھیوں سے بھی ان کو مار لیا کرتے تھے۔ گیہوں کے ہلتے ہوئے خوشوں سے استدلال کیا جاتا تھا کہ

Toobaa-elibrary.blogspot.com

ضرور ان کے آس پاس خرگوش ہیں، پینترا بدلتے ہوئے یہی مشاق شکاری رفقا عصا بکف ان غریبوں کے سر پر بلائے بے درماں کی طرح پہونچ جاتے، اور ایک ہی وار میں بے چارے خرگوش لوٹ پوٹ ہو جاتے کھل گاؤں ضلع بھاگلپور کے ایک طالب العلم مولوی ذکی الدین صاحب کو اس باب میں امتیاز حاصل تھا، یہ عجیب بات ہے کہ تین چار خرگوش عموماً پک کر دسترخوان پر ہر دوسرے تیسرے دن آتے لیکن خدا جانے میرا دل اس کے کھانے پر آخر وقت تک کیوں راضی نہ ہوا۔ زیادہ سے زیادہ کبھی کبھی مصالحہ تو روٹی میں لگا لیتا لیکن بوٹی شاید ہی کبھی استعمال کی ہو۔

چنے، مٹر، گنّے کا موسم

اس سلسلہ کی ایک بات جو گزری ہے، اسے بھی عرض کر ہی دیتا ہوں، شرعاً وفقہاً جواز کا فتویٰ نہیں دیا جا سکتا، لیکن کبھی کبھی طلبہ کی یہ ٹولی کھیتوں سے چنے اور مٹر بھی اکھاڑ لیتی، اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ گنے پر بھی کبھی دھاوا بول دیتی۔

دیوبند وغیرہ میں قاعدہ تھا کہ رس نکالنے کی مشین یعنی کولھو ہر جگہ گڑے رہتے ہیں اور عام اجازت تھی کہ بیلوں کو انھیں میں جوت کر جس کا جی چاہے رس نکالے، ایک مرتبہ بدقسمتی سے شب گردی کی اس مہم میں فقیر بھی ساتھ ہو گیا، گنے کی کافی تعداد حاصل ہوئی، خیال کیا گیا کہ ان کا رس نکالا جائے، لیکن بیل طالب علم کہاں سے لاتے، بالآخر طے کیا گیا کہ بجائے بیلوں کے طلبہ ہی کولھو چلائیں، اس موقع پر حصہ رسدی کے مطابق تھوڑی دیر کے لئے یاد آتا ہے کہ رس نچوڑنے کیلئے کولھو میں خاکسار کو بھی جوتا گیا تھا

گنّے میں ہرن کی ڈار

گنے کے انھیں کھیتوں کے سلسلے میں ایک بات یاد آ گئی، برسات کا موسم تھا۔ چاروں طرف جدھر دیکھئے کھیتوں میں پانی ہی پانی بھرا ہوا تھا۔ یکایک ایک طالب العلم کی نظر ایک کے کھیت میں ہرنی کی کوئی ڈار چھپی ہوئی ہے، طالب العلموں نے اس کھیت کا چاروں طرف سے احاطہ کر لیا۔ عام طور پر تو ہرن ادھر ادھر سے اڑ اڑ کر نکل گئے، لیکن ایک بدقسمت ہرنی

پانی میں پھنس گئی، طلبہ اس پر ٹوٹ پڑے، گو اپنی ٹانگ کے کھروں سے اس نے اکثروں کی خبر لی، کافی زخم لوگوں کو پہونچا، لیکن نیچے سے نکلنے میں وہ کامیاب نہ ہو سکی، اس واقعہ کی کافی شہرت ہوئی کہ بغیر بندوق وغیرہ کے ہاتھوں سے طالب العلموں کی اس ٹولی نے ہرن کو پکڑ لیا، خوب دعوت اس کے کبابوں کی ہوئی۔

مسلّم حلوان (بکری کا بچہ) اور مزعفر کی یادگار دعوت

اس زمانہ کا حال معلوم نہیں، لیکن ہمارے زمانے میں

عام دستور دیوبند والوں کا تھا کہ بیر کے باغ میں طلبہ کی دعوت کرتے، آموں کی بھی دعوت ہوتی تھی، اور سال بھر میں ایک دفعہ رسیاول کی دعوت خالص دودھ کے ساتھ مدرسہ بھر کی مدرسہ ہی کی طرف سے کی جاتی تھی، کبھی کبھی باہر کے ارباب توفیق مدرسہ پہونچ کر طلبہ کی دعوت کیا کرتے تھے، جن میں ایک دعوت کے لطف و لذت کو ایام پیری میں بھی جب یاد کر لیتا ہوں، تو دیر تک ذائقہ کو خیالی لذت کا موقع مل جاتا ہے۔

کلکتہ کے ایک مشہور تاجر بخش الٰہی مرحوم تھے، سیزر سگریٹ کے سارے ہندوستان میں سول ایجنٹ تھے، اپنے زمانہ میں کلکتہ کے سربرآوردہ تجار میں شمار ہوتے تھے سب سے پہلے ان ہی کی انگلی میں وہ انگوٹھی میری نظر سے گزری تھی، جس کا نگینہ اندھیرے میں گوہر شب چراغ بنا ہوا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ ان کے ہاتھ میں کوئی ستارہ چمک رہا ہو، بہر حال انھیں بیتے ہوئے دنوں کا قصہ ہے کہ بخش الٰہی مرحوم نے دارالعلوم کے طلبہ کی دعوت کا ارادہ کیا، اپنے ساتھ ریل گاڑی میں حلوانوں (بکری کے شش ماہہ ہفت ماہہ بچوں) کی کافی تعداد لیکر دیوبند پہونچے، شاید سینکڑوں سے متجاوز تھی، ان ہی مسلم حلوانوں کی بریانی پکوائی گئی، اور مزعفر بھی سیٹھ صاحب کیطرف سے جو تیار کرایا گیا

تھا، واقعہ یہ ہے کہ زجیع خانوں تک سے بجائے عفونت کے زعفرانی بھپارے کئی دن تک اٹھتے رہے، ایک ایک طالب العلم کے حصے میں خیال یہی گزرتا ہے کہ چند مسلم حلوان کے گوشت آئے تھے، کھانے میں بجائے بکرے کے مرغ مسلم کا مزہ بھی ملتا تھا، اور ہڈیوں پر بھی مرغ مسلم ہی کی ہڈیوں کا شبہ ہوتا تھا

مہمانان رسول کی غیب سے ناز برداریاں

الغرض دارالعلوم دیوبند کا ماحول

کم از کم اس زمانے میں جب فقیر کو اس کے احاطے میں چند سال زندگی گزارنے کا موقع ملا۔ امن وعافیت، راحت اور آرام کے اسباب سے معمور تھا، نہیں کہہ سکتا کہ یہی واقعہ تھا، یا عمر کی جس منزل میں ہم تھے، اس کا یہ اقتضا تھا، میرے بعض تجربات تو اس باب میں عجیب ہیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دینی علوم کے ان طلبہ کی غیب کیطرف سے بھی ناز برداریاں ہوتی تھیں، سب کا تذکرہ تو مناسب نہیں ہے، لیکن نمونے کے طور پر ایک تجربہ کا ذکر کر ہی دیتا ہوں۔

غالباً ششماہی امتحان کا زمانہ تھا، جوابوں کے لکھنے میں کافی تاخیر ہو گئی تھی، مطبخ سے کسی نے کھانا لاکر رکھ دیا تھا، روٹیاں بھی ٹھنڈی اور خشک ہو چکی تھیں اور سالن بھی تقریباً ناقابل استعمال بنا تھا، جواب لکھنے کے بعد گرسنگی کی شدت تھی میں، اس کھانے کو اپنے سامنے پاکر قطعاً خلاف عادت طبیعت میں ایک مجہول سا تنغض کہئیے یا کڑکڑاہٹ کی سی کیفیت محسوس ہوئی۔ اور یوں ہی کھانے کو دسترخوان پر چھوڑ کر بستر پر دراز ہو گیا۔ شاید آدھ گھنٹے اس حال میں گزرے ہوں گے کہ میرے ایک رفیق درس جن سے بجز درسی رفاقت کے اور کوئی خاص تعلق نہ تھا، بمبئی کے رہنے والے تھے کیا دیکھتا ہوں کہ وہ میرے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں، اور جگا کر یہ کہہ رہے ہیں کہ ارے یار، خدا جانے کہ اسوقت دل میں یہ خیال کیوں پیدا ہوا کہ گرما گرم بریانی جو فلاں باورچی کے ہاں تیار ہوتی ہے، مجھے کھانی چاہئیے، اس کے ساتھ یہ خطرہ بھی

Toobaa-elibrary.blogspot.com

آیا کہ تم کو بھی ساتھ لے چلوں، میں ان سے عذر و معذرت بھی کرتا رہا لیکن وہ سر ہی ہو ہو گئے، اور اپنے ساتھ اٹھا کر باورچی کی دکان پر پہونچے، واقعی اس دن اسکے ہاں بریانی حد سے زیادہ لذیذ تیار ہوئی تھی، سیر ہو کر ہم دونوں نے کھایا، مینی کے میزبان رفیع جن کا نام مولانا عبد الغفور تھا، سننے میں آیا کہ بیچارے کا انتقال ہو گیا، انکو اسکا پتہ بھی میں نے چلنے نہ دیا کہ اسوقت روٹھ کی ایک خاص کیفیت میں کھانا کھائے بغیر میں پڑا ہوا تھا، اب بھی جب اس واقعہ کو سوچتا ہوں، تو محض بخت و اتفاق قرار دینے پر دل راضی نہیں ہوتا۔

باطنی اشاروں کی کرشمہ سازیاں

سچ پوچھیے تو باشندگان دیوبند کے قلوب میں طلبہ کا جو احترام تھا، اور اس احترام کے عملی مظاہرے روزمرہ جو سامنے آتے رہتے تھے، انکو دیکھ کر اس کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ بنی آدم کے قلوب جس "الرحمٰن" کی انگلیوں کے نیچے دبے ہوئے ہیں، اسی کے باطنی اشاروں کی یہ کرشمہ سازیاں تھیں، کھیتوں کے چنے مٹر گنے وغیرہ لانے کا قصہ بیان کر چکا ہوں، بظاہر شرعاً ان اعمال و افعال کے جواز کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی لیکن اسی کے ساتھ اس برتاؤ کا خیال جب سامنے آتا ہے، جو "مولوی جی" یعنی طلبۂ دار العلوم کے ساتھ باشندگان قصبہ کا تھا، اپنی اپنی بیریوں میں بلا بلا کر طلبہ کی بیریوں سے ضیافت یا امرویوں میں مدعو کر کے آموں کی سخاوت ایک عام بات تھی، ان ہی امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے کبھی کبھی دل میں یہ وسوسہ بھی آتا تھا کہ کیا اپنے کھیتوں کی پیداوار سے استفادہ کی عرفی اجازت اس علاقے کے لوگوں نے طلبہ کو دے رکھی ہے؟ شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ طالب العلموں کی درازدستیوں کی شکایت اس زمانے میں شاید ہی کبھی سنی گئی ہو، سنا ہے کہ حالات اس تیس چالیس سال کے عرصہ میں بہت کچھ بدل چکے ہیں، گویا سمجھنا چاہیئے کہ اس عرفی اذن یا اجازت کے دعوے کی بھی گنجائش اب باقی نہیں رہی ہے، اسی لئے تم گزشتہ زمانے کے واقعات پر چاہیئے کہ

اس زمانے کے طلبہ قیاس کر کے حرام کو خواہ مخواہ حلال ٹھہرانے کی نکوہیدہ کوشش نہ کریں نہ دیوبند کے باشندے ہی وہ باقی رہے، جو انھیں کے آباء و اجداد کسی زمانے میں تھے، اور نہ طلبہ کا وہ رنگ نظر آتا ہے۔ جس کی رعایت آپ سن چکے غیب میں بھی کی جاتی تھی۔

★

Toobaa-elibrary.blogspot.com

باب ۱۴

چند یادگار تقریبات

بہر حال ان جسمانی مسرّتوں اور مادی لذتوں کے ساتھ ساتھ ان زمانوں میں وقفہ وقفہ سے ایسی تقریبیں بھی مدرسے میں ہوتی رہتی تھیں، جن میں ذہنی سکینت اور دماغی راحت وضیافت کا سامان پوشیدہ ہوتا تھا، دارالعلوم میں خاکسار کے قیام کی مدت دو ڈھائی سال سے شاید زیادہ نہیں ہے۔

پہلی تقریب

لیکن اسی عرصے میں آستانۂ خلافت ترکیہ کا ایک وفد جمال پاشا کی قیادت میں دارالعلوم پہونچا تھا، اور منجملہ دوسرے تحائف کے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے خرقۂ مبارک کے غلافِ پاک کا ایک ٹکڑا جو حلبی شیشوں کے ایک خوبصورت صندوقچہ میں بند تھا، مدرسہ تک پہنچانے کی سعادت اسی شاہی وفد نے حاصل کی تھی، خیال آتا ہے کہ جمال پاشا نے ایک تقریر بھی کی تھی۔ یہ یاد نہ رہا کہ ترکی زبان میں کی تھی یا کسی مغربی زبان میں غالباً کسی نے ترجمہ بھی اس تقریر کا اسی وقت کر دیا تھا، مرحوم ڈاکٹر انصاری بھی شاید اسی زمانے میں مدرسہ میں پہونچے تھے، اور ترجمہ بھی ممکن ہے جمال پاشا کی تقریر کا انھیں نے کیا ہو۔

دوسری تقریب

اسی زمانے میں علامہ وہبی جو بعد میں سعودی حکومت کی طرف سے انگلستان میں سفیر مقرر ہوئے انکی تشریف آوری بھی ہوئی تھی، نو درہ میں تقریر بھی عربی زبان میں کی تھی لیکن جہاں تک یاد آتا ہے۔ ان کی تقریر کا کوئی غیر معمولی اثر اپنے اندر نہ ہم نے ہی محسوس کیا اور نہ دوسروں نے۔

تیسری تقریب

البتہ اسی زمانے میں علامہ وجیہ الجیلانی الافندی' جو فلپائن (مقبوضۂ امریکہ) کے مسلمانوں کی درخواست پر حکومت ترکیہ عثمانیہ کی طرف سے شیخ الاسلام بنا کر فلپائن بھیجے گئے تھے، راستے میں ہندوستان سے گزرتے ہوئے وہ دارالعلوم میں تشریف فرما ہوئے تھے، عمر ان کی تیس چالیس کے درمیان تھی، گورے چہرے پر حسین سیاہ داڑھی کے بال نے ان کی وجاہت کو دوبالا کر رکھا تھا۔ نو درہ ہی میں دارالعلوم کے اساتذہ اور طلباء کے سامنے عربی زبان میں سید موصوف نے ایک تقریر فرمائی، تقریر کیا تھی، سحر کر رہے تھے، بے ساختہ ان کی زبان کے ڈھلے ڈھلائے فقرے جس وقت نکلتے تھے، اور تقریر میں بعض خاص عربی الفاظ کو اسلوبِ جدید کے ساتھ جس وقت وہ ادا کرتے تھے تو صوفیوں کے وجد و حال کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی، شیخ الاسلام وجیہ آفندی دارالعلوم کو دیکھ کر اس درجے اس کے گرویدہ ہوئے کہ فلپائن کی شیخ الاسلامی کے زمانے میں بھی اور علالت کیوجہ سے قسطنطنیہ واپس ہونے پر مجبور ہوئے تو بھی برابر دارالعلوم کی یاد ان کے حافظہ میں تازہ رہی، ان کا ایک عربی خط قسطنطنیہ سے جو آیا تھا مجلّہ نے ترجمہ کے ساتھ القاسم میں اس کو شائع کر دیا تھا۔

چوتھی تقریب

تقریبات ہی کے سلسلے میں شاید وہ دن بھی بھلایا نہیں جا سکتا جب حکومتِ آصفیہ دکن کی امداد جو ابتدا میں صرف ڈھائی سو روپئے ماہوار کی حد تک محدود تھی، لیکن مرحوم شمس العلماء حافظ محمد احمد صاحب

Toobaa-elibrary.blogspot.com

جو اس وقت صدر مہتمم تھے، ان کی کد و کاوش سے یہی امداد ڈھائی سو سے ترقی کر کے ہزار روپے ماہوار تک پہونچ گئی تھی، حافظ صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ اس غیر معمولی کامیابی کے ساتھ دکن سے جب واپس ہوئے، تو بڑے جوش و خروش کے ساتھ دیوبند کے اسٹیشن پر ان کا استقبال کیا گیا تھا، اور دوسرے دن نودرہ میں اساتذہ و طلبہ کی طرف سے حافظ صاحب مرحوم کی خدمت میں شکریہ پیش کرنے کے لئے جو اجتماع عام ہوا تھا اساتذہ کی طرف سے تقریروں کے ساتھ خوب یاد ہے کہ حضرت الاستاذ الامام مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی عربی زبان میں ایک قصیدہ اپنے خاص انداز میں سنایا تھا، حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاہ صاحب نے فرمایا تھا۔

کالشمس فی نسب والبدر فی حسبٍ
قد غامر المجد اقصاہ وادناہ

این الامام جلیل القدر قاسمھم
والطائر العیث فی ارجاء منحاہ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر کان میں اس وقت بھی گونج رہا ہے، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نائب مہتمم نے عربی زبان ہی میں اپنا قصیدہ پیش کیا تھا، اس قصیدے کا آغاز جن اشعار سے کیا گیا تھا یعنی

قدمت طول زمانی ساھراً وجبا — ایام راح حمید القوم معتربا
راح الکریم لنصر الدین مجتھداً — وبت کالصب مکروباً ومکتئباً

ان ہی مواقع پر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم کے علمی کمالات کبھی کبھی نہ جاننے والوں کے سامنے بھی آجاتے تھے۔ ورنہ عوام میں زیادہ شہرت ان کی عملی اولوالعزمیوں کی تھی، یاد آتا ہے کہ ہمارے مخدوم و محترم مولانا محمد طیب صاحب مدظلہٗ حالیہ رئیس الاہتمام دار العلوم دیوبند[1] کے لئے شاید یہ پہلا موقع تھا کہ مجلس عام میں ایک ہی نہیں، بلکہ آپ نے دو نظمیں یعنی ایک فارسی میں اور ایک اردو میں، جس میں اپنے والد ماجد کی خدمات کا اعتراف فرمایا تھا، باوجود کم عمری کے فطری سنجیدگی اور انتہائی متانت و طمانیت کے ساتھ یہ دو نظمیں اتنے بڑے مجمع میں سنائیں کہ تاڑنے والوں نے اسی وقت تاڑ لیا تھا۔ ماضی کے اس آئینے میں مولانا ممدوح کا شاندار تاریخی مستقبل جھانک رہا تھا۔

(فحیاہ اللہ تعالیٰ وایدہ بروح منہ)

اردو کی جو نظم مولانا طیب صاحب نے سنائی تھی وہ کافی طویل تھی۔ فارسی نظم کے اشعار تھوڑے تھے۔ القاسم کے اس شمارے میں جس میں حضرۃ الاستاذ الکشمیری اور مولانا حبیب الرحمٰن العثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے عربی قصائد شائع ہوئے تھے، یاد آتا ہے کہ اسی میں مولانا طیب صاحب کی اس فارسی نظم کو باکورۂ فکر مولوی طیب صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کے عنوان سے خاکسار نے شائع کر دیا تھا،

باکورہ جیسا کہ معلوم ہے عربی زبان میں درخت کے پہلے پھل کو کہتے ہیں۔ گویا نظم کے حساب سے مولانا طیب صاحب کی یہ پہلی نظم تھی، جو زیور طبع سے آراستہ ہوئی مولانا طیب صاحب کی اسی نظم کا یہ شعر یعنی اپنے آپ کو خطاب کر کے فرمایا گیا تھا

اے غلام شمس اعلام عظام — بہر لطفش خواد برخوردار باش

اس وقت بھی تحسین و داد کا مستحق قرار دیا گیا تھا اور آج بھی بیس چالیس سال کے بعد داد طلبی کا یہ شعر جائز حقدار ہے۔ فارسی کی اس نظم کو ختم کرتے ہوئے مولانا طیب صاحب کی زبان پر جس بے ساختگی کے ساتھ یہ شعر جاری ہوا تھا یعنی

فارسی بگزار اردو را بیار — مطلعِ دیگر بخوان تیار باش

[1] ۶ شوال ۱۴۰۳ھ کو وفات پاچکے۔ رحمہ اللہ

Toobaa-elibrary.blogspot.com

شاید اس کا لطف آج بھی سننے والوں کے حافظوں میں محفوظ ہوگا

پانچویں تقریب

غالباً اس تقریب کے چند دنوں بعد مولانا طیب صاحب کو صاحبِ تقریب بن کر جلوہ فرما ہونا پڑا یعنی منجملہ دوسری خوش بختیوں کے فقیر کی ایک خوش بختی یہ بھی تھی کہ مولانا طیب کو دولہا بنا کر دیوبند سے براتیوں کا جو مجمع ان کی سسرال رامپور منہاران روانہ ہوا تھا، ان میں ایک ادنیٰ ترین خادم کی حیثیت سے شرکت کی سعادت اس فقیر کو بھی حاصل ہوئی تھی، مولانا کے خسر مرحوم مولانا محمود صاحب ان زمانوں میں راجپوتانے کی ریاست اندر گڑھ نامی کے مختار عام اور مدار المہام تھے، مہمانوں کی خاطر مدارات میں جو کچھ ان سے ممکن تھا، اس میں تکلف کا شاید ہی کوئی دقیقہ اٹھا رکھا گیا ہو۔

دیدۂ عبرت جو وا ہو۔۔۔۔!

رامپور کی اس محفل شادی میں ایک عبرتناک واقعہ بھی نظر سے گزرا تھا، جسے اب بھی کبھی سوچتا ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں اپنی کم عمری کے زمانے میں اچھی طرح یاد ہے کہ ہندوستان میں اخبار نویسی کی راہ سے، چند خاص ہستیوں کو غیر معمولی امتیاز حاصل ہوا تھا جن میں ایک صاحب شوکت میرٹھی نامی بھی تھے، انکا اخبار جو میرٹھ ہی سے غالباً "شحنۂ ہند" کے نام سے نکلتا تھا، لوگ اس اخبار کے مقالات و مضامین، اس کے لطائف و ظرائف کا ہفتہ بھر انتظار کرتے رہتے تھے، جوں ہی پرچہ نکلتا، جسے مل گیا پڑھنے میں مشغول ہو جاتا تھا۔ رامپور منہاران میں دیکھا کہ ایک پیر فرتوت، فرسودہ سی شیروانی پہنے ہوئے مجمع میں آکر بیٹھے، کسی نے تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ شوکت میرٹھی ہیں، عبرت کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، کان سے سن سنکر اس شخص کے متعلق آنکھوں کے سامنے کیسے کیسے نقشے آگئے ہوں گے، آج یہ بیچارہ مجبور و معذور ہو کر اس مجمع میں آکر شریک ہوا تھا کہ شاید لوگوں کو اس کی حد سے گزری ہوئی

شیخوخت اور بڑھاپے پر رحم آجائے، اور جس سے جس قسم کا سلوک ممکن ہو، وہ کر گزرے، طالب علموں نے اس بوڑھے اخبار ایڈیٹر کو گھیر لیا تھا، طرح طرح کے سوالات کرتے تھے شکست خوردہ مرغ کی طرح وہ غریب اپنے آپ کو ان سے بچانے کی کوششوں میں مشغول تھا

اس زمانے میں یہ شوکت میرٹھی، اور دلی کے ایک صاحب مرزا حیرت نامی اور بھی چند اس نوعیت کے کچھ لوگ تھے، جو اپنے زور قلم کی روٹی کھاتے تھے، طرح طرح کے فتنے مسلمانوں میں نئے نئے مسائل چھیڑ کر اٹھانے کے عادی تھے، شوکت بیچارے کو تو اس حال میں دیکھا، اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے طالب علموں نے مولوی شبلی کی علاحدگی کے بعد احتجاجاً اسٹرائک کر کے سارے ہندوستان کو جب سر پر اٹھا لیا تھا اس گتھی کو سلجھانے کے لئے دانایان قوم دلی میں جمع ہوئے تھے، دارالعلوم سے بھی ایک وفد علماء کا دلی بھیجا گیا تھا، جس میں فقیر بھی شریک تھا، بجائے خود دلی کا یہ ہنگامہ، ہندوستان کی تاریخ میں ایک خاص ہنگامہ تھا، دیوبند، ندوہ علی گڑھ مسلمانوں کے تینوں علمی مرکز کے نمائندے، اس میں ایک پلیٹ فارم پر پہلی دفعہ سر جوڑ کر بیٹھے تھے۔ اس مجمع میں جہاں بہت کچھ تھا۔ اسی میں مرزا حیرت بیچارے پر بھی نظر پڑی تھی، اپنے عہد طفلی کے ان دنوں کو یاد کرتا تھا جب سارا ہندوستان مرزا حیرت اور ان کے اخبار کرزن گزٹ کے چرچے سے معمور تھا اسی اخبار میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے واقعہ کا انکار کر کے شیعوں اور سنیوں دونوں میں ایک ایسی کھلبلی مچا دی گئی تھی کہ اس مسئلے کے سوا شاید اس زمانے میں مسلمانوں کی مجلسوں میں کسی دوسرے مسئلے کا تذکرہ گویا مشکل ہی کیا جاتا تھا، لیکن یہی مرزا حیرت بعد کس مپرسی، اس مجمع میں آکر اپنے کو روشناس کرانا چاہتے تھے، لیکن کسی کے کان پر جوں نہیں رینگتی تھی کہ کون ہے؟ اور کیا کہنا چاہتا ہے؟ دلی تک میں غریب مرزا حیرت کا کوئی مقام باقی نہیں رہا تھا شہر کے سخروں میں اب شمار

Toobaa-elibrary.blogspot.com

کئے جاتے ہیں، کچھ ہی دنوں کے بعد افواہاً کسی سے معلوم ہوا کہ خود بھی مر گئے، اور جو دولت اپنے قلم اور زبان کی فتنہ زائیوں سے پیدا کی تھی۔ وہ بھی ان کے ساتھ دفن ہو گئی، فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَار۔

مولانا ابو الکلام آزاد سے ملاقات

ہاں ندوہ کے اسی یوم مشہود کے سلسلے میں ایک واقعہ جو پیش آیا تھا، قریب قریب چالیس سال گزر جانے کے بعد آج بھی اسکی یاد تر و تازہ ہے، مطلب یہ ہے کہ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ اس تقریب میں اتفاق کی بات تھی کہ ایک طرف دیوبند کے علماء اور دوسری طرف علی گڑھ کے زعماء کے ساتھ ساتھ قدیم و جدید کے ان دونوں طبقات میں برزخی حیثیت کہئے یا اعرافی مقام کے مالک ندوہ کے فضلاء گویا سفارت کا کام انجام دے رہے تھے — بڑے چھوٹے سب ہی سمٹ سمٹا کر ملک کے مختلف گوشوں سے جمع ہو گئے تھے، یہ وہ زمانہ تھا کہ الہلال مولانا ابو الکلام آزاد کا تاریخی مجلہ نکل چکا تھا۔ الہلال ہی کے توسط سے دل کا ایک خاص تعلق مولانا کی ذات سے قائم ہو چکا تھا۔ دلی پہونچنے کے بعد سب سے بڑی آرزو یہی تھی کہ کسی طرح مولانا ابو الکلام آزاد سے ملاقات و مکالمے کا موقع مل جائے، حق سبحانہ تعالیٰ نے اس دشوار مسئلے کو بھی آسان کر دیا بغیر کسی سابقہ تعارف کے حکیم اجمل خاں مرحوم کے ہمراہ ان کے مکان میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ مولانا کے ریعان شباب کا زمانہ تھا، سیاہ کمانی کی عینک اور سر پر کافوری عمامہ اس زمانہ میں باندھا کرتے تھے، فقیر اپنی ٹھیٹھ دیوبندی ہیئت میں حاضر ہوا تھا، سر پہ سفید طاقیہ، لمبا کرتا، خالص دیوبند کا طالب علم، مگر ملنے کے ساتھ ہی مولانا غیر معمولی طور پر متوجہ ہو گئے، تا آنکہ عصر کے بعد سے مغرب تک مختلف مسائل پر گفتگو فرماتے رہے، یہی اپنی زندگی میں مولانا سے پہلی ملاقات اور شاید یہی آخری ملاقات تھی۔

مسئلہ رفع یدین کی نئی توجیہ

مغرب کی نماز مولانا کے ساتھ ہی حکیم جی مرحوم کی مسجد میں جماعت کے ساتھ ادا کی گئی، نماز میں ایک خاص لطیفہ پیش آیا، فرض نماز میں میں نے دیکھا کہ مولانا نے رفع یدین نہیں کیا، لیکن سنت میں انہی کو رفع یدین کرتے ہوئے جب میں نے پایا، تو مسجد سے نکلتے ہوئے وجہ دریافت کی گئی، مولانا مسکرائے اور فرمانے لگے کہ جناب یہ بھی حدیثوں میں تطبیق کی ایک شکل ہے، دیوبند میں یہ توجیہ آپ نے نہ سنی ہوگی، پھر ایک تقریر کی جس کا حاصل غالباً یہی تھا کہ حدیثوں سے رفع و عدم رفع دونوں باتیں ثابت ہیں، ایک مقدمہ تو یہ ہوا، دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ مکتوبات یعنی فرض نمازوں اور سنن و نوافل کے درمیان منجملہ دیگر امتیازات و فروق کے ایک فرق یہ بھی ہے کہ سنن و نوافل میں گونہ حرکات کی گنجائش ہے، جن کا تحمل فرائض نہیں کر سکتے، تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ رفع و عدم میں ظاہر ہے کہ رفع کا تعلق حرکت سے ہے، اور عدم رفع میں سکون ہے، ان ہی تینوں مقدمات کو پیش نظر رکھ کر مولانا نے فرمایا کہ سنن و نوافل میں تو رفع یدین کر لیتا ہوں لیکن فرائض میں احتیاط سے کام لیتا ہوں۔

واقعی مولانا کی طرف سے مسئلہ رفع یدین کی نئی توجیہ تھی، جو اسوقت کان میں پڑی اور اسوقت تک کسی کتاب میں باوجود طول مطالعہ کے یہ توجیہ نظر سے نہیں گزری۔

بہر حال اپنے ان بیتے ہوئے دنوں کو زندگی کی اس آخری منزل میں جب سوچتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے لئے شاید وہی چند سال ایام حیات تھے، طرح طرح کی باتیں یاد آتی ہیں لیکن اب کہاں تک درد کے اس افسانے کو سننے کا بست و بلند ہر قسم کی باتوں کے نمونے پیش ہو چکے، آخر میں جی چاہتا ہے کہ ان ہی دنوں میں یوں تو عموماً سفر کے مواقع پیش ہی آتے رہتے تھے، لیکن

Toobaa-elibrary.blogspot.com

ان سفروں میں دو سفر ایسے بھی ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ ان کا حال تو ناظرین کو کچھ سنا ہی دیا جائے، شاید اس مضمون کی آخری قسط یہی حصہ ہوگا۔

باب ۱۵

آستانۂ صابری کی زیارت

اب حسب وعدہ اخیر میں اپنے ان چند دلچسپ اسفار کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، جو قیام دارالعلوم کے زمانے میں پیش آئے، واقعہ یہ ہے کہ طالب العلمی کے دنوں میں بھی جب کبھی موقع ملتا، اپنے خاص حالات کے تحت فقیر مدرسے سے باہر نکل جایا کرتا تھا خوب یاد ہے کہ عیدالاضحی کی تعطیل مدرسہ میں ہوئی، اچانک خیال آیا کہ اس تعطیل سے نفع اٹھانا چاہئیے، کلیر شریف آستانۂ صابری کی زیارت کے لئے روانہ ہوا! رڑکی کے اسٹیشن سے اتر کر گٹھری بغل میں دبائے، نہر کے کنارے کنارے بہتے ہوئے صاف شفاف پانی کی دید سے لذت اندوز ہوتا ہوا پیران کلیر شریف پہونچ گیا، لوگوں سے سن تو چکا تھا کہ روضۂ صابریہ آبادی سے باہر جنگل میں ہے لیکن یہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ کلیر کی آبادی نہر کے اس پار غالباً بجانب شمال واقع تھی، اور نہر کے جنوبی ساحل پر عمارتوں کا طویل وعریض سلسلہ حضرت والا کے روضہ کے اردگرد پھیلا ہوا تھا مگر روضۂ طیبہ کے سوا جہاں تک میرا خیال ہے، کوئی دوسری آبادی آس پاس نہ تھی، اسی روضہ میں داخل ہوگیا، روضہ پر پہونچ کر حسب دستور فاتحہ خواں ہوا، قرآن کی تلاوت میں مشغول تھا، رُخ میرا قبلہ کی طرف تھا، دیکھا کہ کوئی صاحب پیچھے سے آگئے، اور ڈانٹ رہے ہیں کہ تیری پشت روضۂ مبارک کی طرف ہے، اس کا بھی تجھے خیال نہیں ہے، میں نے

Toobaa-elibrary.blogspot.com

عرض کیا کہ مسجد میں بیٹھنے کی طبعی صورت یہی ہو سکتی ہے، جس طرح میں بیٹھا ہوا ہوں پھر میں نے کہا کہ آپ تو صوفی ہیں اور صوفیوں کا مشہور نظریہ یہ ہے کہ ے

ہر جا کہ نظر کردم سمائے تو می بینم

اور ظاہر ہے کہ بزرگوں کی ساری بزرگیاں، اسی ذات بزرگ و برتر کے ساتھ وابستہ ہیں، جو ہر جگہ ہر شخص کے ساتھ ہے، پھر تو نہ بیٹھنے ہی کی کوئی شکل باقی رہتی ہے اور نہ لیٹنے کی. سمجھ گئے کہ کوئی وہابی المزاج آدمی ہے، بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے.

اس کا خیال ہی نہ تھا کہ اس ویرانے میں کھانے والے کا نظم ممکن ہوگا، سوچ رہا تھا کہ گرسنگی کا تقاضا جب ناقابل برداشت حد تک پہونچ جائیگا، تو نہر کے پار جس پر پل تھا کسی بھٹیارے وٹیارے کی دوکان کو جھانکوں گا، لیکن ابھی تقاضے کا آغاز ہی ہوا تھا، کہ دیکھا ایک صاحب آرہے ہیں، چند چپاتیاں اور مسور کی دال پیالے میں لے کر پہونچے اور بولے جب تک تیرا قیام یہاں رہے گا یہ خوراک تجھ تک پہونچتی رہے گی، کھانا لے لیا گیا، اور ان ہی کے سامنے جہاں پہنچا تھا پہنچا دیا گیا. وہی صاحب شاید کہیں سے پانی بھی لے آئے، ٹھنڈا خوشگوار تھا شکر کے ساتھ خورد و نوش کے اس فرض کو ادا کر کے اپنے کام میں مشغول ہو گیا.

قیام کی مدت کتنی تھی، اب یاد نہ رہی، لیکن صبح کی نماز کے لئے نہر کے کنارے وضو کرنے کا پُر لطف منظر بھلایا نہیں جا سکتا. جب تک قیام رہا وہی چند چپاتیاں اور مسور کی دال والا راشن مجھ تک پہونچتا رہا. بظاہر خانقاہ میں وارد و صادر لوگوں کے لئے اس کا انتظام تھا، اب ہے یا نہیں، لیکن اسوقت میری سمجھ میں یہی آیا تھا، خانقاہ کے مختلف حجروں میں کچھ لوگ جو باہر سے آئے ہوئے تھے، ان پر بھی نظر پڑتی تھی، لیکن ظاہر ہے میرا تو مذہب ان لوگوں سے میل جول سے مانع تھا، حتیٰ کہ اس کی تلاش بھی کبھی پیدا نہ ہوئی کہ یہاں کے سجادہ نشین صاحب یا خانقاہ کے ناظم صاحب کون ہیں

اپنا رشتہ تو صاحب مزار سے تھا، جہاں تک ممکن تھا، قرآن مجید کی تلاوت کا ثواب حضرت والا کی روح پاک کو پہونچاتا رہا، تاآنکہ عید کا دن اسی مسافرت کی حالت میں آگیا، شاید کرتا پاجامہ کا ایک جوڑا اپنی گٹھری میں تھا، نکال لیا اور اسی ویرانی علاقے میں خانقاہ کے احاطے ہی میں غالباً نماز اور خطبہ ہوا، شریک ہوا، اسوقت دور سے سجادہ نشین صاحب پر نظر پڑی، کسی نے کہا یہی سجادہ صاحب ہیں، کافی معمر آدمی تھے

ایمان سوز نظارہ

وہی سجادہ نشین صاحب جو عبا جبہ اور عمامہ زیب تن کئے ہوئے تھے، اور صورت سے ثقہ اچھے پڑھے لکھے آدمی معلوم ہو رہے تھے لیکن یہ دیکھ کر میری روح کانپ گئی، سنسنی سی کیفیت سارے جسم پر طاری تھی، جب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ نماز سے فارغ ہو کر، بایں ریش و فش عبا و عمامہ روضے کے سامنے وہی پہونچے اور ان کی وہی پیشانی، جو ابھی کچھ دیر پہلے آسمان و زمین کے خالق کے سامنے سے اٹھی تھی، اللہ اللہ کتنا ایمان سوز نظارہ تھا کہ اسی پیشانی کو روضۂ پاک کے سامنے رکھتے ہوئے، اپنی ساتوں ہڈیوں کو جن پر نمازوں میں سجدہ کیا جاتا ہے، وہ سر بسجود تھے.

ساری عمر جن بزرگوں کی صرف اسی جد و جہد میں گزری کہ آدم کی اولاد کے ماتھوں کو مخلوقات کے سامنے سے ہٹا کر براہ راست خالق کائنات کے آگے ڈال دیا جائے، اسی راہ میں وہ سب کچھ انھوں نے کیا جو وہ کر سکتے تھے، لیکن انھیں کے اخلاف ان خوش فہمیوں میں مبتلا ہو گئے کہ یہ جو کچھ بھی کیا گیا تھا، اسی لئے کیا گیا تھا کہ اللہ کے بندوں کو اپنا بندہ بنا لیا جائے.

قرآن میں وہ یہ بھی تلاوت کرتے تھے اور اب تک کر رہے ہیں.

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ

Toobaa-elibrary.blogspot.com

عبادا لی من دون اللہ ولکن کونوا ربانیین بما کنتم تعلمون الکتاب وبما کنتم تدرسون ۝ ولا یامرکم ان تتخذوا الملٰئکۃ والنبیین اربابا ایامرکم بالکفر بعد اذ انتم مسلمون۔ (سورہ آل عمران) کسی آدمی کو جسے اللہ نے کتاب دی اور حکم و نبوت عطا کی یہ حق نہیں ہے کہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم میرے بندے بن جاؤ۔ (بلکہ ان کو اس کام کا حکم دیا گیا ہے کہ) کتاب جو تم پڑھاتے ہو اور درس دیتے ہو، اسی کے علماء ربانی بنے رہو، اور نہ خدا نے اس کا حکم دیا ہے کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو تم لوگ اپنا رب اور پروردگار بنالو، کیا خدا تمکو کفر کا حکم تمہارے مسلمان ہوجانے کے بعد دے گا۔

لیکن باوجود اس کے خود بھی یہی باور کرتے ہیں، اور دوسروں کو باور کراتے پھرتے ہیں کہ اللہ کے اولیا، اور دوستوں کو خوش کرنے کی تدبیر یہی ہے کہ انکو اپنا رب بنالیا جائے، اور ان کے ساتھ وہی سب کچھ کیا جائے جس کا مستحق خالق کے سوا کوئی نہیں۔

اللہ اللہ، جس وقت اللہ کے ایک برگزیدہ ولی کے مزار کے آگے یہ سجدہ ہو رہا تھا، میرا خون کھول رہا تھا، کاش سجدہ کرنیوالے صاحب کو یہ دکھانے کی قوت مجھ میں ہوتی کہ نفرت و ملامت بلکہ کہہ سکتا ہوں کہ لعنت کا کتنا بڑا طوفان، صاحب مزار کی روح مبارک سے نکل کر، سجدہ کرنیوالے اور ان کے سجدے کا احاطہ کئے ہوئے تھا، وہ سمجھ رہے تھے کہ میں ان کو خوش کر رہا ہوں، لیکن ایمانی بصیرت ان کی اگر روشن ہوتی، تو دیکھ سکتے تھے کہ سجدہ کر کر کے صاحب مزار کو یہ سجدہ کرنے والے کتنی غیر معمولی اذیت اور دکھ میں مبتلا کر دیتے ہیں وہ ان کی دعاؤں سے مستفید ہونا چاہتے ہیں، مگر کون سمجھتا ہے کہ بجائے دعا کے ان کی بددعاؤں کا نشانہ اپنے آپ کو وہ بنا لیتے ہیں، ان لوگوں کی سمجھ میں اتنی بات بھی نہیں آتی کہ الملٰئکہ یعنی فرشتوں تک کی امداد کو قرآن میں انھیں لوگوں کے لئے مختص کر دیا

گیا ہے جن کی صفت قرآن ہی میں جب یہ بیان کی گئی ہے کہ ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا۔ جنھوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اسی پر ڈٹ گئے، بدرجہا انھیں روحانی ہستیوں یعنی ملائکہ کی امداد کا تماشا اپنی آنکھوں سے ان لوگوں نے دیکھا تھا جنھوں نے خالق السمٰوات والارض کو اپنا رب بنالیا تھا، اور اسی پر ڈٹے ہوئے، جمے ہوئے تھے، روحانی قوتوں سے استفادہ کی واحد شکل یہی ہے جس حد تک کائنات کے خالق و مالک سے جو قریب ہوگا، اسی حد تک خدا اور خدا کے مخلوقات بھی اس سے قریب ہوتے ہیں من لہ الولی فلہ الکل" جو خدا کے لئے ہوجاتا ہے، اس کے لئے خدا کی ہر چیز بنتی چلی جاتی ہے، اس کی مدد خدا کے فرشتے بھی کرتے ہیں اور حکم ہوتا ہے تو اس کی اعانت کے لئے دوسری روحانی ہستیاں بھی بھیجی جاتی ہیں لیکن فرشتوں اور ملائکہ کو پوج کر ان کی امداد سے پوجنے والے قریب نہیں بلکہ دور ہی ہوتے چلے جاتے ہیں، رحمت و شفقت کے نہیں بلکہ ان کی لعنتوں اور پھٹکاروں ہی کے مستحق خود بخود اپنے آپکو بناتے چلے جاتے ہیں۔

سورۃ البقرہ کی آیت (والٰھکم الٰہ واحد لا الٰہ الا ھو الرحمٰن الرحیم) تمہارا الٰہ (معبود) ایک ہی ہے، کوئی اس کے سوا نہیں ہے وہی سب سے زیادہ مہربان اور سب سے زیادہ رحم کرنیوالا ہے، سے پہلے پڑھئے، آپ کو یہ الفاظ ملیں گے ان الذین کفروا وماتوا وھم کفار اولٰئک علیھم لعنۃ اللہ والملٰئکۃ والناس اجمعین خالدین فیھا لا یخفف عنھم العذاب ولا ھم ینظرون۔ جنھوں نے یہ بات نہ مانی اور مر گئے، اور اسی حال میں کہ وہ نہ ماننے والے تھے، ان پر اللہ کی لعنت، فرشتوں کی لعنت اور عام انسانوں کی لعنتیں برستی ہیں، اور انھیں لعنتوں میں وہ ہمیشہ رہیں گے، نہ ان کا دکھ ہی کم ہوگا، اور نہ وہ ڈھیل دیئے جائیں گے۔

Toobaa-elibrary.blogspot.com

بہر حال خدا اپنے بندوں کی امداد آفتاب سے بھی کر رہا ہے اور ماہتاب سے بھی، ہوا سے بھی، پانی سے بھی، لیکن ان مخلوقات سے استفادہ کا یہ طریقہ کہ انھیں کو پوجا جائے۔ اور ان ہی کو معبود بنا لیا جائے، اسی کا نام شرک ہے، اور توحید یہی ہے کہ جس کا سب کچھ ہے، جو کچھ بھی مانگا جائے، اسی سے مانگا جائے، اسی کے آگے گڑگڑایا جائے۔ اور یقین رکھا جائے کہ وہی چاہے گا تو اپنی مخلوقات سے ہمیں فائدہ پہونچا سکتا ہے، اس سلسلے میں روحانی مخلوقات ہوں یا غیر روحانی سب کا یہی حال ہے، ونعم ما قیل

از خدا خواہم وز غیر نخواہم بخدا
کہ نیم بندہ غیر و نہ خدائے دگر ست

خدا ہی سے مانگتا ہوں، بخدا غیر سے نہیں مانگتا، کیونکہ میں کسی اور کا بندہ نہیں ہوں، اور نہ کوئی دوسرا خدا ہے۔

مَاكَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ۔ (سورہ یوسف)

ایک کا فقیر بنا دینے کے بعد سارے جہان کی فقیری سے توحید آدمی کو بے نیاز کر دیتی ہے، یقیناً یہ خدا تعالیٰ کا بڑا فضل ہے۔ بہر حال قصہ تو سات ہڈیوں پر کئے جانے والے سجدہ کا بیان کر رہا تھا، سجادہ صاحب دیر تک ٹھیک نماز والے سجدہ کی طرح مزار مبارک کے آگے سربسجود رہے، اس حال کو دیکھ کر دل اتنا پریشان ہوا کہ اسی وقت خانقاہ سے جی چاہا کہ نکل جاؤں۔

اسی کلیر شریف کا وہ روایتی قصہ یاد آ رہا تھا کہ پوری مسجد ہی لوگوں پر گر پڑی تھی، بار بار دھیان جاتا تھا کہ شاید اسی قسم کی جسارتیں، حق تعالیٰ سبحانہ کے غصے کو بھڑکاتی ہیں، کہیں پوری خانقاہ کے نیچے ہم لوگ بھی نہ دبا دیئے جائیں۔

للّٰہی ضیافت

نمازیوں میں آس پاس کے دیہاتوں سے بھی کچھ لوگ آ گئے تھے، ان میں ایک صاحب غالباً پردیسی مسافر خیال کر کے میری طرف بڑھے، اور پوچھنے لگے کیسے آنا ہوا، اور اب کیا ارادہ ہے، جو کچھ واقعہ تھا عرض کر دیا گیا، انھوں نے میرے ہاتھ پکڑ لئے، اور اصرار کرنے لگے کہ تجھے میرے ساتھ چلنا پڑے گا، اور ساتھ لے چلے ہیں بھی ساتھ ہو لیا، خانقاہ مبارک سے کچھ فاصلے پر دیکھا کہ کھیتوں کے درمیان کوملوں کا ایک مکان بنا ہوا ہے، دیواریں بھی خام مٹی کی تھیں لیکن صاف ستھرا تھا، اس میں لے کر پہونچے، معلوم ہوا کہ یہ ان کا مزرعہ ہے جہاں وہ خود کاشت کرتے ہیں، مکان بھی بنا لیا ہے، اسی میں رہتے ہیں، کچھ بیل اور کچھ بھینس بھی ادھر ادھر نظر آئیں، الغرض گھر سے لبریز خوانچہ میں کھانا لائے، جس میں نمکین غذاؤں کے ساتھ سویاں اور خالص دودھ کی بالائی سے لبریز پیالہ بھی تھا، یوں مسافرت میں مسافر نوازی جو قطعاً للّٰہ تھی اس کی ایک زندہ شہادت میرے سامنے آئی، وہ صاحب کون تھے، نہ ان کا نام ہی یاد ہے، اور نہ یہ معلوم ہے کہ بیچارے اس دنیا میں ہیں، یا جہاں جانے کے لئے دنیا میں لوگ آتے ہیں، وہیں جا چکے

کلیر سے منگلور

کھانے پینے کے جنتی کام سے فراغت کے بعد ان ہی سے پوچھا کہ منگلور نامی قصبہ کا، اس علاقے میں کس طرف سے راستہ ہے۔ انھوں نے بتا دیا، اور کچھ دور رخصت کرنے کے لئے بھی شاید ساتھ رہے، جب وہ پلٹ گئے، تو خوب یاد ہے کہ بندے نے جوتے بھی پاؤں سے نکال لئے۔ اور اپنی گٹھری میں ان کو باندھ لیا، گٹھری کبھی بغل میں رہتی، اور جب تھک جاتا تو یاد آتا ہے کہ سر پر بھی اس گٹھری کے اٹھانے کا شرف حاصل ہوتا رہتا۔ مجھے اب بھی معلوم نہیں کہ کلیر شریف سے منگلور کا فاصلہ کتنا ہے لیکن آفتاب جب غروب ہو چکا تھا، افتاں و خیزاں کسی نہ کسی طرح منگلور تک پہونچے میں

Toobaa-elibrary.blogspot.com

کامیاب ہوگیا، نماز غالباً راستے میں پڑھ لی تھی، اب خیال نہیں رہا کہ عشاء کی نماز ہوچکی تھی یا نہیں ہوئی تھی، تھکا ماندہ ایک مسجد میں، جو سب سے پہلے سامنے آئی اسی میں گھس گیا، گٹھری حالانکہ کچھ وزنی نہ تھی، لیکن زندگی میں باربرداری کی مشق کا میرے لئے شاید یہ پہلا موقع تھا۔ یہ گٹھری میرے لئے وبالِ جان بنی ہوئی تھی، رات ہوچکی تھی مسجد میں داخل ہوتے ہی گٹھری صحنِ مسجد میں پٹک کر لوٹا پانی کیلئے ڈھونڈ رہا تھا، لوٹا ملا بھی نہ تھا کہ اچانک مسجد کے حجرے سے برآمد ہونے والے ایک صاحب پر نظر پڑی، جو کڑکتے گرجتے، میری گٹھری کی طرف بڑھے، اور ہاتھ میں لیکر اسے صحنِ مسجد سے باہر پھینک دیا، اور فرما رہے تھے کہ اس قسم کے لوگ مسجدوں سے جانماز چرا لے بھاگتے ہیں، سقایے توڑ دیتے ہیں، اور طرح طرح کی باتیں وہ نوواردِ مسافروں کی جو مسجدوں میں گھس جاتے ہیں، ان کے نام سناتے رہے، لوٹا بھی نہ ملا اور ہوش و حواس بھی ان صاحب کے طرزِ عمل سے جاتے رہے، تھکا ماندہ جسم چور چور، اس پر مسافر نوازی کا یہ نظارہ دل بھی چور ہوگیا گٹھری جو باہر پھینک دی گئی تھی، اس کو لینے کے بعد آگے بڑھا، اور بغل میں دبا کر چپ چاپ کچھ عرض کئے بغیر مسجد سے باہر نکل گیا

اس قلندری رنگ سے کام نہ چلے گا

مسجد سے باہر نکل گیا، دماغ کچھ سوچنے لگا، دل نے یہ فیصلہ کیا کہ اس قلندری رنگ سے کام نہ چلے گا۔ چنانچہ آگے بڑھ کر میں نے گٹھری سے جوتے بھی نکال لئے اور ہلکا سا ایک عمامہ بھی اس میں تھا، اس کو نکال کر سر پر باندھا ایک اچھے خاصے ملا یا نیم ملا کی شکل نکل آئی، راستہ میں کچھ لوگ ملے، پوچھا کہ بڑی مسجد کہاں ہے؟ میں نے پوچھا یا کسی نے خود پتہ دیا، بہرحال بڑی مسجد تک اپنی باضابطہ ملائیت کے لوازم کے ساتھ داخل ہوا، ایک دو صاحب موجود تھے سلام و کلام ہوا، پہلی مسجد جس سے نکالا گیا، ڈرا ہوا تھا، رسمی الفاظ کے بعد دارالعلوم

دیوبند کی طرف منسوب کرتے ہوئے اپنا تعارف ان صاحبوں سے کرانے میں جلدی سے میں نے کام لیا، دیوبند کے لفظ نے، دیکھا کہ آنکھوں میں سب کے اس کی کیفیت پیدا کر دی، احترام و اکرام کی اب کیا کمی تھی، مسجد میں ایک معقول جگہ میرے ٹھہرنے کے لئے بتا دی گئی، تھوڑی دیر کے بعد ان ہی صاحبوں میں سے کوئی صاحب خوانچہ لئے ہوئے حاضر ہوئے، تھا تو اس میں ماحضر ہی، لیکن جس نے مشکل ہی سے چند میلوں کا سفر پیدل کیا ہو آج خدا جانے کلیر سے منگلور تک کتنے میل پیدل طے کر کے پہونچا تھا، اس ماحضر کا لطف حافظہ میں اب تک تازہ ہے، قیام گاہ بھی کافی آرام بخش تھی، خوب نیند آئی، راستہ میں خستگی کا کوئی اثر صبح کو باقی نہ تھا، منگلور کس لئے گیا تھا، پہونچنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ غرض یہاں پوری نہیں ہوسکتی، دوسرے دن دیوبند لوٹ آیا۔

اس سفر کا بشرطیکہ اس کو سفر کہا جائے، طالب علمی کے عہد سے تعلق تھا، ذکر اس کا جب چھڑ ہی گیا۔ تو کچھ لکھ دیا گیا، تذکرہ اپنے جن دو اسفار کا کرنا تھا، ان کا تعلق ان دنوں سے ہے جب طالب علمی کے دائرے سے نکل کر مدرسہ کے طبقۂ خدام میں یہ فقیر شریک ہوچکا تھا، اس زمانہ میں بکثرت مختلف اغراض و مقاصد کے ماتحت اطراف و جوانب کے شہروں اور قصبوں میں جانا پڑتا تھا، مجالس میں تقریر و وعظ کیلئے یا دارالعلوم سے جن مدارس کا تعلق تھا، ان میں امتحان کے لئے مدرسہ سے یہ فقیر کبھی تنہا، کبھی دوسرے علماء کے ساتھ بھیجا جاتا تھا، اس سلسلہ میں بریلی، بجنور، نگینہ، دہرہ دون، فیروز پور، حصار، اور کہاں کہاں جانا ہوا، پورے طور پر یاد بھی نہ رہا بعض دلچسپ لطیفے اور یاد رہ جانے والے تجربوں اور مشاہدوں سے بھی سابقے پڑے، مگر ان کے لئے تو کسی الگ مضمون ہی کی ضرورت ہوگی، اس وقت اپنے وعدے کو پورا کرنے کیلئے دو خاص سفروں کا ذکر کر کے آخر میں اس سفر کے تذکرے پر ان شاء اللہ یہ مضمون ختم کر دیا جائے گا جس کے بعد دارالعلوم کے احاطہ ہی سے باہر نکل گیا۔

Toobaa-elibrary.blogspot.com

باب ۱۶

گروکل کانگڑی کا سفر

جو جانتے ہیں، وہ تو خیر جانتے ہیں، لیکن جو نہیں جانتے، ان کے لئے اتنا اجمالی بیان غالباً کافی ہوگا کہ پنڈت دیانند سرسوتی اور ان کے ماننے والوں نے آریہ سماج کے نام سے ایک جماعت بنائی تھی، اس جماعت نے ہردوار کے قریب کانگڑی کے جنگلی گاؤں کے قریب ایک خاص قسم کی تعلیم گاہ بھی قائم کی تھی جو اسوقت تک موجود ہے، بنیادی طور پر تو یہ ایک مذہبی مدرسہ ہے لیکن ان کے مضامین و مقالات سے معلوم ہوتا تھا کہ ہندو مذہب کے قدیم علوم و فنون اور سنسکرت بھاشا کے ساتھ ساتھ جدید علوم اور سائنس وغیرہ کے سیکھنے سکھانے کا نظم بھی بیان کیا گیا ہے، دل میں ہوس تو زمانے سے تھی کہ اس نئی مذہبی تعلیم گاہ کو آنکھوں سے دیکھتا جس ماحول میں میری تعلیمی زندگی گزری تھی، اس کے لحاظ سے یہ خیال تھا تو عجیب و غریب، ٹھیٹ پرانے عربی مدارس کے سوا جس نے آج تک ایک دن کے لئے بھی کسی جدید تعلیم گاہ میں قدم نہ رکھا ہو، اس کے دل میں کانگڑی کے گروکل کے دیکھنے کا شوق کیوں اور کیسے پیدا ہوا، لیکن بہرحال شوق پیدا بھی ہوا، اور بڑھتا بھی چلا گیا۔ اس عرصہ میں متعدد بار دہرہ دون

ہری دوار کے اسٹیشن سے بھی گزرنا پڑا، معلوم ہوا کہ گروکل کانگڑی جانے کیلئے ہردوار ہی اترنا پڑتا ہے، آخر ایک دفعہ جب کسی ضرورت سے فقیر رڑکی پہونچا، یہ طے کر لیا کہ کچھ بھی ہو، گروکل تک مجھے پہونچنا چاہیئے، رڑکی میں بعض لوگوں سے اس خیال کو میں نے ظاہر کیا ان میں سے کچھ سن رسیدہ لوگوں نے کہا کہ اولاً تو تنہا جانا قرین مصلحت نہیں: ثانیاً یہ برسات کا موسم ہے، جہاں تک ہم جانتے ہیں ہردوار سے کانگڑی تک جانے میں، بہت سے چھوٹے بڑے نالوں سے گزرنا پڑے گا لیکن وہ وقت ہی اور تھا، اپنی شبابی امنگوں کو سوچتا ہوں تو سر بہ گریباں ہو جاتا ہوں کیا میں ہی وہ تھا جس کے لئے سفر اور سفر کی صعوبتیں اور دشواریاں سب سے زیادہ دلچسپ اور خوشگوار مشغلوں کی حیثیت رکھتی تھیں، اپنے مخلص مشیروں کی بات نہ مانی، رڑکی کے ایک بوڑھے بزرگ نے کان میں آکر کہا کہ کم از کم اپنی مولویت کو اس سفر میں چاہئے کہ نمایاں نہ ہونے دیا جائے، میں نے عرض کیا کہ پھر کیا کروں؟ بولے ابھی تو نہیں لیکن جب گروکل کے قریب پہونچ جاؤ تو عام مسلمانوں کی طرح لنگی یا دھوتی باندھ لینا، اور کھانے میں اپنے ساتھ صرف اس قدر رکھنا جو میں تمہارے ساتھ کر دوں

گاڑی جو ہردوار جانے والی تھی، اس پر سوار ہونے کے لئے اسٹیشن آیا، تو دیکھا وہی بزرگ اپنے ساتھ کپڑے میں باندھے ہوئے کچھ چیز لا رہے ہیں، یہ چند موٹی موٹی روٹیاں اور آلودوں کے بھرتے سے بھرا ہوا ایک پیالہ تھا، میرے حوالے اسی کو انھوں نے کر دیا۔ تام چینی کا ایک جگ یا تام لوٹ بھی یہ دیکھ کر ساتھ کر دیا تھا کہ لوٹا میرے ساتھ کسی وجہ سے اس سفر میں نہ تھا، سامان میں بستر کے سوا طبقات ابن سعد کی ایک جلد تھی، رات کے وقت شاید آٹھ نو بجے ہردوار اسٹیشن پر گاڑی پہونچی، یوں تو متعدد بار ہردوار کے اسٹیشن سے گزر چکا تھا یہ تو

Toobaa-elibrary.blogspot.com

دیکھا تھا کہ کافی ہجوم اس اسٹیشن پر ہوتا ہے لیکن جب اترنے کی نیت سے میں نے بھی بستر لپیٹ کر پلیٹ فارم پر قدم رکھا، تو کان میں ہندوستان کے ہر صوبے اور ہر ضلع کی آوازیں گونجنے لگیں، پکارنے والے ان ہی علاقوں کا نام لیتے تھے اور سمٹ سمٹ کر مسافروں کی ٹولی مختلف پکارنے والوں پر جمع ہو رہی تھی، آخر یہ کیا قصہ ہے؟ پتہ چلا کہ ہر دوار کے پنڈے ہیں، سارا ہندوستان ان پر بٹا ہوا ہے، ملک کا جو علاقہ جس کے حصے میں آیا ہے، اس ضلع کے رہنے والے تیر تھی اسی کے خاص ججمان ہیں، وہی ان کو اپنے ساتھ لے جائے گا، گویا انکی حیثیت بلاشبہ غالباً وہی ہے، جو مطوفین کی ہوتی ہے اور مکہ مکرمہ میں جس کا تجربہ پہلے ہوتا تھا، اب تو سعودی حکومت نے تقسیم کے اس قصے کو ختم کر دیا ہے، ورنہ سنا ہے کہ ہندوستان ہی کو نہیں ساری اسلامی دنیا کو مکہ معظمہ کے مطوفین نے بانٹ لیا تھا، ممکن نہ تھا کہ ان کے علاقے کا حاجی دوسرے مطوف[1] کے پاس چلا جائے۔

---

(۱) باوجود تلاش اور جستجو کے ابتک اس کا پتہ نہ چلا کہ مکہ معظمہ میں مطوفین کا یہ طبقہ کب سے پایا جاتا ہے، کتابوں میں ان کی تاریخی حیثیت پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی ہے، یا کم از کم میری نظر سے اب تک کوئی ایسی کتاب نہیں گزری ہے، جس میں تشفی بخش جواب اس سوال کا دیا گیا ہو۔ اسلام سے پہلے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ کے رہنے والے، آنے والے حجاج کی راحت و آسائش خورد و نوش کا نظم اپنی طرف سے کرتے تھے، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا معاوضہ حجاج سے نہیں لیتے تھے، بلکہ قریش کے خاندانوں میں مقابلہ ہوتا تھا کہ حجاج کی خدمت میں کون سبقت لیجاتا ہے، اسلام کے بعد مکہ کے شرفا کا بسط و تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے لیکن مطوفیت بطور روزگار اور پیشہ کے لوگوں نے کب اختیار کیا، اس کا پتہ نہیں چلا، کبھی کبھی وہم پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان ہی کی ریس میں تو اس سلسلے کا آغاز تو کہیں نہ ہوا ہو؟ (باقی اگلے صفحہ پر)

بہرحال تقسیم و توزیع کا یہ سارا کاروبار ختم ہو گیا، اپنے اپنے مملوکہ علاقوں کے ججمانوں کو پنڈے اپنے ساتھ لے گئے۔ ابتدا میں میری طرف بھی کوئی صاحب یہ پوچھتے ہوئے بڑھے کہ تم کہاں سے آرہے ہیں، لیکن یہ جواب سنکر کہ بندہ تو مسلمان ہے، سر جھکائے وہ واپس ہو گئے۔ اسٹیشن خالی ہو گیا، جہاں اتنا بڑا ہجوم تھا وہاں ہو کا عالم قائم ہو گیا، اسٹیشن کے چند ملازمین کے سوا کوئی باقی نہ رہا، مگر ایک وہی جو کسی کے کام کا نہ تھا، گاڑی روانہ ہو چکی تھی واپسی کا موقع بھی باقی نہ تھا، اب تو بہرحال رات ہر دوار ہی میں گزارنی ہے، طے کر کے بستر کو بغل میں دبائے اسٹیشن سے باہر نکلا، سامنے ایک لمبی چوڑی عمارت تھی معلوم ہوا کہ سرائے ہے، جس میں مسافر ٹھہرتے ہیں، دل خوش ہوا کہ رات اسی میں بسر ہو جائیگی لیکن جو منگلور میں مسجد سے دھتکار کر نکال دیا گیا تھا اس کے ساتھ دیکھئے دیر میں کیا صورتِ حال پیش آتی ہے، یہ شعر تو اس وقت نظر سے نہیں گزرا تھا لیکن شاید حال یہی تھا۔

اے برہمن بارده رد کردهٔ اسلام را
یا چو من گمراه را در بتکده ہم راه نیست

اے برہمن جس کو اسلام نے رد کر دیا ہے، تم تو اسے جگہ دے دو، یا یہ کہ مجھ جیسے گم کردۂ راہ کی بت خانہ میں بھی گنجائش نہیں ہے۔

قسمت کی خوبی ملاحظہ فرمائیے، یہاں سے بھی وہ در در راہی دیا گیا، جوں ہی سرائے کے دروازے پر پہونچا، دربان تھا یا کون، اس نے درشت لہجے میں کہا

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) مطوفیت کے جو خاندان آج کل مکے میں پائے جاتے ہیں، تحقیق سے معلوم ہوا کہ ان میں کافی تعداد ان لوگوں کی ہے جن کے آبا و اجداد ہندوستان ہی سے مکہ معظمہ پہونچے تھے، چند پشتوں کے بعد اب وہ عرب معلوم ہوتے ہیں، واللہ اعلم کسی صاحب کو علم ہو تو اس موضوع پر اپنی معلومات شائع کرائیں۔

Toobaa-elibrary.blogspot.com

آپ لوگوں کے لئے اس سرائے میں کوئی جگہ نہیں، مولویت تو چھپا بھی سکتا تھا، لیکن اسلامی علامات پھر بھی چہرے سے پھوٹے پڑتے تھے، اب کیا کروں، الٹے پاؤں پھر اسٹیشن ہی کی طرف لوٹ آیا، اسٹیشن میں پہلے سے زیادہ سناٹا تھا، لوگ اپنی اپنی آرام گاہوں میں جا چکے تھے، گرمی، بلکہ برسات والی گرمی اسکے ساتھ تھی، اسٹیشن کے اندر دل سونے پر راضی نہ ہوا، آج خیال آتا ہے اپنی اس بے تکلفی اور جرائت کا کہ بغیر کسی وسوسہ اور دغدغہ کے بستر اسٹیشن کے احاطہ ہی میں غالبًا کسی درخت کے نیچے شطرنجی بچھا کر تکیہ سرہانے رکھ کر نماز پڑھنے کے بعد سو گیا، اور رات بھر سوتا رہا، کسی نے چھیڑا نہیں، یہ تو خیر اب بھی ممکن ہے لیکن دل میں کسی قسم کا خیال نہ آیا، حیرت اس پر ہو رہی ہے۔

صبح ہوئی، اسٹیشن ہی پر پانی بھی مل گیا، اور درخت کے نیچے بستر ہی پر جا نماز بچھا کر صبح کے دوگانے سے فارغ ہوا، بستر کو لپیٹ کر بغل میں دبا کے پھر اسی سرائے کے دروازے پر پہونچا جس سے نکالا گیا تھا، خیال ہوا کہ کچھ نہیں تو بستر کے بوجھ سے تو نجات حاصل کر لینی چاہیئے، اس وبالِ بغل سے، جو عنقریب وبالِ دوش بننے والا تھا، اس سے نجات کی صورت یہی سمجھ میں آئی سرائے کے اس دربان سے لجاجت تمام و سماجت با احترام کے ساتھ عرض رسا ہوا کہ کچھ نہیں بھائی تو میرے بستر کو تو آپ اس سرائے میں جگہ دے سکتے ہیں بندھا ہوا ہے کسی جگہ ڈال دیجئے، اور جو کرایہ فرمائیے گا، ادا کر دوں گا، کچھ سوال و جواب کے بعد آخر وہ بیچارہ آدمی تھا نرم پڑ گیا، اور بستر کے رکھ لینے پر راضی ہو گیا، غالبًا دو آنے چوبیس گھنٹے کے لئے کرایہ بستر کے رکھ لینے کا لگایا گیا جو منظور کر لیا گیا۔

اب میں آزاد تھا ساتھ میں صرف وہی زادِ راہ (روٹی اور بھرتے والا) رہ گیا، اور طبقات ابن سعد، سرائے میں کتاب چھوڑنے پر دل راضی نہ ہوا، کیا معلوم کہ بستر

واپس ملے گا یا نہیں، بستر سے تو صبر بھی کر سکتا تھا، لیکن طبقات ابن سعد کی اس جلد پر صبر کی صورت ہی کیا تھی؟ دھوتی بھی ساتھ رکھ لی گئی، انہیں سب کچھ لپیٹ لیا اور لوگوں سے دریافت کرنے لگا کہ گروکل کانگڑی جانے کا راستہ کیا ہے؟ تھوڑی دیر بھٹکتا ہی رہا، ہردوار میں ایک حصہ آبادی کا، جو دریائے گنگا کے کنارے کنارے دور تک پھیلا ہوا ہے کنکھل کے نام سے موسوم ہے، اسی آبادی میں دور تک چلا گیا ہے، لوگوں سے پوچھتا کہ میں گروکل جانا چاہتا ہوں، صحیح جواب کوئی نہ دیتا، بہت سے لوگ تو میری اسلامی شکل و صورت کی وجہ سے منہ پھیر کر بات کرنے میں بھی محسوس ہوا کہ مضائقہ کر رہے ہیں، ایک نیک دل سادھو مزاج آدمی سامنے آیا میری طرف متوجہ ہوا، اور سمجھا کر اس نے راستے کے سارے آتے پتے سے مجھے واقف کیا، بولا کہ تم غلط راہ پر پڑ گئے ہو، واپس جاؤ، فلاں مقام پر پہونچو، وہاں کشتی جو مسافروں کو گنگا پار کرتی ہے تمہیں ملے گی، اسی پر سوار ہو جانا، پھر آگے یہ ہے، وہ ہے، الغرض اس غریب انسانیت کے ہمدرد سے جو کچھ بھی ممکن تھا سب ہی کچھ اس نے کیا، پلٹا اور گھاٹ جہاں کشتی کھڑی ہوتی تھی، پہونچا، بہت سے مسافر اس پار جانے کے لئے تیار تھے، اس پار سرسبز پہاڑوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا، جس کا سرا ہمالیہ سے مل جاتا ہے، اس مقام سے کچھ دور پہاڑوں میں گنگا کا سرچشمہ گنگوتری تک ہے، مختلف مقامات تیرتھ کرنے والوں کیلئے وہاں پائے جاتے ہیں، غالبًا چنڈی نامی دیوی کی تیرتھ کے لئے کشتی کے یہ مسافر گنگا کے اس نالے کو عبور کر کے پار جانا چاہتے تھے، میں گنگا کا لفظ استعمال کر رہا ہوں، جس کا عرض صوبجات متحدہ اور اس کے بعد بہار تک پہونچتے ہوئے میلوں تک پہونچ جاتا ہے اسی گنگا کو ہردوار کے اس گھاٹ کے پاس ایک معمولی ندی کی شکل میں میں نے پایا، چنڈی دیوی کی تیرتھ کرنے والے مردوں اور عورتوں کے ساتھ ایک مسافر گروکل کانگڑی کے ارادے سے کشتی میں بیٹھ گیا، کشتی اچھی خاصی لمبی چوڑی تھی،

Toobaa-elibrary.blogspot.com

مسافروں کی تعداد بھی کافی تھی، کشتی کھول دی گئی، چند ہی منٹ میں دوسرے ساحل پر گنگا کے اس نالے کے ہم پار پہونچ گئے، ہماری کشتی کے رفیقوں کو جس سمت جانا تھا، وہ اس راستے کے مقابل رُخ پر تھا جس پر مجھے جانا تھا، ساحل تک سب ساتھ پہونچے، لیکن اس کے بعد سب دوسری طرف چل دیئے اور تنہا، بالکل تنہا کچھ دیر تو ساحل پر کھڑا دیکھتا رہا، شاید مجھے بھی کوئی رفیق سفر مل جائے لیکن جس راہ پر مجھے چلنا تھا، اس پر جانے والا ان میں کوئی بھی نہ تھا، کشتی والے بھی اپنی کشتی کو لے کر مسافروں کو اتار کر واپس ہو گئے، بتایا گیا تھا کہ سامنے جو گھنا جنگل نظر آتا ہے، اسی میں ایک پگڈنڈی ملے گی، اسی پگڈنڈی پر چلے چلنا گروکل پہونچ جاؤ گے۔

اللہ کا نام لے کر تن تنہا اس جنگل میں گھسا، غالباً یہاں ہی تے لنگی کہیے یا دھوتی باندھ لی، پاجامہ اتار دیا، زادِ راہ اور کتاب والی گٹھری بغل میں تھی، اسی شان کے ساتھ جنگل کی اس پگڈنڈی پر چلنے لگا، ابھی چند ہی قدم چلا تھا، کہ پانی کا ایک نالہ سامنے آیا، اس نالے کے مقابلہ میں جس سے ہم کشتی کے ذریعے پار ہوئے تھے یہ نالہ چھوٹا تھا، اور بہت چھوٹا تھا، جوتے اتار لئے گئے، اور گٹھری کے ساتھ جوتوں کو بھی بغل میں دبائے نالہ میں پاؤں رکھا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن، پانی کاہے کو تھا، پگھلی ہوئی برف تھی، جو پانی کی شکل میں بہہ رہی تھی، خیر جوں توں کر کے اس ٹھنڈک کو تو قطع کر لیا، لیکن اب دیکھتا ہوں کہ قدم جہاں رکھتا ہوں وہیں سے وہ پھسل جاتا ہے، یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ غور کیا تو معلوم ہوا کہ یہ پانی بھی ہمالیہ کی پگھلی ہوئی شاید برف ہی ہے، اور پہاڑوں سے چھوٹے بڑے ٹکڑے پانی کے ساتھ بہہ بہہ کر نامعلوم زمانے سے اس نالے میں بچھ گئے ہیں، ان پر کائی بھی جمی ہوئی ہے اور پانی کے بہاؤ نے ان تمام ٹکڑوں کو گول گول پتھروں کی شکل میں بدل دیا ہے، ظاہر ہے ایسے چکنے سپاٹ کائی لگے ہوئے ٹکڑوں پر قدم جمانا آسان نہ تھا،

کبھی ادھر جھکتا، کبھی ادھر گرتا، تاہم کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے، اس نالے سے تو پار ہو گیا، کچھ دور پھر خشکی ہی میں چلا، پھر وہی برفیلے اور پتھریلے نالے کو اپنے سامنے پاتا ہوں، غالباً دو ایک نالوں سے گزرنا تھا۔ جنگل والی پگڈنڈی پر چل رہا تھا کہ اچانک ہو کے اسی عالم میں آہٹ سی محسوس ہوئی، ایسا معلوم ہوا کہ جدھر میں جا رہا ہوں، اسی طرف سے کوئی آدمی میری طرف آ رہا ہے، اس سے کچھ ڈھارس بندھی، آہٹ کے ساتھ ہی دیکھا کہ واقعی ایک پیر مرد، جس کی داڑھی بھی تھی، اور اکثر بال اس کے سفید تھے، سامنے سے آ رہے ہیں، بہت جلد میرے قریب وہ آ گئے، وہ بھی دھوتی کرتے ہی میں تھے۔ میں نے ان کو دیکھا، انھوں نے مجھ کو، اسی کے ساتھ السلام علیکم کے ساتھ پیش قدمی ان کی طرف سے ہوئی قلب کا سکون بشاشت سے بدل گیا، مصافحہ کی نوبت بھی شاید آئی، اس کے بعد دیکھا کہ وہ مجھ سے پوچھ رہے ہیں، میاں صاحبزادے کدھر جا رہے ہو، کہاں کے ارادے ہیں؟ میں نے عرض کیا، اسی جنگل میں سنا ہے کوئی مدرسہ گروکل نامی ہے، اسی کو دیکھنے جا رہا ہوں، بولے تو اس کے لئے برسات کا موسم تم نے انتخاب کیا ہے، اور وہ بھی اکیلے تن تنہا جا رہے ہو، اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا تھا کہ صورت حال اب تو یہی پیش آ گئی ہے، پھر میری پیٹھ پر دست شفقت پھیرتے ہوئے بولے کہ خیر تم نے بڑی جرأت کی ہے، اب تو آ چکے ہو، چلو تمہیں وہاں تک پہنچا آؤں، خدا جانے تم کدھر بھٹک جاؤ گے، یہ کہتے ہوئے میرے ساتھ بیچارے پلٹ پڑے، اور ہم دونوں ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہوئے چلتے رہے، گروکل کب قائم ہوا؟ کیوں قائم ہوا؟ یہاں کیا کیا ہوتا ہے؟ کچھ اسی قسم کی باتیں وہ مجھ سے کرتے رہے اس کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ اس پیر مرد سے پوچھوں کہ آخر آپ کون ہیں؟ کہاں کے ہیں؟ اپنی باتوں میں مجھے الجھا رکھا تھا، اس کا شاید موقع پیدا ہونے ہی نہ دیا، اسی حال میں ہم دونوں پھر اسی برفیلے پتھریلے نالوں میں سے کسی نالے پر پہونچے،

Toobaa-elibrary.blogspot.com

معلوم ہوا کہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر یہ نالے مسلسل اس راستے میں ملتے چلے جاتے ہیں، نالے کے قریب جب ہم دونوں پہونچے، تو پیر مرد نے مجھ سے پوچھا کہ تمہارے پاس کچھ کھانے پینے کی بھی کوئی چیز ہے، روٹیاں اور آلو کے بھرتے کا پیالہ ساتھ تھا، اسی کی طرف اشارہ کر دیا، بولے تو ٹھہر جاؤ ایک درخت کی چھاؤں میں چکنی چٹان پر مجھے بیٹھا دیا، اور تام لوٹ جو میرے پاس تھا، اس کو لے کر نیچے اترے، نالے کے بہتے ہوئے ٹھنڈے پانی سے اس کو بھر کر لائے، واقعی پانی صاف و شفاف تھا اپنے رومال سے دیکھا کہ انھوں نے بھی چند روٹیاں نکالیں جنکے بیچ میں ماش کی دال بھی تھی، رومال بچھا کر اپنے اور میرے زادِ راہ سے اسی جنگل میں انھوں نے خوانِ نعمت چن دیا۔

ٹھنڈے پانی اور بھوک کے ساتھ غذا کی لذّت، جو اس وقت کام و دہن نے محسوس کی شاید ہی زندگی میں یہ کیفیت کبھی میسر آئی ہو، مشفقانہ طریقہ سے کھلاتے جاتے تھے، خود بھی ایک دو لقمے لئے، کہتے میاں کھالو، خدا جانے، یہ کھانا دانا ملے بھی یا نہیں، کھانا ختم ہو گیا، دونوں آگے چلنے کیلئے تیار ہوئے، نالے میں پاؤں رکھا، وہی پھیلاؤ کا قصہ شروع ہو گیا، کچھ تدبیریں جو ان صاحب کو معلوم تھیں، غالباً سکھائی گئیں، اور ہم نالے کے پار ہو گئے۔

بظاہر یہ برساتی نالے برسات ہی کے موسم میں شاید جاری ہوتے ہیں، اور دنوں میں خشک رہتے ہیں، الغرض نالے سے ہم پار ہوئے اور ان ہی پیر مرد کی رہنمائی میں آگے بڑھتے رہے، غالباً اس نالے کے بعد جس کے کنارے خوانِ نعمت چنا گیا تھا، پھر کوئی نالہ پگڈنڈی کی حد تک تو نہ ملا، کچھ ہی دیر بعد اچانک ہم اس جنگل کے ایک ایسے حصہ میں پہونچ گئے، جو درختوں سے نسبتاً خالی تھا اور دور دور تک سفید سفید کچھ کچھ عمارتوں کے آثار اسی جنگل میں جھلکنے لگے، پیر مرد ٹھٹھک گئے اور مجھے روک کر بولے، لو میاں یہی تمہارا وہ گروکل کانگڑی سامنے

ہی ہے، اب آگے رہنمائی کی ضرورت نہیں ہے، میں تم سے رخصت ہوتا ہوں، محبت اور انس میں ڈوبی ہوئی نگاہوں سے انھوں نے مجھے دیکھا، اور یہ کہتے ہوئے کہ "اللہ کے سپرد تم کو کیا" وہ سلام کر کے روانہ ہو گئے، عمارتوں کا یہ سلسلہ کچھ زیادہ دور نہ تھا، چند ہی منٹ میں اپنے آپ کو میں نے اس مقام پر پہونچا دیا جہاں کافی چہل پہل اور آدمیوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا، چھوٹے بڑے مکانوں کا دور تک ادھر ادھر سلسلہ پھیلا ہوا تھا، زمین کا ایک قطعہ تھا جس کا طول بظاہر چند میل سے زیادہ تھا، لیکن عرض کچھ زیادہ نہ تھا، ایک طرف گنگا کا وہی بڑا نالہ تھا، جس سے کشتی پر ہردوار میں ہم پار ہوئے تھے، اور دوسری طرف معمولی نالہ، اسوقت اس علاقہ کا جغرافیہ کچھ اسی شکل کا دماغ کے اندر آیا تھا، عمارتوں کے حدود میں داخل ہوتے ہوئے دوسری طرف چھوٹے نالے سے گزرنا پڑا تھا اس نالے میں بھی اور اس سے پہلے چھوٹے چھوٹے نالے، بس اس قدر تھے کہ گھٹنوں سے زیادہ پانی کسی میں نہ تھا، ممکن ہے کسی میں کچھ زیادہ پانی رہا ہو لیکن اگر گول مول کائی زدہ پتھروں کا سلسلہ پاؤں کے نیچے نہ آجاتا تو شاید ان نالوں کو حافظہ یاد بھی نہیں رکھتا، ساغر[1] تو میرے ہاتھ میں نہ تھا لیکن رڑکی کے بزرگ کا دیا ہوا تام لوٹ اور انہیں کا بخشیدہ بھرتا کا پیالہ جو کپڑوں میں بندھا تھا، اسکو پیش نظر رکھتے ہوئے کہوں کہ ؎

گٹھری کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

تو یہ واقعہ ہے۔ قدم قدم چلئے تو بھی کئی مرتبہ یہی صورت حال پیش آتی ہے۔ خیر جنگل کی پگڈنڈی بھی ختم ہو گئی۔ اب سامنے کھلا میدان تھا۔ درخت تو اس میں بھی تھے لیکن غالباً کاٹ دیئے گئے تھے۔ ان ہی کو کاٹ کر بیچ بیچ میں ان مکانوں

---

(۱) سودا کے مشہور مصرعے کی طرف اشارہ ہے ؎ ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

Toobaa-elibrary.blogspot.com

کے لئے جگہ نکالی گئی تھی، جس وقت میں گروکل کی اس آبادی کی طرف روانہ ہوا، تو مڑ مڑ کر اچانک راستہ میں مل جانے والے پیر مرد راہنما کو دیکھا جاتا تھا، دل میں طرح طرح کے وسوسے آتے، آخر یہ صاحب کون تھے؟ اس جنگل میں کہاں سے آگئے، لیکن آخری فیصلہ دل نے یہی کیا کہ شاید اسی طرف کے رہنے والے کوئی صاحب ہیں، جو ہر دوار جا رہے تھے، اتفاقاً راستے میں میری ان سے ملاقات ہو گئی، یہ میرا ذاتی نظریہ ہے، جس کی صحت اس پر موقوف ہے کہ ان جنگلی آبادیوں میں بھی کہیں کہیں مسلمان رہتے ہوں، یا اس زمانے میں رہتے تھے میں ہی کیا، مضمون کے عام پڑھنے والوں کا ذہن بھی ممکن ہے ادھر جائے کہ شاید یہ کوئی روحانی ہستی ہو لیکن محض قیاس سے اس خیال کی توثیق پر کم از کم میرا دل آمادہ نہیں ہوتا، اپنی کوتاہ نصیبیوں کو خیال کرتا ہوں، تو سچ تو یہ ہے کہ شاید اس کا وہم بھی نہ ہونا چاہیئے۔

غالباً انھیں پیر مرد سے معلوم ہوا تھا کہ کانگڑی نامی کوئی گاؤں اس جنگلی علاقے میں ہے جس میں زیادہ تر اہیر یا مویشیوں کو چرانے والے گوالے وغیرہ رہتے ہیں چونکہ گروکل کے لئے زمین کا انتخاب، اسی جنگلی گاؤں کے آس پاس کیا گیا تھا، اسی لئے کانگڑی کی طرف یہ گروکل منسوب ہو گیا، ایسا خیال آتا ہے کہ کانگڑی کو انگلیوں سے اشارہ کر کے مجھے انھوں نے بتایا بھی تھا کہ یہی کانگڑی ہے، جنگلی گاؤں میں جیسے مکانات ہوتے ہیں، غالباً دور سے وہی نظر آئے تھے، لیکن یادداشت میں اس کے ارتسامات تقریباً مٹ مٹا سے گئے ہیں، اس قصہ کو تو چھوڑیئے اب آیئے گروکل کے احاطے میں پہونچ گیا۔

گروکل

برسوں کی پالی پوسی ہوئی آرزو، آج پوری ہوئی تھی، میری مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی، لوگ آجا رہے تھے، ان ہی میں سے کوئی میری طرف متوجہ ہوا، کون ہو؟ کہاں سے آ رہے ہو؟ کیا چاہتے ہو؟

جواب سب کا دے دیا گیا، اور خواہش ظاہر کی گئی کہ گروکل کے مہاگرو یا پرنسپل صاحب سے ملنا چاہتا ہوں، وہ کوئی نیک دل آدمی تھا، پردیسی کی امداد کو اپنا انسانی فرض خیال کر کے اپنے ساتھ مختلف عمارتوں اور احاطوں سے گزرتا ہوا، جن کے کمروں میں نظر آیا کہ اساتذہ درس دے رہے ہیں، طلبہ پڑھ رہے ہیں، ایک اچھے خاصے کمرے کے سامنے لا کر ٹھہرا دیا گیا، اور اندر سے آہنی اجازت حاصل کر کے وہی صاحب مجھے اندر لے گئے، اندر داخل ہوا، ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کو دیکھا، مجھے دیکھ کر کرسی سے اٹھ گئے، اور بکشادہ پیشانی مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے اپنے سامنے کی کرسی پر بیٹھنے کا حکم دیا، یہی گروکل کے مہاگرو، یا صدر مدرس، گورنر یا پرنسپل کے نام سے مشہور تھے، اخباروں میں گروکل کے گورنر یا پرنسپل صاحب کا نام جس سے ہم کافی آشنا تھے منشی رام تھا، یہی منشی رام تھے جنھوں نے ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں سوامی شردھانند کے نام سے شہرت حاصل کی ہے سیاسی کاروبار والوں کے لئے ان کا وجود ایک مستقل موضوعِ بحث ہونے کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن مجھ جیسے ناکاروں کے لئے ان کے پہلے نام کو سن کر خیال آتا تھا کہ منشی کا لفظ جو ٹھیٹھ عربی لفظ ہے، انشاء باب افعال کا اسم فاعل ہے، ایک زمانہ اسی ہندوستان میں وہ بھی گزرا ہے کہ رام کے ساتھ عربی کے اس لفظ کو جوڑنے اور نام تک رکھنے میں مضائقہ نہیں محسوس ہوتا تھا، لیکن اسی ہندوستان میں اب جو کچھ ہو رہا ہے، اسے ہم دیکھ رہے ہیں، جو کچھ خدا دکھائے، اسے ناچار دیکھنا ہی ہے، آزاد ہندوستان کے سب سے پہلے وزیر اعظم کا نام بھی اسی تاریخی دور کی یادگار کو تازہ کرتا ہے، خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، کہنا یہ ہے کہ اب تک خیال یہی تھا کہ میں منشی رام جی سے مل رہا ہوں، لیکن بہت جلد مجھ پر واضح ہوا کہ یہ منشی رام جی گروکل کے مشہور بانی اور گورنر نہیں ہیں بلکہ کوئی اور صاحب ہیں، جہاں تک یاد رہ گیا ہے

Toobaa-elibrary.blogspot.com

اپنا نام انھوں نے رام دیال بتایا تھا، بعد کو یہی نام گروکل کے سلسلے میں کان میں پڑتا رہا شاید یہ ایم۔ اے پاس تھے۔ حالانکہ فقیر لنگی باندھے ایک عامی بلکہ دیہاتی مسلمان کی شکل میں ان کے سامنے پیش ہوا تھا۔ اور اپنی مولویت کو پیر دانا کی ہدایت کے مطابق کھلنے نہ دیا، مگر مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ جس کی توقع نہیں کیجا سکتی تھی خوشی کے انھیں جذبات کے ساتھ گروکل کے پرنسپل صاحب مجھ سے ملے، چند طلبہ جوان کے پاس بیٹھے ہوئے غالباً کچھ پڑھ رہے تھے ان کو اٹھا دیا۔ اور کمرے میں تنہا میرے ساتھ بیٹھ کر رسمی گفتگو کے بعد خاص مسئلہ تعلیم پر وہ چاہتے تھے کہ مجھ سے باتیں کریں، لیکن اپنی عامیت کو ظاہر کرنے کیلئے ان سے کچھ اکھڑی اکھڑی باتیں کرتا رہا، تاہم پھر بھی انھوں نے سمجھاتے ہوئے کہا تھا کہ آپ لوگوں کے یہاں ایک تو دیوبند کا مدرسہ ہے، اور ایک ندوہ کا، ہمارے گروکل کو اگر آپ سمجھنا چاہتے ہیں تو خیال کر لیجئے کہ ندوہ کے اصول پر قائم کیا گیا ہے یعنی قدیم علوم و فنون سنسکرت کی زبان میں ہمارے پاس جو ہیں، ان کا رشتہ جدید علوم و فنون کے ساتھ جوڑنے کی کوشش یہیں کی گئی ہے، ایسا خیال آتا ہے کہ انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ شہری تمدّن کے زہریلے جراثیم سے طلبہ کو محفوظ رکھنے کے لئے تعلیم گاہ کے لئے اس صحرائی مقام کا انتخاب کیا گیا، جہاں زمین بھی کافی ہے، اور اپنی ضرورت کی حد تک شاید سبزی ترکاری وغیرہ طلبہ و اساتذہ خود کاشت کر لیتے ہیں، دودھ دہی گھی کے لئے مویشیوں کی پرورش کی آسانیاں یہاں ہمیں میسر ہیں، آب و ہوا کے لحاظ سے بھی شہری آبادیوں کے مقابلے میں اس کو ترجیح دینی چاہیئے، ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک بڑا کتب خانہ بھی گروکل کے قبضے میں ہے، اور شاید کوئی پریس بھی اسی احاطہ میں گروکل کا چل رہا ہے، بہرحال وہ کہتے جاتے تھے اور فقیر سنتا جاتا تھا اور چاہتا تھا کہ ایک عامی مسلمان سے زیادہ ان پر اپنے متعلق کوئی اثر

پڑنے نہ دوں، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پرنسپل صاحب نے بھانپ لیا کہ ہو نہ ہو، مسلمانوں کا یہ کوئی مولوی ضرور ہے، ممکن ہے میرے ہاتھ میں طبقات ابن سعد کی جو جلد رہ گئی تھی، اس کو دیکھ کر ان کا ذہن منتقل ہوا ہو، انھوں نے پھر اپنے کسی آدمی کو بلایا، اور کہا کہ اساتذہ کے درس کے کمروں میں ان کو لے جاؤ، اور لائبریری جا کر دکھاؤ، اور سب کچھ جب دیکھ لیں، تو ان کو اس مہمان خانے میں جا کر ٹھہرا دو، جو محمڈن یعنی مسلمانوں کے لئے مختص ہے، وہ آدمی بھی بڑا اچھا ملنسار آدمی تھا۔ پرنسپل صاحب سے رخصت ہو کر ان کی غیر معمولی مہربانیوں کا شکریہ ادا کر کے اسی ملنسار آدمی کے ساتھ روانہ ہوا۔

مختلف کمروں کے پاس لیجا کر وہی بے چارہ مجھے کھڑا کرتا، اور بتاتا کہ اس کمرہ میں فلاں مضمون کا درس ہو رہا ہے، انگریزی زبان تو وہ لوگ استعمال نہیں کرتے تھے لیکن جس زبان میں پڑھا رہے تھے اس کے اکثر الفاظ میرے لئے ناقابلِ فہم تھے، غالباً پنڈتائی یا تلسی داس والی راماین کی زبان میں پڑھائی ہو رہی تھی، اسوقت تک راماین سمجھنے کی قابلیت مجھ میں پیدا نہیں ہوئی تھی، اسلئے ان اساتذہ کے لکچروں سے استفادہ نہ کر سکا۔ لائبریری پر بھی اجمالی نظر ڈال سکا بارہ بج چکے تھے، وہی ملنسار نیک دل آدمی مجھے اپنے ساتھ لئے ہوئے ایک بڑے کمرے کے سامنے آیا، کمرہ کافی وسیع تھا، اور ساز و سامان سے لیس تھا، پلنگ نواڑ کے اس میں بچھے ہوئے تھے، جن پر بستر بھی تھا، تخت بھی فرش سے آراستہ تھا، شاید ایک دو کرسیاں بھی تھیں، کمرہ کھول کر اس میں گویا مجھے اتار دیا گیا، پانی کا نظم بھی تھا، وضو کر کے بیٹھا، شاید بیس پچیس منٹ گزرنے تھے کہ اسی ملنسار نیک دل آدمی کو دیکھا ہاتھ میں ایک پرات لئے آرہا ہے، اس پرات کے ایک گوشہ میں کچھ پوریاں وغیرہ تھیں اور چھوٹی پیالیوں میں کچھ ترکاریاں، کچھ اچار جیسی چیزیں تھیں، ساتھ ہی کچھ مٹھائیاں بھی، پرنسپل صاحب کی طرف سے

Toobaa-elibrary.blogspot.com

میری ضیافت کا یہ نظم کیا گیا تھا لوگوں نے کن غلط فہمیوں میں مجھے الجھانا چاہا تھا، لیکن جب واقعہ سامنے آیا تو شاید کسی عربی مدرسہ میں خوش آمدید کے ان تماشوں کی توقع مشکل ہی سے کر سکتا تھا وہ ملنسار آدمی بھی غیر معمولی طور پر میری مدارات میں خاصی دلچسپی لیتا رہا، کھلا پلا کر اس نے کہا کہ اب کچھ دیر آپ آرام کر لیجئے، پرات اپنے ساتھ لے گیا، میں نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا، اور پلنگ پر دراز ہو گیا، اچانک اسوقت خیال آیا کہ ارے آج تو جمعہ کا دن ہے۔ جمعہ کا خیال آتے ہی اندر اندر تلملانے لگا۔ اب یاد تو نہیں رہا کہ قیلولہ میں کچھ نیند بھی آئی یا نہیں، لیکن دو بجے کے قریب پلنگ سے اٹھا، پانی گھڑے میں رکھا ہوا تھا، وضو کیا، اب اسی بند کمرے میں خواہ اسے میرا جنون خیال کیجئے، یا خبط! ضرورت تو نہ تھی، لیکن کیا یہی کہ معتدل آواز میں اذان دی، اذان کے بعد تکبیر کہتے ہوئے بجائے جمعہ کی دو رکعت کے ظہر کی چار رکعتیں ادا کیں، دل میں یہی خیال تھا کہ اللہ کی اس سرزمین میں اللہ کا نام پکار تو دوں، پھر کون آئیگا جو اللہ کا نام پکارے گا۔ ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر پلنگ پر لیٹے لیٹے طبقاتِ ابن سعد کا مطالعہ کرتا رہا، اسوقت ہلکی سی بارش بھی پندرہ بیس منٹ کیلئے اس علاقے میں ہو گئی، یہاں تک کہ چار بج گئے، اور عصر کی نماز بھی اسی مہمان خانے کے اسی کمرے میں اذان کے بعد ادا کر کے ایک نیا خیال ستانے لگا۔ یعنی اب مجھے کیا کرنا چاہیئے، کیا اس دن کو گروکل ہی کے احاطہ میں گزار دوں، یا وقت باقی ہے، مغرب تک میں گنگا کے اس ساحل تک پہونچ جاؤنگا، جہاں سے کشتی میں بیٹھ کر ہردوار پہونچ سکتا ہوں، میں نے غلط اور قطعاً غلط فیصلہ کیا کہ یہاں رات بسر کرنا مناسب نہیں، اس خیال کا غلبہ اتنا شدت پذیر ہوا کہ کمرے سے باہر نکل آیا، اور اپنے ملنسار گائڈ سے ملاقات ہو گئی، میں نے کہا پرنسپل صاحب سے کیا مل سکتا ہوں۔ بولا، کیوں؟ میں نے کہا ان سے رخصت ہونا چاہتا ہوں'

اس نے بھی سمجھایا کہ یہ وقت جانے کا نہیں ہے مگر واہ رے جوانی، اور اس کا دیوانہ پن، اس غریب کے سر ہو گیا، آخر لے گیا، پرنسپل صاحب بھی حیران تھے کہ اس جھٹ پٹے وقت میں واپسی کا خیال اور وہ بھی جنگل کی اس پگڈنڈی سے جس کے راستہ میں متعدد نالے پڑتے ہیں لیکن وہ وقت ہی اور تھا، اب تو پیدا ہوتے ساتھ ہی تقریباً ہر ارادہ تدبیر اور خواہش سینہ ہی میں رہ جاتی ہے، لیکن عہد شباب کے دنوں کا یہ قصہ ہے، وہ وقت ایسا تھا کہ کسی ارادے کو عزم کی اس قوت سے جدا کرنا میرے لئے ناممکن تھا، پرنسپل صاحب کی فہمائش بھی بیکار ثابت ہوئی، اور میں ان سے رخصت ہو کر روانہ ہو گیا۔ دل میں صرف ایک ہوس باقی رہ گئی تھی، یعنی چاہتا تھا کہ کچھ طلبہ سے باتیں کر کے ان کی علمی صلاحیتوں کا کچھ اندازہ کروں، لیکن ایک پردیسی اجنبی آدمی کے لئے یہ امید ہی غلط تھی کہ طلبہ فوراً مجھ سے مانوس ہو جاتے، پرنسپل صاحب سے رخصت ہو کر جب چلنے لگا، تو راستہ میں چند طلبہ پر نظر پڑی، مخاطب تو مخاطب کرنیکے بعد وہ ہو گئے، لیکن ظاہر ہے کہ کھل کر کسی مسئلہ پر، وہ بھی علمی رنگ کے مسئلہ پر ان بیچاروں سے گفتگو کی امید ایک طفلانہ امید کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی۔

گروکل کے متعلق جو کچھ جاننا چاہتا تھا، اجمالاً اس سے تو گو نہ واقف ہونے کا موقع مختصراً ہی مل تو گیا، لیکن طلبہ کی علمی استعداد کا اندازہ نہ کر سکا، میرا خیال ہے کہ تحت الشعور اس جلد بازی میں کچھ دخل ان پیر دانا کی باتوں کا بھی تھا، اگر میرے دل میں پہلے سے اس قسم کے خیالات نہ ڈالے جاتے، تو شب گزاری میں ظاہر ہے حرج ہی کیا تھا، میزبانی کے تجربات بھی امید سے زیادہ حوصلہ افزا تھے، لیکن ایک بات دل میں جب ڈال دی جاتی ہے تو چاہا جائے یا نہ چاہا جائے کچھ نہ کچھ اثر اس کا ضرور نمایاں ہوتا ہے۔

واقعہ یہی ہے کہ نفرت کے جذبات کا ردِ عمل بھی ہمیشہ نفرت ہی کی شکل میں

Toobaa-elibrary.blogspot.com

ظاہر ہوتا ہے، شیخ محی الدین بن عربی نے فتوحات میں اپنا ایک ذاتی تجربہ نقل کیا ہے، جوانی کے دنوں میں جب اپنے وطن اندلس میں وہ تھے، اور شکار کا ذوق حد سے زیادہ غالب تھا، لکھا ہے کہ ایک دفعہ سفر میں میرا گزر ایسے میدان میں ہو رہا تھا، جس میں جنگلی گورخروں کی ایک ڈار چرنے میں مشغول تھی، باوجود شکاری ہونے کے اسوقت، دل میں میں نے یہ طے کیا کہ کچھ بھی ہو جائے، میں ان گورخروں پر حملہ نہیں کروں گا، بیان کیا ہے کہ میں اپنے گھوڑے پر سوار جا رہا تھا، بھالا میرے ہاتھ میں تھا، گورخروں سے نزدیک ہوا، اتنا نزدیک ہوا کہ گویا ان کی صفوں میں گھس گیا، بھالا ان کے کانوں کے پاس چھو جاتا تھا، لیکن کسی قسم کی نہ وحشت ان میں پیدا نہ ہوئی، نہ بھڑکے، مزے سے چرنے میں مشغول تھے، تا آنکہ میرے نوکر چاکر جو پیچھے آ رہے تھے، اور شکار کرنے کے خیال کو انھوں نے دل سے نہ نکالا تھا، جوں ہی کہ گورخروں کی نظر ان پر پڑی چوکڑی بھرتے ہوئے روانہ ہو گئے، شیخ نے بیان کیا ہے، کہ نفرت سے نفرت اور عداوت سے عداوت پیدا ہوتی ہے، قرآنی آیت ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ۔ بھلے طریقے سے برائی کا مقابلہ کر کے دیکھو، تم پاؤ گے کہ اچانک وہی جس کے درمیان اور تمہارے درمیان دشمنی ہے، وہی گرمجوش دوست بنا ہوا ہے، لوگ باہر میں معاملات کو سلجھاتے ہیں، حالانکہ ہر شخص اپنے اندر کو سلجھا لے، تو باہر خود بخود سلجھ جاتا ہے، افراد و قوم دونوں کے لئے یہ قرآنی قانون عام ہے۔

بات دور پہونچ گئی، کہنا تو یہ تھا کہ میری اس جلد بازی میں کچھ دخل ان پیر دانا کی باتوں کا بھی تھا کہ اتنی حوصلہ افزا میزبانی کے باوجود گروکل میں شب گزاری پر دل آمادہ نہ ہوا، سوء اتفاق سے کچھ دیر کے لئے اس علاقے میں ہلکی سی بارش بھی ہو گئی تھی، ابر کھل چکا تھا، آفتاب چمک رہا تھا، لیکن بارش کی وجہ سے درختوں سے قطرات ٹپک رہے تھے، اسی حال میں گروکل کے احاطہ سے نکل کر جنگل والی پگڈنڈی پر چلنے لگا، دونوں طرف گھنے جنگل تھے، ٹپ ٹپ آواز گرنے والے قطروں کی خشک پتوں سے آ رہی تھی، دن ختم ہو رہا تھا، جوں جوں آفتاب کی روشنی دھیمی پڑتی چلی جاتی تھی، جنگل کا یہ سماں میرے لئے زیادہ بھیانک بنتا چلا جاتا تھا، خدا خدا کر کے ٹھیک اسوقت جب سورج کا زرد چہرا افق میں غائب ہوا، میں اس ساحل تک کسی نہ کسی طرح پہونچ ہی گیا جہاں کشتی ملتی تھی، ابھی ساحل دور تھا، لیکن نظر کے سامنے تھا، اس لئے اضطراب کی کیفیت میں بھی کمی محسوس ہوئی، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ غروب کے بعد تو یہ حالت ہو گئی تھی کہ کوئی قطرہ خشک پتے پر جنگل میں گرا، اور بندے نے سمجھا کہ ہو نہ ہو کوئی درندہ، ریچھ، تیندوا وغیرہ میری طرف چلا آ رہا ہے، کوئی شبہ نہیں کہ تقریباً یہ نصف گھنٹہ جو اس حال میں جنگل کی اس پگڈنڈی پر گزرا، میری زندگی کا خاص وقت تھا، بندہ صرف اپنے خدا کے سامنے تھا، یا خدا بندے کے سامنے گویا آ گیا تھا، حسبنا اللہ ونعم الوکیل کا عملی تجربہ تھا، جس سے گویا گزارا جا رہا تھا، ساحل پر جب نظر پڑی تو تسلی ضرور ہوئی، لیکن دور دور تک نگاہوں کو دوڑاتا، آدم کی اولاد کا کہیں نام و نشان تک بھی نہ تھا، مسلمان ہو، ہندو ہو، کالا ہو، گورا ہو، عالم ہو، جاہل ہو، کوئی ہو مگر آدمی ہو، آدمی کو ڈھونڈھتا تھا، خوب یاد آتا ہے کہ اسی موقع پر انسان کے متعلق ذہن منتقل ہوا کہ یہ انس سے ماخوذ ہے، میرا دل انس کو ڈھونڈھ رہا تھا، زمین کھلی تھی، درخت بھی تھے، ہمالیہ کی سر بفلک چوٹیوں کا سلسلہ بھی تھا، یہ سب کچھ تھا، لیکن میرا دل جس سے اسوقت انس حاصل کرنا چاہتا تھا، وہ صرف انسان تھا، دور ہی سے دیکھا کہ ساحل پر کشتی کے ملاح چلے آ رہے ہیں، اب تو پر امید ہو کر تیز قدم بھرتے ہوئے

Toobaa-elibrary.blogspot.com

چاہا کہ اس کشتی تک پہونچ جاؤں، لیکن اف میری مایوسی کا وہ عالم، ابھی کشتی سے دو چار فرلانگ دور ہی تھا، کہ دیکھا کشتی والوں نے کشتی کھول دی، شاید کچھ مسافر اس پار کھڑے تھے، ان ہی سے بھر کر کشتی روانہ ہو گئی، تاریکی گویا پھیل رہی تھی، میں نے سر پکڑ لیا، اب کیا ہوگا، میں نے خدا کی نعمت کا انکار کیا تھا، گرو کل کی مہمان خانے میں شب گزاری کا ارادہ خواہ مخواہ ترک کیا تھا، اب اسی کی یہ سزا تھی کہ گنگا کے ایک جنگلی نالے کے کنارے ہیں جس کے ایک طرف گھنا جنگل، دوسری طرف اونچے اونچے خوفناک پہاڑ اور تیسری طرف دریا کا نالہ، رات بھر اسی ٹاپو میں! یا اللہ کیسے گزاروں گا، مغرب کا وقت آ ہی چکا تھا، اب تو جو کچھ ہونا ہے ہو کر رہے گا، نماز تو پڑھ ہی لینی چاہیئے۔ نماز پڑھ لی دعا کیا کرتا کہ اسوقت میرا سارا وجود دعا ہی دعا بنا ہوا تھا، سلام پھیر کر اسی دعا کے لئے ہاتھ اٹھا ہی رہا تھا کہ اسی سمت سے، جس کی طرف صبح کو چند ہی دیوی کی طرف تیرتھ کرنیوالوں کو دیکھا تھا، کہ جا رہے ہیں، مجھے کچھ آہٹ سی محسوس ہوئی، ایسا معلوم ہوا کہ بیلوں کو ہنکاتے ہوئے، اس طرف سے لوگ ساحل کی طرف آ رہے ہیں، اتنے میں بیلوں پر اور ان کے ہنکانے والوں پر بھی نظر پڑی، مصلیٰ سے اٹھا اور انھیں کی طرف بھاگا، خیال یہی تھا کہ رات اگر گزارنی پڑے گی تو انھیں کے ساتھ گزرے گی، جب بیلوں کی قطار کے قریب ہوا، تو ایک آدمی جو آگے آگے تھا، اس نے پوچھا تم کون ہو؟ مسافر ہوں پار جانا چاہتا ہوں، میری گھبراہٹ دیکھ کر بولا کہ پریشانی کی کیا بات ہے ہم لوگ بنجارے ہیں، نمک لیکر جنگلی دیہاتوں میں گھومتے ہیں اور بیچتے ہیں، کشتی والے کو اپنی خاص علامت کے ذریعے ہم بلائیں گے، اور وہ آئے گا، آپ ہمارے ساتھ پار ہو جائیں گے، میرا اضطراب ساری سراسیمگی، امن و عافیت سے بدل گئی، میرے اس اضطراب و پریشانی میں بالکل ممکن ہے کہ نوعمری کے ساتھ میری اجنبیت کو بھی دخل رہا ہو۔ اس علاقے سے

میں قطعاً غیر مانوس تھا، جس رنگ میں اس ماحول کو میرا دل پا رہا تھا، ہو سکتا ہے کہ واقعیت اس میں کم شریک ہو، اجنبی نامانوس جگہ میں یوں بھی آدمی کو وحشت ہوتی ہے، اور یہ مقام تو بہر حال وحشت کا تھا ہی، جگہ بھی وحشت کی، وقت بھی وحشت کا اور سب سے پریشان کن کیفیت تنہائی کی تھی، بارے ارحم الراحمین کی رحمت نے دستگیری کی، اور بنجاروں کو لینے کے لئے کشتی واقعی واپس ہوئی، اور بنجاروں کے ساتھ ہم بھی کشتی میں سوار ہو گئے، اور جس ساحل پر ہر دوار کی آبادی ہے، اس پر پہونچ گئے، سرائے پہونچے، بستر کا کرایہ دو آنے ادا کئے اس کو بغل میں لئے اسٹیشن پہونچے، اور گرو کل کا ایک افسانہ اپنے حافظے میں لئے ہوئے ہم دیوبند واپس ہو گئے۔

تھا تو میری زندگی کا یہ سفر صرف ایک دن کا، لیکن عمر کا اکثر و بیشتر حصہ جس کا سیر و سیاحت ہی میں بسر ہوا ہے، جب سوچتا ہوں تو نتائج اور فوائد کے لحاظ سے، اس ایک دن کو بہت سے دنوں پر بھاری پاتا ہوں، وہاں سے واپس ہو کے میرا دماغ، میرا دل کیا کیا سوچتا رہا، اس کی داستان طویل ہے، اور سفر سے اس کا تعلق بھی نہیں ہے، سفر کی حد تک اس سفرنامے کو اسی پر ختم کرتا ہوں۔

Toobaa-elibrary.blogspot.com

باب ۱۷

سفرِ ٹونک و حیدرآباد

دارالعلوم کے احاطہ میں زندگی کا جو حصہ گزرا، اور جن حالات سے گزرنا پڑا۔ ان میں جو باتیں اپنے نزدیک قابلِ ذکر تھیں، سچ پوچھئے تو وہ ختم ہو چکیں، آخری مرحلہ اس سلسلہ کا وہی ہے، جب تقدیر نے دارالعلوم کے دین پرور معارف آگیں ماحول سے جدا ہو جانے پر مجبور کیا، جس کے بعد دارالعلوم سے حسی تعلق باقی نہ رہا، یوں تو دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ سے پندرہ بیس سال تک رکنیت کا جو رشتہ تھا، ہمیشہ تو نہیں، لیکن عموماً اس کی وجہ سے سال دو سال بعد دیوبند کی مانوس فضا میں سانس لینے کا موقع ملتا رہا۔ تاہم دوامی تعلق کی بات باقی نہ رہی، دارالعلوم سے میری جدائی کا یہ افسانہ اپنے بعض پہلوؤں کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ سننے والے اس کو عبرت کے کانوں سے سنیں، دارالعلوم کے تاثیری عمل کے بعض تاریخی پہلو آپ کے سامنے آئیں گے۔

اس سلسلہ میں اگرچہ شبہ کچھ خود نمائی کا بھی ہوتا ہے۔ مگر اپنی خود نوشتہ سوانحِ عمری میں، نویں صدی کے عارفِ مصر، علامہ عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے جیسا کہ ارقام فرمایا ہے۔

"قبر میں جو پاؤں لٹکا چکا ہو، عزرائیل کی پیشانی جس کے پیشِ نظر

ہو چکی ہو، خود نمائی کے لوث سے اس کو اگر بری سمجھا جائے تو "ظنوا بالمؤمنین خیرًا" کا اقتضاء یہی ہونا بھی چاہئے

بقول شخصے جس کا یہ حال ہو کہ ؎ یہ شمع جل رہی ہے مگر بجھی ہوئی

اب بھی ذوق فروغ اور پروانوں میں چرچے کا شوق، اس میں باقی رہ گیا ہے، شاید اس بدگمانی کی گنجائش مشکل ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔

اب نیت کچھ ہی ہو، جہاں بہت کچھ سنا چکا ہوں، آپ بیتی حکایت اور سُن لیجئے ؎

سنتے ہو ٹک سنو کہ میرے بعد — نہ سنو گے یہ نالہ و فریاد

(میر تقی میر)

واقعہ یہ ہے کہ تعلیمی زندگی سے فراغ تو کہہ نہیں سکتا، زیادہ صحیح یہ ہے کہ کچھ اکتا جانے، اور حالات کی بعض مجبوریوں سے، کسی معاشی مشغلہ کی طرف جب توجہ ہوئی، تو محسوس ہوا کہ معاوضہ جس کام کا مل سکتا ہے، ایسے کسی کام کی صلاحیت مجھ میں نہیں ہے، دورۂ حدیث سے فارغ ہونے کے بعد اسی لئے خیال گزرا کہ اپنے قدیم علمی مرکز ٹونک ہی جا کر قسمت آزمائی کروں، انگریزی حکومت کے دھتکارے ہوئے کو شاید دیسی ریاست میں کوئی شغل مل جائے، چند دن کے انتظار کے بعد مدرسہ خلیلیہ جس میں میری تعلیم ہوئی تھی، اسی کے کتب خانے میں کتابوں کی فہرست مرتب کرانے کی ضرورت محسوس ہوئی، اور میرے سامنے پیشکش رکھی گئی کہ اس کام کو جب تک انجام دو گے پانچ روپے ماہوار (ٹونک کے نواب شاہی سے) تم کو دیئے جائیں گے، یہ پہلا موقعہ تھا جب یہ شعور مجھ میں پیدا ہوا کہ کوئی ایسا کام شاید مجھ ناکارے سے بھی لیا جا سکتا ہے، جس کی قیمت دینے پر دنیا راضی ہو، بغیر کسی پس و پیش کے مدرسہ کی اس پیشکش کو قبول کر لیا گیا، الغرض پہلی تنخواہ اپنی زندگی میں یہی پانچ روپے نواب شاہی کی تھی، لیکن مہینہ دو مہینے کے بعد

Toobaa-elibrary.blogspot.com

مدرسہ میں مدرسی کی بھی ایک جگہ تقرر طلب قرار پائی پندرہ روپے تنخواہ[1] کے ساتھ میرا تقرر کردیا گیا، یوں بیس روپے ملنے لگے، نواب صاحب ٹونک جن کا نام ابراہیم خان خلیل تھا، ان ہی کے توشک خانے کے ایک داروغہ میرٹھ کے رہنے والے سید یعقوب صاحب تھے، اپنے بچے محمد یوسف نامی کو ابتدائی تعلیم دینے کے لئے مجھ سے خواہش کی، غالباً پانچ یا دس ان کی طرف سے بھی ملنے لگے، یہ وہی محمد یوسف ہیں جو آج کل جماعت اسلامی کے ایک سرگرم کارکن کی حیثیت سے اپنے دائرے میں کافی امتیاز حاصل کرچکے ہیں۔

یہ ساری منزلیں تین چار مہینوں میں طے ہوئیں، دنیا طلبی کے امکانات کے اس غیر متوقع تجربے نے وساوس پیدا کرنے شروع کئے، برطانوی قلمرو میں تو کامیابی کے دروازے بند تھے، قدرۃً دل کی توجہ حیدرآباد کی طرف ہوئی، وسوسہ نے رفتہ رفتہ فیصلہ کی صورت اختیار کی، یہ جانتا تھا کہ بخوشی لوگ مجھے ٹونک سے جانے نہ دیں گے، آخر اپنے ایک مخلص دوست کو دل کے فیصلہ سے آگاہ کرکے ان سے چاہا کہ ٹونک جہاں سے اسٹیشن دس پندرہ کوس کے فاصلہ پر تھا وہاں تک پہونچانے کے لیے کسی ایسی سواری کا بندوبست فرمادیں کہ رات کی تاریکی میں ٹونک سے نکل جاؤں، انھوں نے بندوبست کردیا۔ الٰہ آباد ضلع کا ایک طالب علم انوار احمد نامی مجھ سے پڑھا کرتا تھا، اور میرے ہی ساتھ رہتا تھا، حد سے زیادہ وفادار مخلص، راستباز، اسی کو اپنا رفیق طرلوج بنا شباشب ٹونک سے روانہ ہوکر اسٹیشن پہونچا، اور سیدھے حیدرآباد کا ٹکٹ لے کر راہی دکن ہوا۔ حیدرآباد کے اسٹیشن نام پلی پر جب پہونچا، وہ دن آج تک یاد ہے اور بسا اوقات جب نام پلی کے اس اسٹیشن پہونچتا، وہ دن یاد آجاتا کہ ریل سے اترنے کے بعد انوار احمد میرے رفیق طالب علم نے پوچھا کہ شہر میں کہاں ٹھہرنے کا ارادہ ہے؟ عجیب سوال ہے؟ حیدرآباد میرے لئے قطعاً اجنبی شہر تھا، کہاں جاؤں؟

میں نے اس بچے سے کہا، پھر چند لمحے کے بعد خیال آیا کہ یہاں کا مشہور عربی مدرسہ نظامیہ نامی ایسی جگہ ہوسکتی ہے، جہاں مولویت کو پاؤں ٹکنے کی شاید گنجائش مل جائے، جھٹکے میں لدا سامان اور میاں انوار احمد کے ساتھ مدرسہ نظامیہ کا پتہ پوچھتے ہوئے بالآخر اس کے دروازے پر پہونچ گئے، جھٹکے(۱) والے نے سامان اتارا، اور دروازے کے سامنے رکھ کر کرایہ طلب کیا، دیدیا گیا، اب سامان کے ساتھ ہم دونوں (فقیر اور میاں انوار) کھڑے ہوگئے، اندر بغیر اجازت کے داخل ہونے کی ہمت نہ پڑی، مدرسہ میں تعلیم پانیوالے طلبہ میں سے ایک صاحب جن کا نام مولوی محمد حسن تھا، کسی ضرورت سے دروازے پر پہونچے دو اجنبی مسافروں پر نظر پڑی، انسانی ہمدردی، اور انس کی بنیاد پر تفقد حال کیا بتایا گیا، کہ میں بھی طالب العلم ہوں، آپ کے مدرسہ کا نام سن کر آگیا ہوں، مولوی صاحب نے خدا ان کو جزائے خیر دے اپنے حجرے میں مجھے اپنے ساتھ لیکر پہونچا دیا اور مہمان نوازی بھی فرمائی، گپ شپ کے بعد دل کا جو مدعا تھا ظاہر کیا، اپنی تعلیمی حالت جو کچھ بھی تھی اس سے انکو آگاہ کیا، بہت جلد مدرسہ میں شہرت ہوگئی کہ ٹونک کا کوئی معقولی مولوی جس نے دیوبند میں حدیث بھی پڑھی ہے، آیا ہوا ہے، طلبہ سن سنکر آنے لگے، تین چار دن ہی میں لوگوں سے گھل مل گیا۔

مولانا انوار اللہ خانصاحب کی بارگاہ میں

اتفاق سے ٹونک کے ایک رفیق درس مولوی شاہ مقبول احمد صاحب اس زمانہ میں حیدرآباد

(۱) حیدرآباد میں بجائے ایکے کے جو سواری مروج تھی، اسی کو جھٹکہ کہا جاتا تھا، پچھلے دنوں اسکا رواج کم ہوگیا عوام الناس تھرڈ کلاس کے لوگوں کی سواری بھی یہی جھٹکہ تھا جب اسی نام پلی اسٹیشن پر اپنی موٹر میں آتا تو جھٹکے کا وہ پہلا دن یاد آجاتا۔

Toobaa-elibrary.blogspot.com

ہی میں تھے، مدرسہ نظامیہ میں بھی کچھ پڑھا تھا مدرسہ ہی میں ان سے ملاقات ہوئی،
"ارے میاں مناظر! تم یہاں کہاں؟" کہتے ہوئے بڑی گرم جوشی سے ملے اور
بولے کہ "مولینا انوار اللہ خاں مرحوم، جو اس زمانے میں امور مذہبی کے معین المہام
یعنی وزیر تھے، اور مدرسہ بھی ان ہی کی سرپرستی میں تھا ان سے تم کو ملاؤں گا،
مولانا کی ڈیوڑھی مدرسہ کے قریب ہی شکر کوٹے میں تھی، وہیں لیکر پہونچے، اللہ اللہ
ایک مولوی اس حال میں بھی رہ سکتا ہے، دیکھ کر میری آنکھیں کھل گئیں، مولانا مرحوم
اگرچہ اخیر وقت تک ایک درویش عالم ہی بنے رہے لیکن وزارت کے جلیل منصب
کے لحاظ سے امارت کے لوازم سے اپنے آپ کو کلیتہ دور بھی نہیں رکھ سکتے تھے،
بہر حال ان کی اسی امیرانہ حویلی کے احاطہ میں داخل ہوا ہی تھا کہ بالاخانے سے
معلوم ہوا کہ کوئی صاحب مجھے سلام بھی کر رہے ہیں اور پوچھ بھی رہے ہیں ارے آپ
یہاں کیسے آگئے؟ سیڑھیوں پر چڑھ کر ان ہی کے پاس پہلے پہونچا، یہ اجمیر شریف
کی درگاہ کے مشہور متولی مولوی نثار احمد مرحوم تھے، اجمیر شریف میں کافی شناسائی
ان سے حاصل ہو چکی تھی، میری تقریری صلاحیتوں سے بھی واقف تھے، مولینا
انوار اللہ خاں مرحوم کے پاس اس زمانہ میں مہمان تھے، اسی وقت اپنے ساتھ لئے
مولانا کی خدمت میں حاضر ہوگئے، اور میرے تعارف کے لئے بہتر سے بہتر الفاظ
جو ممکن ہو سکتے تھے ان ہی کے ساتھ مولانا مرحوم سے مجھے روشناس کرایا، مولینا
انوار اللہ خاں نے دریافت فرمایا کہ تم ٹھیرے ہوئے کہاں ہو؟ عرض کیا مدرسہ
میں، یہ سن کر خاموش ہوگئے، غالبًا اسی وقت مدرسہ میں لکھ بھیجا کہ نئے طالب علم
ٹونک سے جو آئے ہیں، ان کو مدرسہ کے مطبخ سے نمبر اول کا کھانا دیا جائے، مولانا سے
مل کر مدرسہ جب ہم واپس ہوئے، تو یہ خبر ملی، شاید تین چار دن اس حال میں گزرے
میری آمد و رفت ان دنوں میں مولینا انوار اللہ کے یہاں جاری رہی، خود ہی
فرمانے لگے، مدرسہ میں تم کو تکلیف ہوگی، میرے مکان میں کافی گنجائش ہے یہیں

آجاؤ، اب میں بجائے مدرسہ کے مولانا انوار اللہ خاں مرحوم کا خصوصی مہمان ہو گیا
ایک خاص کمرہ میرے لئے مختص کر دیا گیا، انوار احمد اور خاکسار اسی کمرے میں
رہنے لگے،

مولانا انوار اللہ خاں کی مجلس درس میں

مولانا انوار اللہ خاں مرحوم کے
یاں رات کو فتوحات مکیہ کا سبق ہوتا تھا، حیدر آباد کے مشاہیر علماء، اصحاب
جبہ و عمامہ بڑی بڑی داڑھیوں کے ساتھ اس حلقۂ درس میں شریک ہوتے
تھے، فقیر تو اسی مکان ہی میں رہتا تھا، حلقۂ درس کا ایک رکن میں بھی بن گیا،
کبھی کبھی کچھ سوال و جواب کے مواقع بھی پیش آئے، مولینا مرحوم کو میری
قابلیت کا کچھ اندازہ ہوا، ایک دن فرمانے لگے کہ میری تو روز سنتے ہو، لیکن
اپنی بھی کچھ سناؤ گے، عذر خواہ ہوا کہ حضرت والا کے سامنے میری زبان بھلا
کیا کھل سکتی ہے؟ مگر مصر ہوئے، اصرار ان کا جب حد سے گزر گیا، تو کسی نہ
کسی طرح مولانا کے اسی حلقۂ علماء میں تقریر کرنے کا ارادہ کر ہی لیا گیا، اب یاد نہیں کہ
کس موضوع پر یہ تقریر، جو کی گئی تھی، لیکن اتنا خیال ہے کہ مولانا انوار اللہ
خاں مرحوم نے اس زمانے میں چند خاص کتابیں جو لکھی تھیں، جن میں مقاصد الاسلام
کتاب العقل، حقیقۃ الفقہ، افادۃ الافہام خاص طور پر کافی پر مغز کتابیں ہیں، میرے
مطالعہ سے یہ کتابیں گزر چکی تھیں، بیچ بیچ میں ان کتابوں کے خاص خاص اہم
مضامین کا تذکرہ اس تقریر میں کچھ اس طریقہ سے کیا جا رہا تھا، جس سے مولینا
اس لئے متاثر ہو رہے تھے کہ ان کی محنت سے استفادہ کرنیوالے بھی پائے جاتے
ہیں، تقریر جب ختم ہوئی، تو مولانا کی شفقت و مہربانی، اس غریب مسافر کے
ساتھ قدرتہً بڑھ گئی، اسی تقریر کا دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ حلقۂ درس میں شریک ہونے
والوں سے تو روشناسی کا موقع عمومًا ملا لیکن ان ہی لوگوں میں کابل کے

Toobaa-elibrary.blogspot.com

رہنے والے ایک صاحب جن کا نام مُلّا مراد تھا، سالہا سال سے حیدرآباد میں کتابوں کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتے تھے، مثنوی مولانا روم کے گویا حافظ تھے، ایک خاص دُھن میں جو انھیں کے ساتھ مختص تھی، لوگوں کو مثنوی سنایا کرتے تھے، شہر کے مواعظ میں بھی حصّہ لیتے تھے، زیادہ تر ان کا وعظ مثنوی ہی کے اشعار پر مشتمل رہتا تھا، اپنے وقت میں حیدرآباد کی سوسائٹی کے خاص رکن تھے، امراء و حکام میں شاید ہی کوئی ہوگا، جو ان سے واقف نہ ہو، اور ان کی رسائی وہاں تک نہ ہو، ان تفصیلات اور ان کی خصوصیات سے تو بعد کو واقف ہوا اس وقت یہ عرض کرنا ہے کہ تقریر سے فارغ ہونے کے بعد میں نے دیکھا کہ میری باتوں سے مُلّا صاحب مرحوم غیر معمولی طور پر لذت اندوز ہوئے، بڑی گرم جوشی سے ملے، اور اسی وقت وعدہ لیا کہ کل ان کے ساتھ ان ہی کے گھر پر کھانا بھی کھاؤں، وعدہ کر لیا گیا، دوسرے دن لینے کے لئے خود آئے، اپنے گھر لے گئے، دعوت میں کافی تکلف سے کام لیا تھا حالات دریافت کرنے کے بعد رخصت کرتے ہوئے فرمایا کہ حیدرآباد کے خاص خاص لوگوں سے تجھے ملاؤنگا میری آمد و رفت کا سلسلہ ان کے یہاں شروع ہو گیا۔

مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کی بارگاہ میں

کہنے لگے کہ مہاراجہ کشن پرشاد بہادر، بڑے علم دوست، قدر شناس آدمی ہیں ان ہی کے پاس تجھے سب سے پہلے لے چلوں گا، لے گئے، فارسی زبان میں مہاراجہ سے تعارف کراتے ہوئے انھوں نے جو الفاظ کہے تھے بجنسہٖ یاد نہ رہے حاصل غالباً یہی تھا

"اس شخص کی کم عمری پر نہ جائیے، ہندوستان سے آنیوالوں
میں اس قسم کی تقریر کرنے والا میری نظر سے نہیں گزرا

مہاراجہ بہادر جیسا کہ ان کا دستور تھا، اچھی طرح ملے، باتیں ہونے لگیں،

ان کو وحدۃ الوجود کے مسئلہ سے خاص دلچسپی تھی، چھیڑ کر اس مسئلہ پر آ گئے، فقیر اپنی بضاعت کی حد تک اس مسئلہ کے متعلق جو کچھ اس وقت جانتا تھا، اور جو نقطۂ نظر رکھتا تھا، جب بیان کرنے لگا تو دیکھا کہ مہاراجہ چند ہی فقروں کے بعد کچھ سنبھل سے گئے، اور میری گفتگو کو بغور سننے لگے، درمیان میں کچھ کہتے بھی تھے، جس کا جواب دیا جاتا تھا، میری نوعمری کا زمانہ تھا، اس لحاظ سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجہ کو میری معلومات اور طریقۂ بیان پر کافی تعجب ہوا اور کہنے لگے کہ جس طریقے سے تم نے اس مسئلہ کو میرے سامنے بیان کیا ہے، کیا چند مولوی جو کچھ وہابی خیال کے ہیں، ان کو جمع کر کے میں سننا چاہوں تو ان کے تقریر کرو گے؟ میں راضی ہو گیا۔ تاریخ مقرر ہو گئی۔

مہاراجہ کا جو قصر شاہ علی بنڈے میں ہے، اسی قصر میں ان مولویوں کا ایک مختصر مجمع دیکھا کہ بیٹھا ہوا ہے، مہاراجہ نے حکم دیا، میں کھڑا ہو گیا، جو کچھ عرض کرنا چاہتا تھا، ان علمائے کے سامنے بھی اسی طرح بیان کرتا رہا، سب سنتے رہے، تقریر ختم ہوئی، سبھوں نے تعریف کی، اب واللہ اعلم، تعریف مہاراجہ کی خاطر سے کی گئی، یا واقعہ میں ان کو پسند آئی تھی، جلسہ ہنسی خوشی کے ساتھ ختم ہو گیا، اب مہاراجہ مجھ سے اور میں ان سے بہت قریب ہو گیا قیام گاہ دریافت کرنے لگے، میں نے مولانا انوار اللہ خاں مرحوم کے دولت خانے کا ذکر کیا، کہنے لگے "اس میں کیا حرج ہے کہ کچھ دن تم مولانا کے مہمان رہ چکے، اب ہمارے مہمان بن جاؤ" لیکن مولانا انوار اللہ خاں کا خیال کر کے اس سے معذرت خواہ ہوا "مہمان نہیں بنتے تو آتے رہو" مہاراجہ نے فرمایا میں نے کہا ہاں یہ تو ہو سکتا ہے، دوسرے تیسرے دن مہاراجہ کے یہاں میری حاضری ہونے لگی، علمی مذاکرے، ادبی چرچے ان کی مجلس میں ہوتے رہتے، اپنی مختلف تصنیفات کی ایک ایک کاپی مجھے دیتے، رائے پوچھتے، اسی سلسلہ میں ایک بہترین نسخہ، بھگوت گیتا، کا بھی مجھے عنایت فرمایا

Toobaa-elibrary.blogspot.com

دلّی کے ایک بڑے فاضل پنڈت نے اردو زبان میں گیتا کے اشلوکوں کا ترجمہ بھی کیا ہے، اور ہر اشلوک کی شرح اردو زبان میں اس طریقہ سے کی ہے کہ بیچ بیچ میں صوفی مزاج مسلمان شعراء فارسی کے اشعار بھی بکثرت مطلب سمجھانے کے لئے اس کتاب میں درج کئے گئے ہیں۔ گویا جس شہر میں قطعاً ایک اجنبی مسافر کی حیثیت سے داخل ہوا، اس کی دو بڑی خاص مرکزی ہستیوں سے میرا تعلق قائم ہو گیا، یعنی ایک تو وہی نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خاں مرحوم، اور دوسرے مہاراجہ ظاہر ہے کہ اس کے بعد میرا وہی وسوسہ جس نے ٹونک میں فیصلہ کا قالب اختیار کیا تھا، سامنے آیا۔

ایمانی کشمکش

معاشی ذرائع کے امکانات کا جائزہ لینے لگا، لیکن خلاف توقع اس راہ میں کافی مایوسیوں کا تجربہ ہونے لگا حیدرآباد اس زمانے میں وہ حیدرآباد نہ تھا جس میں جامعہ عثمانیہ جیسا طویل و عریض تعلیمی ادارہ قائم ہوا، تعلیمات کے اسکولوں کی تعداد بھی حد سے زیادہ ناکافی تھی، دریافت سے ان اسکولوں کے مولویوں کی تنخواہیں بھی چالیس پچاس سے زیادہ عموماً نہ تھیں، مدرسہ نظامیہ جو میرے لئے سب سے مناسب ہو سکتا تھا، وہاں بھی غریب مولویوں کو تقریباً معاشی لحاظ سے اسی حال میں پا رہا تھا جس میں ہندوستان کے عربی مدارس کے معلمین مبتلا تھے، البتہ ایک دارالعلوم کالج تھا جس میں تنخواہوں کا معیار عربی مدارس سے قدرے بلند تھا لیکن جہاں تک اندازہ ہوا، اس کی حالت بھی "دریک انار صد بیمار" سے زیادہ نہ تھی، اسی کا نتیجہ یہ بھی دیکھا کہ بعض بہی خواہوں نے مشورہ دیا کہ حکومت حیدرآباد کے کسی انتظامی محکمہ میں داخل ہونے کی کوشش کیوں نہیں کرتے انتہا ان مشوروں کی یہ بھی تھی کہ ایک صاحب نے پولیس کے محکمہ کی طرف بھی توجہ دلائی، اس وقت تک وکالت کے لئے حیدرآباد میں انگریزی یونیورسٹیوں کے سند یافتہ ہونے کی ضرورت نہ تھی، ایک راہ یہ بھی تھی، جو دوسری راہوں کے ساتھ میرے سامنے

پیش ہوتی رہی۔

عجب کشمکش کا معاملہ تھا، اس وقت تک ساری زندگی جن آرزوؤں اور تمناؤں میں بسر ہوئی تھی، اچانک معلوم ہوا کہ مشورہ دینے والے ان سب سے دستبردار ہونے کا مشورہ دے رہے ہیں، مجھے دین کی تعلیم دلائی گئی تھی، ایسے ماحول میں میری تربیت ہوئی تھی، جس میں دین اور علم کی خدمت کے سوا نہ کبھی کوئی خیال پیدا ہوا تھا، اور نہ ہو سکتا تھا، کچھ اس کا بھی خیال آتا، اور اس سے زیادہ اسکا کہ جن کاموں اور مشغلوں کا تصور بھی کبھی دماغ میں نہ آیا تھا، وہ میرے بس کے نہیں ہیں۔

اسی ادھیڑ بن میں چند دن گزرے، اور آخر حیدرآباد میں قیام کے فیصلے کو بدلنے کا فیصلہ کرنا پڑا، مہاراجہ بہادر کے پاس تیسرے چوتھے دن حاضری کا موقعہ ملتا ہی رہتا تھا، اپنے اس فیصلہ سے انکو بھی آگاہ کیا۔ جانتا تھا کہ مجھ جیسے صبح و شام ان کے پاس آتے جاتے رہتے ہیں، جو واقعہ اس کے بعد سامنے آیا قطعاً خلافِ توقع تھا، یہ سننے کے ساتھ ہی کہ میں حیدرآباد سے جانا چاہتا ہوں دیکھا کہ مہاراجہ نے عجب طرح سے مجھے دیکھا، حیدرآباد پہونچنے کے بعد حیدرآباد سے واپس ہو جانے کا فیصلہ شاید ان کے نزدیک کچھ عجیب سا تھا، مجھ سے کہنے لگے کہ آخر کیوں؟ کیا بات ہے؟ اسی کے ساتھ یہ بھی کہنے لگے کہ میں نے تو پہلے بھی کہا تھا کہ نواب فضیلت جنگ کے یہاں سے اٹھ کر ہمارے یہاں چلے آؤ، اصرار کرنے لگے کہ میں تم کو جانے نہ دوں گا، گرد و پیش کے لوگوں سے کہنے لگے کہ انکے رہنے سہنے کا نظم فلاں مکان میں کر دیا جائے، میں کہتا رہا کہ یہ جناب والا کی نوازش ہے، لیکن حیدرآباد میں قیام کی صورت نظر نہیں آتی ہیں ان سے کہہ رہا تھا۔ اور اسی حیدرآباد کے متعلق کہہ رہا تھا، جہاں قدرت میرے قیام کا فیصلہ کر چکی تھی، اور یہ سارا طول طویل قصہ اسی لئے سنا رہا ہوں کہ آگے جو کچھ عرض کروں گا

Toobaa-elibrary.blogspot.com

وہی میرا خیال تو یہی ہے کہ بصیرتوں، اور عبرتوں کا سبق اس سے پڑھنے والوں کو مل سکتا ہے۔

خیال کرنے کی بات ہے کہ پانچ روپے ماہوار کی تنخواہ سے جس کی معاشی زندگی کی ابتدا ہوئی تھی، وہی ایک بڑے امیر کبیر راجۂ راجگاں ہز ایکسلنسی سر یمین السلطنت پیشکار و وزیر اعظم حکومتِ آصفیہ کا مطلوب بنا دیا گیا ہے، مہاراجہ نے یہ واقعہ ہے کہ، فہمائش کا کوئی طریقہ ایسا نہ تھا، جسے سمجھانے اور فیصلہ کے بدلنے کے سلسلے میں اختیار نہ کیا ہو، آخر میں یہاں تک بول اٹھے۔

"مولوی صاحب آپ اندازہ نہیں کر رہے ہیں کہ کون آپ کو اپنے یہاں
ٹھیرنے پر مجبور کر رہا ہے"۔

مختلف معاذیر پیش کرتا رہا، تھک کر آخر یہ بھی کہا کہ مہاراجہ ابھی اپنے اساتذہ سے مجھ کو کچھ اور بھی سیکھنا پڑھنا ہے، جس کا نظم حیدر آباد میں نہیں ہو سکتا۔ اچھی طرح یاد ہے کہ جوش میں مہاراجہ نے کہا۔

"حیدر آباد میں اربابِ کمال کی کمی نہیں ہے، جس عالم سے جو کچھ تم پڑھنا چاہو گے میں اس کا بندوبست کر دوں گا۔ سواری پر تم انکے یہاں
چلے جانا، جو کچھ پڑھنا چاہتے ہو، پڑھنا"۔

مگر واپسی کا فیصلہ اس کے بعد بھی میرا اٹل ہی رہا۔ آخر میں مصاحبوں کی طرف مسکراتے ہوئے متوجہ ہو کر مہاراجہ کہنے لگے کہ ابھی نوجوان آدمی ہیں۔ گھر سے پہلی دفعہ دور نکل آئے ہیں، اسی لئے جی ان کا گھبرا گیا ہے، یہ کہتے ہوئے میں نے دیکھا کہ کاغذ منگوا کر کچھ لکھنے لگے، لکھ کر اپنے ایک مصاحب کے حوالے کر دیا، اور محبت و شفقت میں ڈوبے ہوئے الفاظ کے ساتھ انھوں نے مجھے رخصت کیا۔

مولانا انوار اللہ خاں مرحوم کے مکان میں پہونچ کر مہاراجہ کی باتوں کو سوچنے لگا، کشمکش کا عجب حال تھا، بے کسی کے اس حال میں، مہاراجہ جیسے آدمی کا

مہربان ہو جانا، اور مہربان ہی کیا؟ جو کچھ وہ کر سکتے تھے، میری فلاح و بہبود کے لئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس میں کمی نہ کریں گے، کم از کم ان کے قصر کا وہ حصہ جس میں ٹھہرانے کا حکم انھوں نے اپنے ملازموں کو دیا تھا، مجھے دکھا دیا گیا تھا مہاراجہ ہی کی کوٹھی کا وہ حصہ تھا، راحت و عافیت کے ساز و سامان سے لیس، چلنے پھرنے کے لیے مفت سواری، مستقبل کی روشن توقعات!

ضمیر کی پکار

ایک طرف یہ ساری باتیں تھیں، اور دوسری طرف خیال آتا کہ دین کی تعلیم میں عمر کا اتنا بڑا حصہ، جو صرف ہوا، سیدنا شیخ الہند اور حضرت الاستاذ الامام الکشمیریؒ کے حلقہائے درس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے سننے اور پڑھنے کا آخری انجام میرے لئے کیا یہی تھا کہ ایک غیر مسلم امیر کی مصاحبت اور ندیمی میں اپنی زندگی گزاروں گا، یہ خیال سامنے آتا اور معلوم ہوتا کہ دنیا مجھ پر تاریک ہو گئی، مہاراجہ کی سرپرستی میں کسی محکمہ میں اچھی ملازمت بھی مل سکتی ہے، وکالت کا امتحان بھی دے سکتا ہوں، چاہوں تو حیدر آباد کے مدرسہ طبیہ میں شریک ہو کر طب بھی پڑھ سکتا ہوں۔ یہ اور اسی قسم کے امکانات قدم میں لغزش پیدا کرتے، نفس حیلے حوالوں کے ساتھ سامنے کھڑا ہو جاتا، لیکن دل کہتا کہ پھر اس کا کیا جواب ہوگا، جب پوچھا جائے گا کہ کیا اسی لئے قرآن و حدیث کی تعلیم تجھے دی گئی تھی، چاہے باور کیجئے یا نہ کیجئے، لیکن مولانا انوار اللہ خاں کی حویلی کے مغربی سمت کا وہ کمرہ، اور اس کی زمین اس کی شہادت دے سکتی ہے کہ شاید رات بھر اسی کمرے میں کروٹیں ہی بدلتا رہا، کبھی کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتا، اور اسی اپنے رفیق طراوح انوار احمد سے کہتا کہ۔

"تم ہی بتاؤ میں کیا کروں، مولٰینا محمود الحسن شیخ الہند کے درس میں
بار بار پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان الا فلیبلغ الشاھد الغائب؛
سنتا رہا ہوں، مطلب جس کا یہی ہے کہ واقف ہو جانے والوں کو

Toobaa-elibrary.blogspot.com

چاہیئے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو ان لوگوں تک پہونچاتے چلے جائیں، جواب تک اس سے ناواقف ہیں، اسی پیغام کی تبلیغ، آپ کے دین کی تعلیم یہی زندگی کا نصب العین بن چکا تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت مجھے اس راہ سے ہٹانا چاہتی ہے، میں دھتکار دیا گیا، قبول کرنیوالے نے مجھے دھتکار دیا"

یہ یا اسی قسم کے الفاظ زبان پر آتے، اسوقت ایک عجیب حال طاری تھا، انوار غریب بیچارہ کبھی آنکھوں میں آنسو بھر لاتا، مگر اس بیچارے کی سمجھ ہی کیا، مجھے روتا دیکھ کر وہ بھی روتا، میں کہتا۔

" انوار! کسی امیر کی گرمیٔ بزم میں اپنی ساری صلاحیتوں کی حرارت جھونک دوں، کیا یہ زندگی کی کوئی قیمت ہوئی، اس سے کہیں بہتر تھا کہ میں کچھ نہ پڑھتا، کسی گاؤں میں ہل جوتتا، کسی سڑک پر بیٹھ کر جوتیاں گانٹھتا "

اس قسم کی باتیں کہنے کی نہیں ہوتیں، لیکن اب زندگی، اور زندگی کے سارے قصے ختم ہو رہے ہیں، دوسروں کے لئے ناگفتہ بہ افسانے کو گفتہ بنا رہا ہوں، میرے لئے یہ واقعہ ہے کہ حیدرآباد کی وہ رات، امتحان کی رات تھی، کدھر جانا چاہتا ہوں؟ دل و دماغ دوراہے پر لاکر ڈال دیئے گئے تھے۔

کشمکش کا خاتمہ اور ایمانی فیصلہ

ارحم الراحمین کی رحمت واسعہ اللطیف الرؤوف الودود کے لطف خفی نے دستگیری کی، کسی امیر کا نقل محفل بن کر رہ جانے کا خطرہ جسکے سامنے آگیا تھا، اُسے توفیق بخشی گئی، ہوس کا اشارہ تھا کہ کچھ ہو یا نہ ہو، خود مہاراجہ کا لطف و کرم ہی مجھ جیسے آدمی کے لئے کیا کم ہے؟ ان کی ذاتی آمدنی دس گیارہ لاکھ سالانہ اسٹیٹ کی تھی، پانچ ہزار ماہوار تنخواہ ان کی پیشکاری کی پشتینی خدمت

کی تھی، کوئی کام کریں یا نہ کریں، خزانۂ عامرہ سے پانچ ہزار کی رقم ان کے خزانے میں منتقل ہو جاتی تھی، جب مدار المہام تھے، تو شاید دس ہزار سے زیادہ تنخواہ ان کو ملتی تھی، ان کا دربار میری حرص و ہوس کی بھوک مٹانے کو کافی تھا، ان کی طرف سے اس قسم کے اشارے بھی مل چکے تھے، میں دیکھ رہا تھا کہ متعدد شعراء و ارباب قلم ان کے در دولت سے وابستہ ہیں، اور عیش و آرام کی زندگی گزار رہے ہیں، بغیر کسی تگ و دو، جد و جہد کے میرے لئے کم از کم اس قسم کی زندگی کی گنجائش نکل چکی تھی، ایک طرف یہ حال تھا، دوسری طرف خیال آتا کہ حیدرآباد سے واپسی کے بعد برطانوی ہند کے اسی علاقے میں بھٹکنا پڑیگا جہاں کے باشندوں کے لئے ملّا کا وجود ناقابل برداشت بن چکا ہے، معاشی نقطۂ نظر سے اندھیرا ہی اندھیرا تھا، مولوی فاضل منشی فاضل جیسے مشرقی امتحانوں کی طرف دل کا رجحان نہ تھا، ایک ذریعہ معاش کا غریب ملانوں کے لئے طب کا رہ گیا تھا، میرا خاندانی پیشہ چند پشت سے طب کا تھا بھی، فرماں روائے ٹونک کے طبیب خاص مولینا برکات احمد صاحب قدس اللہ سرّہٗ میرے استاد تھے لیکن پہلے عرض کر چکا ہوں کہ حکیم صاحب نے طب پڑھانے سے انکار ہی نہیں کیا، بلکہ ان کے بھائی سے جب طب کی کتاب شروع کی، تو جدُّ الحکیم صاحب مرحوم نے انکو پڑھانے سے منع کر دیا۔

اس تاریک مستقبل کے جنگل میں بہر حال گھس پڑنے کا ارادہ کر ہی لیا گیا، اور صبح ہونے تک میری ذہنی کشمکش ختم ہو گئی، مولانا انوار اللہ خاں مرحوم کی خدمت میں بھی حاضر ہو کر روانگی کی اجازت حاصل کر لی، رسمی طور پر غالباً انھوں نے پوچھا بھی کہ کیوں جاتے ہو، لیکن اس باب میں ان کی طرف سے کسی قسم کی حوصلہ افزائی بھی نہیں ہوئی، اور ہوتی بھی تو میرا فیصلہ واپسی کا انشاء اللہ نہ بدلتا، بیچارے ملا مراد مرحوم کو بھی میرے اس فیصلے پر افسوس بھی ہوا اور تعجب بھی، لیکن کیا کر سکتے تھے

Toobaa-elibrary.blogspot.com

نہ ان کی مرضی سے حیدر آباد گیا تھا، پھر ان کی مرضی کو میری واپسی میں دخیل ہونے کی وجہ کیا ہو سکتی تھی، انھوں نے حیدر آباد کی بعض نادر کتابیں تحفتاً مجھے دیں جن میں جدید سائنس اور ریاضی کی وہ کتابیں بھی تھیں، جو شمس الامراء امیر کبیر مرحوم کی توجہ اور خرچ سے ترجمہ ہو کر طبع ہوئی تھیں، ان کو "ستہ شمسیہ" کہتے تھے، ہدایہ کا ایک قلمی نسخہ بھی دیا تھا

مہاراجہ کا عطیہ

اب یاد نہیں کہ اسی دن یا دوسرے دن، جو میری روانگی کا دن تھا، سامان جو کچھ بھی تھا، درست کر کے روانہ ہونے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اچانک مولینا انوار اللہ خاں مرحوم کی حویلی میں دیکھا کہ مہاراجہ بہادر کے ایک مصاحب شاعر ثاقب بدایونی، جو پہلوان سخن کے نام سے بھی مشہور تھے، وہی تشریف لا رہے ہیں، ڈھونڈھتے ہوئے میرے کمرے میں پہونچے، تنہا ہی بیٹھا ہوا تھا جیب سے کوئی چیز نکالی، اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے کہ مہاراجہ بہادر نے یہ بھیجا ہے، پوٹلی میں روپئے تھے حوالے کرتے ہوئے یہ بھی ثاقب صاحب نے کہا کہ

"مہاراجہ نے سلام کہا ہے، اور یہ بھی فرمایا ہے کہ مولوی صاحب کو کہہ دیجیو کہ یہ ان کا سفر خرچ ہے، نو عمری کی وجہ سے گھبرا گئے ہیں کہہ دیجیو کہ گھر پہونچنے کے بعد جب دل و دماغ ٹھکانے ہو جائے، تو بغیر کسی محصہ کے وہ میرے پاس چلے آئیں"

اس میں شک نہیں کہ تنگی میں مبتلا ضرور تھا، اور یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ حیدر آباد سے نکلنے کے بعد کہاں جانے کا ارادہ کیا جائے گا یا قدرت کہاں لے جائے گی؟ اس لئے یہ امداد، غیر مترقبہ امداد تھی، تاہم دل اس کے لینے پر راضی نہ ہوا ثاقب صاحب سے عرض کیا گیا کہ اس قسم کی باتوں کی عادت ابھی نہیں پڑی، دل لینے پر آمادہ نہیں مگر وہ سال خوردہ تجربہ کار بزرگ تھے، فرمانے لگے، ابھی

آپ طالب العلم ہیں، ضرورت سے انکار نہیں کر سکتے، رہے مہاراجہ بہادر، سو انکے یہاں داد و دہش کا یہ قصہ صبح و شام جاری ہے، آپ نہ لیں گے، تو ان کو کچھ یہ ابھی معلوم ہو گا، اور کسی غیر مستحق تک یہ رقم پہونچ جائے گی، کچھ اس طریقہ سے ثاقب صاحب نے سمجھایا کہ رزق ساقہ اللہ الیک تھا، رقم لے لی گئی، شکریہ کا کوئی عریضہ بھی لکھ کر ثاقب صاحب کے حوالے کر دیا گیا۔ اور اسی دن یا ایک دو دن بعد یاد نہیں رہا میں پھر نام پلی اسٹیشن پر حیدر آباد سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے کیلئے واپس ہوا، ٹکٹ کہاں کا لوں؟ انوار احمد نے پوچھا میں نے کہا کہ کم از کم منماڑ تک کا لے ہی لو، حیدر آباد کے علاقہ سے تو نکل جاؤں، بغیر اس کے حیدر آباد کا خیال، دماغ سے نہ نکلے گا۔ یہی کیا گیا۔ میں منماڑ پہونچا، جس کے بعد ایک دوسری آزمائش کا قصہ شروع ہوا۔

Toobaa-elibrary.blogspot.com

باب ۱۸

ایک اور لغزش گاہ

سید شاہ مقبول احمد ٹونک کے ایک رفیق درس کا ذکر کر چکا ہوں کہ حیدرآباد میں ان سے ملاقات ہوئی تھی، مگر ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ کے بعد وہ حیدرآباد سے اپنے گھر چلے گئے، ان کا وطن منماڑ ہی کے پاس ایک گاؤں میں تھا، میں ان کے بعد مہینے ڈیڑھ مہینے قیام کر کے حیدرآباد سے واپس ہوا تھا۔ منماڑ اسٹیشن پر جب پہونچا تو ان ہی مولوی مقبول احمد صاحب کو بھی اسٹیشن پر پایا، ہم واپس چلے آئے ہیں؟ مجھے دیکھ کر بولے، جواب میں جو کچھ مناسب معلوم ہوا ان سے کہہ دیا گیا، آپ کہاں جا رہے ہیں؟ یہ میں نے پوچھا، بولے کہ بھائی تم جانتے ہو، بندہ پیر زادہ ہے، اپنے والد کے مریدوں میں گشت کرنے کے لئے نکلا ہوں، اسی کے ساتھ بڑی لجاجت سے کہنے لگے کہ میرے اس گشتی سفر میں کاش! تم بھی ساتھ ہو جاتے تو میرا بڑا کام چل جاتا، مطلب ان کا یہ تھا کہ وعظ و تقریر میں وہ قادر نہ تھے، میری تقریری صلاحیتوں سے چونکہ واقف تھے، اس لئے ان کی خواہش ہوئی کہ ان کے آبائی مریدوں میں پہونچکر میں تو تقریر کروں، اور وہ نذرانے وصول کریں۔ تقریر کی وجہ سے ان کا خیال تھا کہ نذرانے کی آمدنی بڑھ جائے گی۔ کچھ ایسے الفاظ بھی وہ بولے کہ اپنی اس

آمدنی کا کافی حصہ تیرا ہی ہوگا۔ خیال آتا ہے کہ ہزار دو ہزار کی رقم اس راہ میں مل سکتی ہے، کچھ اس قسم کا وعدہ انھوں نے کیا تھا، یا امید دلائی تھی۔

وعظ اور گشت کی راہ سے کسب زر کا مسئلہ میرے لئے بالکل نیا اور قطعاً نیا تجربہ تھا، پہلے تو بہت ہچکچایا، لیکن کچھ سیر و سفر کا شوق اور یہ کہ اس راہ میں ہوتا کیا ہے، اس کے جاننے کی خواہش، آزادی، الغرض مختلف مؤثرات کے تحت میں ان کے ساتھ ہو گیا، انوار احمد بھی ساتھ ہی رہا، اپنی پوری مولیانہ زندگی میں پندرہ بیس دن کا یہ سفر اور اس کے تجربات و مشاہدات میرے لئے عجیب تھے، گجرات کے علاقے میں سید مقبول کے آبائی مریدوں کی بستیاں تھیں، نواپورہ، بردولی، ان دو بستیوں کے نام یاد رہ گئے ہیں، پہلے سے مریدوں کو، پیرزادے کی تشریف آوری کی اطلاع مل جاتی تھی، خط لکھ دیا جاتا تھا، اسٹیشن پر لوگ سواری لے کر موجود رہتے اور اپنے گاؤں لے جاتے، ہم دونوں یعنی خاکسار اور انوار احمد میرے رفیق سفر، کا شمار ابتداء میں پیرزادے کے خدام میں ہوتا تھا لیکن مواعظ اور تقریروں کا سلسلہ جب شروع ہو جاتا، تو پیرزادے سے زیادہ لوگ میری ہی طرف جیسا کہ چاہیئے تھا متوجہ ہو جاتے، دو دو، تین تین دن ان بستیوں میں قیام رہتا، وعظ کی مجلسیں منعقد ہوتیں، رخصتانہ براہ راست پیرزادے صاحب وصول فرماتے، گاؤں سے نکلنے کے بعد کہتے کہ بحمد اللہ تمہاری تقریر کے متعلق میں نے جو رائے قائم کی تھی، غلط نہ نکلی، یعنی خلاف دستور زیادہ رقم وصول ہوئی، بردولی نے مہاتما گاندھی کی مہم کیوجہ سے کافی شہرت حاصل کی، فقیر اس قصبے میں شہرت سے پہلے سید مقبول احمد کی رفاقت میں پہونچا تھا، وہاں کے مسلمانوں نے خاطر و مدارات میں جس حد تک غلو سے کام لیا تھا چالیس سال بعد بھی اسکا خیال کبھی کبھی آجاتا ہے میرے وعظ کافی مقبول ہوئے۔ دستور رہی کا یہ دیکھا کہ واعظ کیلئے ایک تخت بچھایا جاتا، جس پر قالین، گاؤ تکیے وغیرہ تو ہوتے ہی تھے، مزید تکلف یہ کیا جاتا کہ مسہری کی طرح تخت میں ڈنڈے چاروں کونوں میں گاڑ کر شامیانہ بھی بطور چھتری کے لگا دیا جاتا

Toobaa-elibrary.blogspot.com

اور پھولوں کے بڑے بڑے ہار اسی چھتری میں چاروں طرف اس طریقے سے لٹکا دیے جاتے کہ کسی نوشے کے چہرے پر معلوم ہوتا کہ سہرا لٹک رہا ہے۔ واعظ غریب کو پھولوں کے اس محیط پردے کے بیچ میں بیٹھنے کا حکم دیا جاتا۔ گویا پھولوں کے لٹکے ہوئے ہاروں میں واعظ گم ہو جاتا۔ صرف اس کی تقریر لوگوں کے کانوں میں پہونچتی۔ شروع شروع میں تو اس سے بڑی وحشت ہوئی، لیکن ان ہی وحشتوں سے مانوس ہونے کے لئے قدم رکھا ہی گیا تھا۔ انوار احمد بھی کبھی کبھی اس چادر گلبن یا پردہ گل کے بیچ میں میرے ساتھ بیٹھا دیا جاتا، بے چارا مجھے دیکھ کر ہنستا، گویا ہم ایک تماشا بنائے گئے تھے، مولوی مقبول احمد صاحب بردولی کے بعد ہی غالباً سورت کے مشہور قصبہ راندیر پہونچے، یہ مسلمان تاجروں کا مشہور قصبہ ہے، افریقہ اور برما وغیرہ میں اسی قصبے کے تاجروں نے انگریزی عہد میں غیر معمولی فروغ حاصل کیا تھا، بڑی بڑی مسجدیں یہاں تعمیر ہوئیں۔ ہر مسجد پر معلوم ہوا کہ افریقہ اور برما وغیرہ میں دو کانوں کی شکل میں جائداد وقف ہے، اور ہر ایک کے حساب میں ان اوقاف کی لاکھوں لاکھ کی رقم بنکوں میں جمع ہو گئی ہے، ایک مشہور مسجد، جس کا نام اب یاد نہیں رہا، اسی میں ہم ٹھیرائے گئے، اس مسجد میں عربی کا ایک مدرسہ بھی تھا، اس کے صدر مدرس دار العلوم دیوبند کے ایک فارغ التحصیل نکلے، جن سے فقیر کی شناسائی پہلے سے تھی اسی مسجد کے مینارے پر بڑی ہوادار عمارت تھی، جو میری قیام گاہ تھی۔

طے ہوا کہ میری تقریروں کا سلسلہ شروع ہو، شاید پہلی تقریر، اسی مسجد میں یا کسی دوسری مسجد میں ہوئی، کہ اچانک پھر ایک شدید بد دماغی اور قلبی ہیجان کا دورہ مجھ پر پڑنا شروع ہوا، مینار کے خوبصورت بلند غرفہ میں بیٹھا ہوا دیکھتا رہتا کہ اچھے کھاتے پیتے لوگ آرہے ہیں، جا رہے ہیں، خیال یہ گزرتا کہ ان ہی لوگوں کو تاک کر مولوی مقبول احمد اپنے ساتھ مجھے لائے ہیں۔ غرض یہی ہے کہ تقریروں کے بعد

ان لوگوں سے رخصتانہ کی کچھ رقم ملے گی، میرا بھی اس میں کچھ حصہ ہوگا، اس خیال کا آنا تھا کہ بھونچال کی سی کیفیت اپنے اندر پانے لگا، دل کہتا تھا کہ آخر یہ لوگ جو ہماری امیدوں کا مرجع بنے ہوئے ہیں، نہ جنوں کی اولاد ہیں، نہ حور، نہ فرشتے، نہ اور کچھ، ہم ہی جیسے آدمی ہیں، اور معمولی آدمی، زیادہ پڑھے لکھے بھی یہ بیچارے نہیں ہیں، لیکن جب سعی وکوشش سے اتنا کچھ حاصل کر سکتے ہیں کہ ہم جیسے مولوی لوگوں کی امیدوں کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں، غیرت وحمیت کا بخار سا معلوم ہوا کہ مجھ پر چڑھا چلا جاتا ہے، اپنے آپ سے دل میں نفرت پیدا ہونے لگی، یہ اور اسی نوعیت کے خیالات کا ہجوم اس شدت کے ساتھ ہوا کہ اپنے اس گشتی سفر کو قطعی طور پر ختم کر دینے کا ارادہ کر لیا گیا، مولوی مقبول احمد صاحب کہیں باہر گئے ہوئے تھے، رات کا وقت تھا، شدت کے ساتھ ان کا انتظار کرتا رہا، جوں ہی وہ کمرے میں داخل ہوئے بغیر کسی توطیہ وتمہید کے میں نے ان کو مطلع کیا کہ "بھائی کل میں یہاں سے چلا جاؤں گا، اب آپ جانیں اور آپ کا کام" ان کا چہرہ فق پڑ گیا کہنے لگے آخر کیا کہہ رہے ہو؟ دل کے سارے جذبات کا اظہار تو ان کے سامنے نامناسب تھا، لیکن مختصراً یہی کہتا رہا کہ کل صبح ہونے کے بعد ایک لمحے کے لئے اب اس قصبہ میں میرا قیام ناممکن ہے، میرے اصرار کو دیکھ کر وہ بھی خاموش ہو گئے، صرف یہی کہتے رہے کہ جہاں سب سے زیادہ امید تھی، وہیں سے تم بھاگ رہے ہو، مگر بے چارے کیا کر سکتے تھے، انھوں نے مجھے اپنی رخصتانہ کی آمدنی سے کچھ دینا بھی چاہا لیکن اس کی ضرورت نہ تھی، مہاراجہ نے جو کچھ دے دیا تھا، وہی کافی تھا، اور اپنی زندگی کی یہ دوسری لغزش گاہ تھی، جس پر پھسلنے کے بعد توفیق الٰہی نے ہاتھ پکڑ لیا، پندرہ روز کے لئے حصول نذرانہ ورخصتانہ والے اس سفر میں مشغول ہونے کے بعد دوسرے دن صبح کو خاص لوگوں سے مل کر بندہ رخصت ہو گیا۔

Toobaa-elibrary.blogspot.com

باب ۱۹

اِنَّ رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ

(میرا رب اب مجھے ہدایت سے نوازے گا)

راستہ میں ایک دن کے لئے غالباً احمد آباد اترا، وہاں کے سلاطین کی یادگاروں کے دیکھنے کا مدت سے شوق تھا، ان کی مسجدوں اور مقبروں پر حسرت وافسوس کے چند آنسوؤں کے پھول چڑھا کر ریل میں بیٹھا، اسوقت تک اپنے مستقبل کی تلاش میں، میں خود نکلا تھا، لیکن اب اپنی یہ واپسی، اس فیصلہ کیساتھ تھی کہ مستقبل ہی میرے سامنے جس شکل میں بھی آئے گا، اسی کے ساتھ اپنے آپ کو راضی رکھنے کی کوشش کروں گا۔ اور اِنَّ رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ کہتا ہوا، احمد آباد سے ریل پر سوار ہو کر میں چلا، کدھر چلا؟ بس یہی سننے کی بات ہے۔ دار العلوم دیوبند سے کچھ دن کے لئے الگ ہوا تھا، حیدر آباد، اور گجرات میں دو مہیب لغزش گاہیں میرے سامنے آئیں، جیسا کہ عرض ہی کرتا چلا آرہا ہوں کہ صرف توفیق الٰہی رفیق تھی جس نے مجھے دونوں لغزش گاہوں، یا دکنی زبان میں پھسل بنڈوں سے نکال لیا حقیقی سبب تو یہی تھا لیکن عالم اسباب کے لحاظ سے جہاں تک میرا اپنا احساس ہے

دار العلوم دیوبند کے ماحول اور تھوڑی بہت اس کی تربیت کا یہ قدرتی اثر تھا کہ ان دونوں لغزش گاہوں پر پھسلتے پھسلتے سنبھل گیا، یا سنبھال لیا گیا، جس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ احمد آباد سے ادھر ادھر رخ کئے بغیر یک سوئی کے ساتھ سیدھا دیوبند کی طرف روانہ ہوا، دیوبند میں کن حالات سے سابقہ ہوگا، ان سے قطعاً خالی الذہن ہو کر دار العلوم کی طرف اس لئے بھاگا چلا آرہا تھا کہ وہ دیوبند کا دار العلوم ہے، جہاں اپنی متعلمی کے چند دن گزرے ہیں، دیوبند کے سوا زمین کے اس کرہ پر اسوقت کوئی پناہ گاہ نظر نہیں آتی تھی، میں نے حیدر آباد کو بھی دل سے نکال دیا تھا، سرمایہ دار تاجروں کے اس علاقہ کو بھی بھلا چکا تھا جہاں تقریباً پندرہ دن تک ایک خاص قسم کی زندگی گزارنے پر مجبور رہا تھا، اب دل میں صرف دیوبند تھا، اور دماغ میں بھی دیوبند تھا۔

پھر دیوبند میں

طالب العلمی کا تعلق مدرسہ سے منقطع ہو چکا تھا، حکیم منظر حسن صاحب میرے رفیق قدیم، جو ابھی اپنی طالب علمی سے فارغ نہیں ہوئے تھے، ان ہی کے حجرے میں آکر اتر گیا، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سے ملا، کہاں کہاں رہے؟ تفصیل تو کیا عرض کرتا، اجمالی الفاظ میں کچھ باتیں کہہ دیں سابقہ شفقت و مہربانی کے ساتھ ملے تسلی دی، اور اسی وقت اپنے اختیار خاص سے اتنا تو خود ہی کر دیا کہ طعام و قیام کے بارے سبکدوش ہو گیا، یعنی دس روپے ماہوار میرے نام جاری فرمانے کا حکم یہ فرماتے ہوئے انھوں نے دیا کہ سردست کچھ درس و تدریس کا کام مدرسہ میں کرو، اور القاسم والرشید مدرسہ کے نکلنے والے ان دونوں رسالوں میں لکھتے رہو، آگے میں کوئی مستقل نظم تمہارے لئے کروں گا۔

سنہ ۱۳۳۴ھ یعنی آج سے تقریباً چالیس پہلے[1] کی روداد مدرسہ کی ایک کاپی جو میرے

---

(۱) یہ مضمون رمضان سنہ ۱۳۷۴ھ میں دار العلوم دیوبند میں شائع ہوا تھا۔

Toobaa-elibrary.blogspot.com

کتب خانہ میں کسی طرح محفوظ رہ گئی ہے، اس میں اپنے نام کے ساتھ ملازمین مدرسہ کے تختہ میں "معین مدرسان عربی" کے نیچے

"مولوی مناظر احسن صاحب ۵۰ ماہوار"

کے الفاظ چھپے ہوئے ہیں، یہ وہی روئداد ہے، جس میں بجائے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے سیدنا الامام الکشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا اسم مبارک اسی تختہ تنخواہ میں "قائم مقام صدر مدرس" کے الفاظ کے ساتھ غالباً سب سے پہلے درج ہوا ہے، تنخواہ کے خانے میں ستر روپے ماہوار کی رقم کے ساتھ کیفیت کے خانے میں لکھا ہے کہ ستر روپے ماہوار شاہ صاحب کو یکم محرم ۱۳۳۴ھ سے دیا گیا۔ گویا دار العلوم کی مسندِ صدارت پر امام کشمیری نور اللہ ضریحہٗ کے جلوہ افروز ہونیکا یہ پہلا سال تھا حضرت شیخ الہند نے ۱۴ شوال ۱۳۳۳ھ کو سفر حج کے لئے مدرسہ سے رخصت حاصل فرمائی اسی کے بعد ہمیشہ کے لئے دار العلوم سے آپ رخصت ہی ہو گئے، اسی روداد میں حضرت شیخ الہند کی درخواست رخصت کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ اطلاع بھی دی گئی ہے کہ

"حضرت صدر مدرس مدرسہ (شیخ الہند) کے منجانب مدرسہ پچھتر روپے ماہوار تجویز ہو چکے ہیں۔"

باوجود منظوری کے آگے اسی کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ

"حضرت صدر مدرس صاحب نے پچاس ۵۰ سے اوپر مجوزہ ترقی کو نہیں لیا"

یہی مطلب ہے اس مشہور بات کا کہ شیخ الہند اپنی پچھتر روپے تنخواہ سے ہر ماہ پچیس روپے ماہوار بطور چندہ عطا فرماتے تھے حصول رخصت کے بعد بیان کیا ہے کہ

"پچاس ماہوار والی تنخواہ سے بھی ایک حبہ لینا گوارا نہ فرمایا"

روداد میں حضرت سیدنا الامام الکشمیری کے متعلق یہ معلومات درج ہیں کہ

"جناب مولینا مولوی محمد انور شاہ شوال ۲۷ھ سے دار العلوم میں مدرس دوم کا کام انجام دیتے ہیں۔"

لیکن کس طریقے سے، آگے اسی میں ہے۔

"جناب شاہ صاحب موصوف نے اسوقت تک مدرسہ سے مشاہرہ لینا منظور نہیں فرمایا۔"

یعنی ۱۳۳۴ھ تک باضابطہ تنخواہ مدرسہ سے شاہ صاحب نے نہیں لی، گویا سات سال تک مسلسل تنخواہ طے کئے بغیر کام کرتے رہے، سات سال کے اس کافی طویل عرصے میں یعنی ۸۴ مہینے تک ان کا جو رنگ رہا، اسی روداد میں ہے کہ

"اوّل اوّل تو کچھ نہیں لیا۔ بعدہٗ ضروری متفرق اخراجات کے لئے باصرار تمام کبھی دس روپے کبھی پندرہ روپے اور اب کچھ دنوں سے ۲۵ روپے ماہوار قبول فرما لیتے ہیں" (روئداد ۱۳۳۴ھ ص ۳۹)

گویا سات سال کے بعد ۱۳۳۴ھ کا پہلا سال تھا جس میں اس ناچیز کے نام دس روپے ماہوار منظور ہوئے تھے، سیدنا الامام کشمیری نے باضابطہ ستر روپے ماہوار کی تنخواہ کا لینا قبول فرمایا تھا، ورنہ اس سے پیشتر آپ دیکھ رہے ہیں، دس، پندرہ اور آخر میں پچیس سے زیادہ کبھی نہیں لئے۔

اللہ اللہ دار العلوم دیوبند، اور اس کے اس ماحول میں پہونچنے کے بعد واقعہ یہ ہے کہ دس روپے ماہوار بھی مجھ جیسے ہیچ میرز کے لئے عجیب بات تھی، سیدنا الامام الکشمیری کے علم کے ساتھ میرے جہل کی جو نسبت ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے، اسی وقت نہیں آج بھی دس کوڑیوں کا بھی صحیح معنی میں استحقاق نہیں رکھتا، سوچنے کی بات ہے، الہند کا شیخ، استاذ الکل بھی جس درسگاہ میں پچھتر کی تنخواہ سے پچیس روپے ماہوار امدادی چندے میں دینے کی نیت قائم کئے ہو، اسی مدرسہ کے ماحول میں چاندی اور سونے کے گزوں سے انسانیت کی

Toobaa-elibrary.blogspot.com

پیمائش کا مسئلہ کتنا مضحکہ بن کر رہ گیا تھا، سچ پوچھئے تو دار العلوم دیوبند کے ان چشم دید مشاہدات ہی کو اپنی زندگی کی مذکورہ بالا لغزشوں میں عالم اسباب کی رو سے اپنا نجات دہندہ اگر سمجھتا ہوں، تو براہ انصاف بتایا جائے کہ اور کس چیز کا نتیجہ اسکو سمجھوں، بہرحال میرے نام کے دس روپے ماہوار تو تنخواہ کے خانے میں تھے، اور کیفیت کے خانے میں لکھا ہے

"صرف ایک ماہ کی تنخواہ ادا ہوئی ہے"

حافظہ اب مدد نہیں کر رہا ہے کہ اس کے بعد کیا صورتیں پیش آئیں، بس اتنا یاد رہ گیا ہے کہ دس روپے ماہوار کی یہ تنخواہ صرف ایک ماہ مجھے ملی، اس کے بعد مدرسہ میں باضابطہ ملازمت کا آغاز تیس روپے ماہوار سے شروع ہوا، جو دار العلوم کی مجلس شوریٰ نے طے کیا تھا، دار العلوم کے باہر تیس روپے کا وزن کچھ ہی ہو، لیکن دار العلوم کے احاطہ میں مجھ جیسے نوآموز ملّا کے لئے شاید یہ کافی امتیاز تھا وجہ امتیاز ہو یا نہ ہو، لیکن جہاں تک اپنے دل کو ٹٹولتا تھا، اس تنخواہ سے کامل طور پر اگر مطمئن نہیں، تو چنداں غیر مطمئن بھی نہ تھا، طالب العلمانہ تعلق کے بعد دار العلوم کے ساتھ میری خدمت کا رشتہ جب پیدا ہوا، تو دس سے شروع ہو کر تیس تک کی تنخواہ میں وہ دن گزرے، جن کی سرگزشتوں کا مختلف حیثیتوں سے تذکرہ کر چکا ہوں، اب پوری مدت کی تعیین تو میرے لئے سردست دشوار ہے، لیکن کافی مدت تھی، جو دیوبند میں گزری۔

بہار میں عارضی قیام اور دیوبند واپسی

دیوبند کے قیام کے زمانے میں کچھ خانگی ضرورتیں بھی ایسی سامنے آگئیں کہ رخصت لیکر فقیر اپنے وطن گیلانی چلا آیا، یہاں دار العلوم کے قدیم طالب العلم مولوی سید علی عظیم سے ملاقات ہوئی، ان کا دماغ حد سے زیادہ اسکیم ساز بلکہ شاید اسکیم باز تھا، بڑے بڑے پروگرام دینی، علمی خدمات

کے بنا بنا کر رکھے ہوئے تھے، مجھ پر اصرار کرنے لگے کہ دار العلوم کو تجھ جیسے بیسوں آدمی مل سکتے ہیں، لیکن مونگیر اور بہار جو ہمارا وطن ہے، یہاں کام کرنیوالوں کی بڑی کمی ہے، حق بھی وطن اور اپنے مرزبوم کا زیادہ ہے، میں مونگیر بھی اسی سلسلے میں حاضر ہوا بانیٔ ندوۃ العلماء حضرت مولانا محمد علی قدس اللہ سرہٗ العزیز کی خدمت میں جب پہونچا، تو حضرت والا کے چشم وابرو کے اشاروں نے بھی مولوی عظیم مرحوم کے خیال کی تائید کی، الغرض بہار، خصوصاً مونگیر ہی میں قیام کر کے، مالیخولیا کہئے یا کچھ اور، کام کرنے کے نقشے بننے لگے، رخصت دار العلوم سے غالباً ایک مہینہ کی ملی تھی، لیکن مہینہ، دو مہینے، تین مہینے گزر گئے، دار العلوم حاضر نہ ہو سکا، مولینا حبیب الرحمٰن صاحب نے دریافت کیا، پہلے کچھ لیتؔ و لعلؔ سے کام لیتا رہا، آخر میں عرض ہی کر دیا کہ بہار ہی میں لوگ روک رہے ہیں، یہاں عمل کا میدان بھی کافی وسیع نظر آ رہا ہے، اس لئے مجھے اگر اجازت مرحمت ہو تو وطن ہی میں قیام کر لوں، میں نے بعض کاموں کا پروگرام بھی لکھ کر بھیجا تھا، جواب میں مولینا مرحوم نے جیسا کہ چاہئے تھا لکھا،

"یہ سارے قصے تمہاری ناتجربہ کاری اور جوانی کے جوش کے ہیں، مناسب یہی ہے کہ تم دار العلوم چلے آؤ، جن کاموں کا تم نے ذکر کیا ہے، ان کے لئے بہتر زمین دار العلوم ہی میں ہموار ہو سکتی ہے، دار العلوم کا وسیع کتب خانہ ہے"

پریس جو خود مولینا حبیب الرحمٰن صاحب کا تھا، ارقام فرمایا کہ تمہارے حوالے کر دیا جائے گا، اور عملاً وہ میرے حوالے تھا بھی، دو دو رسالے القاسم اور الرشید کے صفحات تمہارے مضامین و مقالات کے لئے کافی گنجائش رکھتے ہیں، پھر دار العلوم کے طلبہ سے جس مقدار میں چاہو گے اپنے کام کے آدمیوں کا انتخاب کر سکتے ہو، اسی کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ دار العلوم میں تم جانتے ہو، تنخواہوں کا معیار، زمانہ کی ضروریات

Toobaa-elibrary.blogspot.com

کے لحاظ سے بہت کم ہے بایں ہمہ یہ طے کرلیا گیا کہ بجائے تیس کے پچاس روپے ماہوار ہماری تنخواہ کردیجائے،

یہ وہ زمانہ تھا کہ دارالعلوم میں مجھ سے کافی سینیر اساتذہ بیچارے تیس چالیس سے زیادہ نہیں پارہے تھے، عرض بھی کرچکا ہوں کہ شاہ صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کی تنخواہ اس زمانہ میں بمشکل ستر منظور ہوئی تھی، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ نے شفقت ومحبت کے حسن الفاظ میں یہ عنایت نامہ ارقام فرمایا تھا، اس کو پڑھ کر میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے، چند دن سوچ بچار میں گزرے، نیز اس عرصے میں اسکیموں اور پروگراموں کے متعلق بھی تجربہ کا موقع ملتا رہا، خود مونگیر، بھاگلپور میں کام کرنے کا موقعہ بھی ملا، دربھنگہ بھی حاضر ہوا تھا، دیکھا یہی کہ کہنے والے اور باتیں بنانیوالے تو ہر کوچہ وبازار میں مل جاتے ہیں، لیکن کرنیکا وقت جب آتا ہے، تو لوگ بغلیں جھانکنے لگتے ہیں، ان ہی چند مہینوں میں کافی مایوسیوں سے بھی "قوم و ملت" کے اس قصے میں دوچار ہونا پڑا تھا

مولینا مرحوم کے اس خط نے ارادے کو مضمحل کردیا اور دوسری دفعہ دارالعلوم سے الگ ہونے کے بعد فقیر پھر دارالعلوم پہونچ گیا (۱)

---

(۱) پہونچنے کے بعد مولینا حبیب الرحمٰن صاحب سے معلوم ہوا کہ فقیر کی تنخواہ کے مسئلہ کو حضرت شاہ صاحب کے سامنے انھوں نے جب پیش کیا تھا، تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ وہ درس بھی دیتا ہے، "القاسم" "الرشید" میں مضامین بھی لکھتا ہے اور دارالعلوم سے اس کو وعظ وتقریر کے لئے جہاں سے طلبی آتی ہے بھیجدیا جاتا ہے، اگر ہر ہر مد سے تیس تیس بھی اس کو دئیے جائیں تو ماہوار نوے ہوتے ہیں، گویا سو روپے بھی آپ دیں گے تو ان کا وہ مستحق ہے، یہ پہلا موقع تھا جب مجھے محسوس ہوا کہ خاکسار پر شاہ صاحب کی خاص نظر رہتی ہے، ان کی الگ تھلگ زندگی کو دیکھ کر پہلے احساس تھا کہ سینکڑوں طالب العلموں میں ایک طالب العلم یہ بھی ہے، اس سے زیادہ ان کے قلب مبارک میں کوئی اثر نہ تھا۔ (گیلانی)

باب ۲۰

دارالعلوم دیوبند سے پھر حیدرآباد

اب یہیں سے وہ قصہ شروع ہوتا ہے جس کے لئے اتنی طویل سمع خراشیوں سے کام لینا پڑا، دارالعلوم پہونچا، اور نئے ولولوں اور بڑے بڑے حوصلوں کیساتھ پہونچا، پہونچنے کے ساتھ اسکیموں اور پروگراموں کے بنانے میں منہمک ہوگیا، لیکن تقدیر ہنس رہی تھی، شاید ایک مہینہ کی مدت بھی نہ گزری ہوگی کہ اچانک کلکتہ میں ایک ہنگامہ شروع ہوا، مختصر یہ ہے کہ "ڈیلی نیوز" غالباً کوئی انگریزی اخبار تھا، جس میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بعض ناسزا الفاظ شایع ہوئے، کلکتہ کے مسلمانوں میں غم اور غصہ کی لہر دوڑ گئی، بات بڑھتی ہی چلی گئی، تا آنکہ کل ہند پیمانہ پر فیصلہ کیا گیا کہ باضابطہ ایک مجلس ہی بنائی جائے، جس کا مقصد ہی یہ ہو کہ اس قسم کی بے ادبیوں کی راہ ہمیشہ کیلئے مسدود کردی جائے غالباً مجلسِ تحفظِ اسلام کے نام سے یہ مجلس موسوم ہوئی، کافی رقوم بھی وصول ہوئیں۔

کلکتہ میں ارادہ کیا گیا کہ سارے ہندوستان سے علماء کو طلب کرکے ایک اجتماعِ عظیم کیا جائے، اور حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ آئندہ اس قسم کی

Toobaa-elibrary.blogspot.com

ناہمواریوں کے انسداد کی وہ ضمانت لے، ملک سیاسی طوفان میں مختلف وجوہ سے غوطے کھا رہا تھا، ان ہی میں ایک مذہبی آندھی یہ بھی اٹھی اسی سے اندازہ کیجئے کہ کلکتہ کے بڑے بڑے تجار اور مسلمانوں کے اساطین کا خط دار العلوم اس مضمون کا پہونچا کہ "دار العلوم سے علماء کی بڑی سے بڑی تعداد کلکتہ بھیجی جائے جن میں صدر دار العلوم اور ارباب اہتمام کا ہونا بھی ضروری ہے" ایک سے زیادہ تقاضے اس سلسلے میں روزانہ شروع ہو گئے، اور یہی طے کیا گیا کہ اس موقع پر علماء دار العلوم کو کلکتہ پہونچنا چاہیئے، سربر آوردہ اکابر کے سوا یہ تجویز بھی پاس ہوئی کہ فقیر بھی اس وفد میں شریک ہو

ناگہانی اطلاع

الغرض چودہ علماء، جن میں ایک یہ ظلوم وجہول بھی تھا علاوہ ذیلی خدام کے دیوبند سے روانہ ہوئے، جوش و خروش کا عجب عالم تھا، پیغمبر عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت وآبرو کا سوال تھا، اس پر کوئی حرف نہ آئے، کلکتہ پہونچ کر اس قصہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کیا جائے، تمازی آباد سے خیال آتا ہے، پنجاب میل سے علماء کی یہ جماعت کلکتہ روانہ ہوئی، راستہ بھر اسی مسئلہ پر اور اس کے مختلف پہلوؤں پر باتیں ہوتی رہیں غالباً صبح کا وقت تھا میل الہ آباد اسٹیشن پہونچا، دیکھا گیا کہ اسٹیشن ماسٹر الہ آباد شمس العلماء حافظ محمد احمد کا نام لے لیکر ہر ڈبے میں پوچھ رہا ہے کہ کیا وہ تشریف فرما ہیں، ان کے نام کا ایک تار کلکتہ سے میرے پتے سے آیا ہوا ہے حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تو موجود ہی تھے، اسٹیشن ماسٹر نے تار حوالے کرتے ہوئے ترجمہ بھی سنا دیا کہ

"آپ لوگ واپس ہو جائیں، کلکتہ کی حالت حد سے زیادہ نازک ہوتی چلی جا رہی ہے، تفصیل خط سے معلوم ہوگی"۔

میرا سفر کلکتہ جاری رہا

پنجاب میل کے قیام کا وقفہ ہی کیا تھا، ہمارے ڈبے میں ہلچل سی مچ گئی جس طرح بھی ممکن ہوا یہی فیصلہ کیا گیا کہ الہ آباد ہی میں لوگ اتر جائیں، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے صرف فقیر کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم مت اترو، چلے جاؤ، اور کلکتہ پہونچ کر دیکھو، جلسہ میں تقریر وغیرہ کی گنجائش ہو تو شریک ہو جانا، ورنہ واپس چلے آنا۔ یہ بھی فرمایا کہ بقرعید کا زمانہ قریب ہے، واپسی میں تم کو اجازت ہے، عید وطن ہی میں منا کر آنا، میری نوعمری اور نوجوانی کے ساتھ یہ رعایت کی گئی تھی، اچانک وہی ڈبہ جو قاعۃ العلماء بنا ہوا تھا چند منٹ میں خالی ہو گیا، اور ایک نوعمر مولوی بیچارا، دیوبندی لباس یعنی لمبے کرتے، دو پلی ٹوپی کے ساتھ تنہا اسی ڈبے میں بیٹھا ہوا، روانہ ہو گیا، ٹکٹ سبھی کا کلکتہ کا لے لیا گیا تھا، اوروں کے ٹکٹ تو غالباً واپس کر دیئے ہوں گے، میرا ٹکٹ کار آمد ثابت ہوا، فقیر نے احتیاطاً دیوبند ہی سے اپنے منجھلے بھائی میاں مکارم احسن سلمہ کے نام تار دیدیا تھا کہ میں کلکتہ جا رہا ہوں، پٹنہ اسٹیشن پر، مجھ سے فلاں ٹرین پر ملاقات کرو، میل بھاگتا ہوا پٹنہ پہونچا، میاں مکارم کو دیکھا اسٹیشن پر موجود ہیں، مگر عجب حال میں، کلکتہ کے انگریزی اخباروں میں کلکتہ کے حالات مسلسل شائع ہو رہے تھے، جن میں شدید فتنوں اور فسادات کے خطرات کا اظہار کیا جا رہا تھا، مسلمانوں اور حکومت میں شدید تصادم کا احتمال پیدا ہو گیا ہے، وہ مجھے کلکتہ کے ان حالات سے آگاہ کرتے ہوئے مصر ہوئے کہ میں پٹنہ ہی میں اتر جاؤں، لیکن اس زمانہ میں جن کیفیات سے گزر رہا تھا، وہ ایسے تھے کہ رائے کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ اب تو جانا اور بھی ضروری ہے، وہ میرا دامن پکڑے ہوئے اتارنا چاہتے تھے، اور میں نے لاپرواہی کے ساتھ ان کے ہاتھ کو جھٹک دیا۔ اتنے میں انجن نے سیٹی دی، گاڑی متحرک ہو گئی، میاں مکارم منہ دیکھتے رہ گئے

Toobaa-elibrary.blogspot.com

اور کچھ نہ کرسکے۔

اب بھی اپنے اس ایمانی حال کو جب یاد کرتا ہوں، اور بے غیرتی، بے حمیتی، بلکہ بے حیائی، وبے شرمی کی جو زندگی اب گزار رہا ہوں سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا تھا اور کیا ہوگیا، حضرت حسان بن ثابت صحابی رضی اللہ عنہ کا مشہور شعر ہے

فان ابی ووالدتی وعرضی لعرض محمد منکم فداء

(میرے باپ، میری ماں، میری آبرو، سب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آبرو پر فدا ہوں)

اسی ڈبے میں، جس میں میرے سوا کوئی نہ تھا پڑھتا جاتا تھا، اور روتا جاتا تھا، مستی ووارفتگی کے ان ہی حالات میں ہوڑہ اسٹیشن پر میل مجھے لیکر پہونچ گیا۔

استقبال کرنیوالوں کا ہجوم اور مایوسی

اسٹیشن استقبال کرنیوالے مسلمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ یقین تھا کہ آج دار العلوم دیوبند مستقل کلکتہ منتقل ہو کر چلا آرہا ہے۔ سیدنا الامام کشمیری، مولانا عثمانی مولانا حافظ محمد احمد، مولانا حبیب الرحمٰن کے مبارک اور مقدس چہروں کی زیارت کی تمناؤں میں ڈوبے ہوئے لوگ آئے ہوئے تھے، یہ تار کلکتہ سے الٰہ آباد اسٹیشن ماسٹر کے نام جو دیا گیا تھا، اس کی کسی کو خبر نہ تھی، ہر طرح کے لوگ موجود تھے، ٹھیر نے کیساتھ ہی لوگ پنجاب میل پر ٹوٹ پڑے، لیکن علماء کا کسی ڈبے میں پتہ نہ چلا، شور برپا ہوگیا، فقیر تنہا پلیٹ فارم پر کس مپرسی کے حال میں اترا، غوغا کو سن کر لوگوں کیطرف متوجہ ہوا، اور اطلاع دی کہ دیوبند کے علماء آپ لوگوں کا تار پا کر الٰہ آباد سے واپس ہوگئے، صرف اس فقیر کو اجازت دی گئی، وہ حاضر ہوگیا ہے، ہر ایک متحیر تھا کس نے کب، کس کے مشورے سے یہ تار دیا، لیکن پورے مجمع میں کسی نے اقرار نہ کیا، وفد کے سرخیل کلکتہ کے ایک مشہور رئیس التجار بخش الٰہی سیز سگریٹ کے سول ایجنٹ تھے، ان کے صاحبزادے آنریبل مولوی عبد الرحیم اپنی

کار لے کر پہونچے ہوئے تھے، ان ہی کوٹھی میں علماء کے قیام کا نظم کیا گیا تھا، جبراً قہراً اسی فقیر کو گاڑی میں بیٹھایا گیا، اور اس مکان میں پہونچا دیا گیا، جہاں علماء ٹھہرائے جانیوالے تھے، ہر ایک پر حد سے زیادہ مایوسی طاری تھی اور اسی فکر میں سرگرداں تھا کہ آخر یہ تار کس نے دیا

حاجی عبد الصمدؒ

تھوڑی دیر بعد جب لوگ مجھے اسی مکان میں تنہا چھوڑ کر چلے گئے، ایک صاحب تشریف لائے، نام ان کا حاجی عبد الصمد تھا وفات ہوچکی، غالباً دیوبند میں نظران پر بھی پڑی تھی، وہی آئے، اور ادھر ادھر دیکھ کر بولے کہ تار میں نے دیا تھا، لیکن میرے نام کا تذکرہ کسی سے نہ کیجیے گا، ورنہ عوام میری دھجیاں اڑا دیں گے، حالات کی نزاکت کا یہی اقتضا تھا، وہ دیوبند کے مخلص خیر اندیشوں میں تھے، کافی مالی امداد بھی مدرسہ کو ان سے ملتی تھی، مجھ سے کہنے لگے کہ اس لمبے چوڑے مکان میں تنہا تمہارا جی گھبرائے گا، میرے پاس اٹھ کر چلے آؤ، ٹیلی فون پر آنریبل عبد الرحیم صاحب سے اجازت بھی لے لی، مجھ جیسے گمنام کس مپرس مہمان کے ٹھیرانے پر اصرار کی وجہ کیا ہوسکتی تھی، میں حاجی عبد الصمد کے پاس اٹھ کر چلا گیا، اس کے بعد کیا کیا ہوا، کیا کیا دیکھا، نہ اب تفصیلات ہی یاد رہیں، اور نہ ان کے ذکر کی ضرورت!

یہ واقعہ تھا، حکومت اور مسلمانوں کے درمیان کشمکش نزاکت کے آخری نقطوں تک پہونچ گئی تھی، مسلمانوں کی عمومیت جلسہ کرنے پر اصرار کر رہی تھی حکومت بزور اس کو روکنا چاہتی تھی، بات بڑھ رہی تھی، اسی دن یا دوسرے دن زکریا کی مشہور مسجد میں مسلمانوں پر گولیاں بھی چلا دی گئیں۔ کافی مسلمان شہید بھی ہوئے اور زخمیوں کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا، میرا حال یہ تھا کہ بار بار حاجی عبد الصمد سے کہتا تھا کہ مجھے چھوڑ دیجئے، مسلمانوں کے ساتھ ہنگامہ میں شریک ہو جاتا ہوں

Toobaa-elibrary.blogspot.com

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت پر مسلمان اپنا خون بہا رہے ہیں، میرا خون آخر کہاں کا قیمتی ہے، حاجی عبد الصمد مرحوم کو اندیشہ ہوا کہ اپنا دماغی توازن میں کھو بیٹھا ہوں، وہ بڑے سرد و گرم چشیدہ بزرگ تھے، مخالفت نہیں کرتے، بلکہ کہتے ہاں! مولینا میں بھی چلتا ہوں، بس بعض باتوں کا انتظار ہے۔

خانہ قید

اب اسی عرصہ میں معلوم نہیں کس طریقے سے بہار کے بعض انگریزی خوان طلبہ، جو کلکتہ میں تعلیم پاتے تھے، ان کو میرے آنے کی خبر ملی، ڈھونڈھتے ہوئے مجھ تک پہونچے، جس حال میں تھا، اس کو دیکھ کر ان کو بھی یقین ہو گیا کہ یہ بے حد متاثر ہے، انھوں نے مجھ سے کہا کہ اچھا چلئے ہم آپ کو جلسہ گاہ تک پہونچاتا ہوں، موٹر اپنے ساتھ لائے تھے، اسی میں مجھے بٹھا کر دیکھا کہ لئے جا رہے ہیں، زکریا اسٹریٹ میں ہم ٹھہرے ہوئے تھے، وہاں سے سات آٹھ میل یا غالباً کچھ اس سے بھی زیادہ دور کلکتہ کا ایک محلہ سبحان لین نامی تھا، وہیں پہونچ کر رکے، اور ایک مکان میں مجھے داخل کر کے ان لوگوں نے مطلع کیا کہ

"اب اس مکان سے تم باہر نہیں نکل سکتے"۔

گویا ان طالب العلموں نے مجھے اپنا قیدی بنا لیا، پوری نگرانی کرنے لگے، کہ گھر سے باہر قدم نہ نکالوں، میں جھنجھلاتا بھی رہا، بگڑتا بھی رہا، لیکن ان کے اختیار میں تھا، الغرض یوں تقریباً چار پانچ دن اسی مکان میں گویا ایک قیدی کی حیثیت سے میری زندگی گزرتی رہی، خود مجھے تو اخبار دیکھنے نہ دیتے، انگریزی اخبار ان کے پاس آتے تھے، ان ہی سے خبریں سناتے، جن سے معلوم ہوتا تھا کہ مسلمانوں اور حکومت کی کشمکش نے ایک نیا قالب اختیار کر لیا ہے، یعنی ہندو مسلم فساد کی صورت پیدا ہو گئی ہے، مسلمانوں کو ہندو جہاں تنہا پاتے ہیں، قتل کر دیتے ہیں، اور مسلمان بھی یہی کر رہے ہیں، خصوصاً ہوڑہ سے جانیوالی گاڑیوں میں اس قسم کی

خوں ریزیوں کے چند واقعات پیش آ چکے ہیں، یہ خبر بھی چھپی کہ کلکتہ کے مسافر جس اسٹیشن سے اتر کر شیخپورہ میرے وطن کے اسٹیشن تک پہونچے، اس لائن کا پل ٹوٹ گیا، ریل کی آمد و رفت بند ہو گئی، ان ہی حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب اپنے اس قید خانہ سے رہائی پر مصر ہوا، اور وعدہ کیا کہ شہر نہ جاؤں گا، آپ لوگ دیوبند واپس ہونے کا نظم کر دیجئے، ان لوگوں کی رائے ہوئی کہ گھر جانے کی راہ تو بند ہو چکی ہے، اور ہوڑہ سے جانیوالی ٹرینوں میں خطرناک واقعات قتل و خوں ریزی کے پیش آ رہے ہیں، اس لئے مناسب ہے کہ دیوبند تم ناگپور میل سے جاؤ، میں نہ اس میل ہی سے واقف تھا، اور نہ اس لائن سے، ان ہی بہاری طالب العلموں[1] نے اسٹیشن پہونچا کر ٹکٹ لیا، اور ناگپور میل میں بٹھا دیا، اتنا سمجھا دیا گیا کہ راستہ میں "بزواڑہ" نامی ایک جنکشن آئیگا، یہاں گاڑی بدل جائے گی، تم سکندر آباد، حیدر آباد جانیوالی گاڑی پر بیٹھ جانا، وہاں سے منماڑ ہو کر دیوبند پہونچ جاؤ گے۔

حیدر آباد میں

کلکتہ کا یہ سفر صرف ایک ہفتہ پندرہ روز کیلئے چوں کہ ہوا تھا، اس لئے اپنے ساتھ کرتے پائجامے کے دو جوڑوں سے زیادہ کوئی سامان میں نے نہیں رکھا تھا، ایک لنگی کلکتہ میں اور خرید لی تھی، اسی لنگی کو باندھے ریل میں بیٹھا، حیدر آباد کا تماشا کر کے میں واپس ہو چکا تھا، اس سے زیادہ کوئی ارادہ نہ تھا کہ حیدر آباد راہ میں آئے گا، گزر جاؤں گا، لیکن گاڑی جب سکندر آباد اسٹیشن پر پہونچی تب معلوم ہوا کہ کل تو الاضحیٰ والی عید کا دن ہے، اسی میں لوگ اس کا چرچا کر رہے تھے، کیا عید میری اس سال کی ریل میں گزر جائے گی؟ یہ

---

(۱) جن میں ہمارے دوست مولوی ظہیر قاسم بہار کے کانگریسی مسلمان اور مولوی صغیر وکیل مرحوم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ (گیلانی)

سوال دل میں آیا، اور جواب اس کا یہ ملا کہ اپنے ایک خاص عزیز مولوی محی الدین حیدرآبادی ہیں۔ میں پہلی دفعہ ان سے نہ ملا تھا جس کی شکایت بھی انھوں نے کی تھی، اس لئے عید کی نماز پڑھنے کی نیت کرکے میں حیدرآباد میں اتر گیا، اور اسی عجیب و غریب وحشیانہ شکل و صورت کے ساتھ لنگی باندھے سید محی الدین صاحب کی قیام گاہ تک پہونچا، مجھے اس ہیئت کذائی کے ساتھ دیکھ کر وہ بھی پریشان ہوگئے، میں نے قصہ سنایا کہ بھاگا ہوا گویا کلکتہ سے دیوبند جا رہا ہوں کل عید ہے، اس لئے اتر گیا ہوں، بہرحال صرف ایک دن قیام کی نیت سے اترا لیکن وہی مستقبل جس کی تلاش سے مایوس ہوکر حیدرآباد سے واپس ہوا تھا، وہی میرے سامنے اس طریقہ سے آیا کہ ایک دن کی جگہ تیس سال سے زیادہ مدت اسی حیدرآباد میں مجھے گزارنی پڑی اور یہ تقدیر کا کرشمہ تھا کہ پانچ اور دس روپئے کی تنخواہ سے جس کی معاشی زندگی شروع ہوئی تھی، وہی ہزار روپئے ماہوار کی تنخواہ پر وظیفہ یاب ہوکر اب پھر اسی

مُسْتَقَرٌّ اِلٰی حِیْنٍ

کی طرف واپس ہوگیا، جہاں کی مٹی سے اس نے سر نکالا تھا، اور اب بھی نہیں کہہ سکتا کہ اپنا مستودع کہاں ہے؟

لا تدری نفس ماذا تکسب غدا وما تدری نفس بای ارض تموت (کوئی شخص نہیں جانتا کہ کل کیا کریگا اور کہاں مرے گا) کی قرآنی آیت کے پہلے حصے کے تجربات سے تو ساری زندگی بھری ہوئی ہے، اب اسی آیت کے آخری حصے کے تجربہ کا انتظار ہے، دیکھئے اس کا موقع کہاں ملتا ہے

دارالعلوم دیوبند کے احاطہ سے حسی جدائی اسی منزل پر ختم ہو جاتی ہے، اس کے بعد پھر کیا کیا ہوا، ربع صدی سے زیادہ مدت کے اس عرصے میں کیا کیا دیکھا، کیا کیا سنا، کن حالات سے گزرا عثمانیہ یونیورسٹی میرے سامنے حیدرآباد میں کس طرح

قائم ہوئی، استاذوں کی پہلی کھیپ کہیئے، یا جھول میں شریک ہوکر اس عجیب و غریب تعلیم گاہ میں ہم کیسے داخل ہوئے، یونیورسٹی کے اندر اور یونیورسٹی کے باہر جو کچھ پیش آ رہا تھا، اسی کو دکھانیوالا، کیا کچھ بنا بنا کر دکھاتا رہا، اب داستان ماضی ہوچکی۔ مخدوم زادہ آفاق مولینا سید محمد ازہر شاہ قیصر سلمہ کی مخدوم زادگی کے دباؤ نے اتنا بھی کیسے اگلوالیا، اسی پر حیرت ہے، ورنہ یہ سینہ روزگار کے جن اسرار کا گنجینہ بنا ہوا ہے، اب اسکو کرید کر کیا کیجیے گا، آہ کہ جس کا آخری انجام یہ ہو کہ ؎

ہوئے ہیں دفن مرے ساتھ سینکڑوں ارماں
عدم کی راہ سے جاتا ہے قافلہ دل کا

روشنی بھی دیکھی اور تاریکی بھی، فراز بھی سامنے آیا، اور نشیب بھی، چڑھا بھی اور گرا بھی، اور اب وہی پرانا فرسودہ شعر زبان پر جاری ہے ؎

گئے دن ٹکٹکی کے باندھنے کے!
اب آنکھیں رہتی ہیں دو دو پہر بند

یا کبھی کبھی مرزا غالب کان میں پھونک جاتے ہیں ؎

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

وَیَبْقٰی وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامْ

AF-277

Toobaa-elibrary.blogspot.com

طوبیٰ ریسرچ لائبریری

اسلامی اردو، انگلش کتب،

تاریخی، سفرنامے، لغات،

اردوادب، آپ بیتی، نقدوتجزیہ

toobaa-elibrary.blogspot.com

toobaa-elibrary.blogspot.com